رسالتِ الٰہیہ

مجموعہ

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

ناشر

تنظیم المکاتب

گولہ گنج، لکھنؤ

سلسلۂ آثار علامہ سید ذیشان حیدر جوادیؒ

رسالتِ الٰہیّہ

مجموعۂ

مجالسِ عزاء

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

ناشر

تنظیم المکاتب

گولہ گنج، لکھنؤ ۱۸، یو۔پی (انڈیا)

فون: ۲۲۱۵۱۱۵ — فیکس: ۲۲۲۸۹۲۳

نام کتاب : رسالتِ الٰہیہ
مصنّف : علّامہ السید ذیشان حیدر جوادیؒ
پہلا ایڈیشن : دسمبر ۱۹۹۵ء
دوسرا ایڈیشن : جنوری ۲۰۰۴ء
کتابت : ج۔ احمد
تعداد : ایک ہزار
ناشر : تنظیم المکاتب، لکھنؤ، انڈیا
قیمت :

مراکزِ حصول:

۱۔ دفتر تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکھنؤ ۱۸، انڈیا۔

۲۔ جامعہ امامیہ انوار العلوم، ۳۹۔ مرزا غالب روڈ، الہ آباد۔

۳۔ جامعہ جوادیہ، پرہلاد گھاٹ، بنارس۔

۴۔ مولانا محمد علی آصف صاحب قبلہ، غازی پور، ڈاکخانہ گوگوان، ضلع مظفر نگر۔

۵۔ معاون کمیٹی تنظیم المکاتب، کشمیر ہمدانیہ کالونی بمنہ ۱۹۰۰۱۰

۶۔ مولانا سید انیس الحسن صاحب قبلہ، A1 نیو شوکت سوسائٹی، نورجی ہل روڈ، ڈونگری، بمبئی ۹

۷۔ برانچ آفس تنظیم المکاتب، مکادم والا بلڈنگ، روم نمبر ۷-۶ II فلور، ۶۲۔ حضرت عباس روڈ، اسٹریٹ۔ ڈونگری۔ بمبئی ۹ - ۲۳۴۴۹۹۹

فہرست

بسمہٖ سبحانہ

عرضِ تنظیم

(طبع اوّل)

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ادارۂ تنظیم المکاتب اپنے پروگرام کے مطابق علامہ جوادی دام ظلّہ، کے مجالسِ عشرۂ محرم الحرام کا تیسرا مجموعہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

مجالس کا موضوع ہے "رسالتِ الٰہیہ" جس میں رسالت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو اصل مسئلہ رسالت یا رسالت مرسل اعظمؐ پر وارد کیے گئے ہیں۔

ہماری قوم میں مجالس کا معیار اس قدر گرتا جا رہا ہے کہ خطباء کرام علمی مطالب پیش کرنے سے گھبرا رہے ہیں اور سامعین کرام سہل انگاری کی بنا پر پیش پا افتادہ مضامین ہی کے نئے اسلوب، انداز اور حسین ترین ڈرامائی لہجہ میں سننے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔

علامہ جوادی دام ظلّہ کے بیانات کا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے خطابت کے صحرا میں افکار کو گم نہیں ہونے دیا اور جذبات کے سیلاب میں حقائق کو بہنے نہیں دیا۔ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ خطباء کرام مطالعات میں وسعت سے کام لیں اور بہتر سے بہتر مطالب کو مؤثر انداز میں پیش کریں اور سامعین محترم کانوں سے زیادہ دماغ کو استعمال کریں۔ اسی بنیاد پر آپ نے متعدد کتابیں تالیف کیں۔ نئی نسل کے لیے بیش بہا مواد فراہم کیا تاکہ قوم میں ایک فکری انقلاب پیدا ہو اور مجالس عزا حقیقتاً درس گاہ کا درجہ حاصل کر لیں۔

آپ کی اس کتاب کو پڑھ کر آپ حضرات اندازہ کریں گے کہ ابوظبی جیسی سرزمین پر جہاں سامعین کی اکثریت اردو زبان نہیں ہوتی ہے اور ایک مزدور و زحمت کش طبقہ سے تعلق رکھتی

ہے وہاں کی مجالس میں اس قدر علمی اور دقیق مطالب کو کس خوبصورتی و خوش اسلوبی اور سلاست و روانی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ فرشِ عزا پر بیٹھنے والا کوئی ایک انسان بھی محروم نہ رہنے پائے اور مجالس کی عظمت و اہمیت بھی برقرار رہے۔

کتاب کی اشاعت کا سہرا شہرۂ آفاق مردِ خیر جناب محترم ملا اصغر صاحب صدر ورلڈ خوجہ فیڈریشن کے سر ہے جن کی اعانت سے ادارہ اس کتاب کو منظر عام پر لا رہا ہے۔ ربّ کریم ان کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور دیگر صاحبانِ استطاعت کو اس راہ پر چلنے کی توفیق دے تاکہ ادارہ دیگر مجالس کے مجموعوں کو منظرِ عام پر لاسکے۔ وَمَا علینا اِلاَّ البلاغ۔

☆ ——— ادارہ

طبع دوم

"رسالت الٰہیہ" کا دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ علاّمہ جوادی اعلی اللہ مقامہ، کی زبان خاموش ہو چکی ہے، مگر ان کی آواز زندہ ہے کیونکہ وہ اس ابدی پیغام کو پہنچا رہی تھی جو کبھی مٹنے والا نہیں۔

خداوند کریم ہمیں توفیق دے کہ ان کے علمی خطابات کو شکل کتاب دے کر مومنین کے ہاتھوں تک پہنچا سکیں۔ والسّلام

☆ ——— ادارہ

مجلس ۱

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِھِمْ اَجْمَعِیْنَ ○ اَمَّا بَعْدُ، فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ ۙ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

(اعراف ۱۵۷)

اما بعد!

"جو لوگ اس پیغمبرِ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی موجود ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ جو انھیں نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ ان کی گردنوں سے اُس بوجھ اور اس قید و بند کو ہٹا دیتا ہے جس میں یہ گرفتار ہیں۔ تو جو لوگ ایسے پیغمبرؐ پر ایمان لائے، جنھوں نے اس پیغمبرؐ کا احترام کیا، جنھوں نے اس پیغمبرؐ کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو پیغمبرؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو زندگانی دنیا میں کامیاب ہیں۔"

۱۴۱۴ھ کے آغاز کے ساتھ مرکزِ حسینی ابوظبی میں جس سلسلۂ مجالس کا آغاز ہو رہا ہے اس کے عشرۂ اول کے لئے جس عنوان بیان کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ ہے مسئلہ "رسالتِ الٰہیہ"۔ استقبال عزا کی مجالس میں تمہیدی طور پر آپ کے سامنے یہ بات گذارش کی جا چکی ہے کہ پروردگار عالم کی طرف سے ملنے والے عہدوں میں سے ایک عہدہ کا نام ہے نبوت، اور ایک عہدہ کا نام ہے رسالت۔

جب اللہ کے کسی مقرب بندے کو بغیر کسی واسطۂ بشر کے اللہ کی طرف سے کوئی خبر دی جاتی ہے تو اسے نبی کہا جاتا ہے، اور جب اسی بندۂ خدا کو کسی پیغام رسانی کا ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے تو اسے رسول کہا جاتا ہے۔ رسالت اس پیغام الٰہی کا نام ہے جس کو مالکِ کائنات نے اصلاح عالم کے لئے آسمان سے زمین کی طرف بھیجا ہے۔ رسول اس انسان کو کہا جاتا ہے جس کو اصلاح بشریت کا ذمہ دار بنا کر بھیجا گیا ہے۔ جس کا کام ہے تلاوت آیات۔ جس کا کام ہے تزکیۂ نفوس۔ جس کی ذمہ داری ہے تعلیم کتاب و حکمت۔

رسالت کی وہ آخری منزل جس پر مالک کائنات نے خاتم النبیین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ کو فائز بنایا ہے وہ رسالت، وہ قانون، وہ پیغام الٰہی ہر اعتبار سے جامع قرار دیا ہے۔ اس میں عبد و معبود کا رشتہ بھی پایا جاتا ہے۔ مخلوقات کے درمیان تعلقات کی اصلاح بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی انفرادی زندگی کو بھی نگاہ میں رکھا گیا ہے۔ ان کی اجتماعیت کے قوانین بھی بنائے گئے ہیں ان کی دنیا کو سنوارنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ ان کو آخرت میں فائز، ناجح اور کامیاب بنانے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ اس قانون میں فقط انسانوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ انسانوں کے ساتھ حیوانات کے بارے میں بھی قوانین معین کئے گئے ہیں۔ اس قانون کا تعلق فقط عالم بشریت سے نہیں ہے۔ بلکہ عالم بشریت کے علاوہ دیگر عوالم سے بھی ہے۔ اس قانون کے لانے والے کو اہل زمین ہی کے لئے نہیں بلکہ عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس سارے قانون، اس پوری شریعت، اس سارے پیغام کا ایک ماحصل تھا کہ انسان منزل کامیابی تک پہونچ جائے۔

آج اس سلسلۂ کلام کے پہلے مرحلہ پر جو باتیں فلاح اُمّت سے متعلق آپ کے سامنے گذارش کرنا ہیں ان کی تمہید میں یہ بات آپ نگاہ میں رکھیں کہ لفظ فلاح عربی زبان میں فقط نجاح اور کامیابی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

فلاح یافتہ وہی انسان کہا جاتا ہے جو انسان کامیاب ہو۔ جو ناکام ہو جائے وہ صاحب فلاح نہیں ہے۔ اسی لئے جب مسلمان، مسلمانوں کو بندگی کی دعوت دیتا ہے تو یہ کہہ کر آواز دیتا ہے "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" آؤ کامیابی یہاں ہے۔ اسکے علاوہ کہیں نہیں ہے۔ مسلمان کی کامیابی بندگی پروردگار میں ہے۔ مسلمان کی کامیابی عبادت الٰہی میں ہے۔ مسلمان کی زندگی میں کامیابی معبود کے سامنے سجدہ ریز ہو جانے میں ہے۔ نہ دولت کامیابی کی علامت ہے نہ اقتدار کامیابی کی علامت ہے۔ دنیا میں سارے وسائل اگر بندگی پروردگار سے الگ ہو جاتے ہیں تو انسان ناکام ہو جاتا ہے، اور اگر بندگی پروردگار دنیا کے سارے وسائل سے الگ ہو جاتی ہے تو اس کے بعد بھی انسان کامیاب کہا جاتا ہے اور شائد اسی کامیابی کی بنیاد پر کاشتکاری کرنے والے کو "فلاح" کہا جاتا ہے کہ یہ وہ انسان ہے جو یہ ہنر جانتا ہے کہ زمین میں دانا دبایا کیسے جاتا ہے۔ ایک کو سات سو بنایا کیسے جاتا ہے۔ دنیا میں تجارت کرنے والے اور کاروبار کرنے والے فقط یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا سرمایہ محفوظ رہے اور ایک کے دو ہو جائیں تو اس سے بہتر کوئی شے نہیں ہے۔ مگر جو زمین میں تخم ریزی کرنے والا ہے۔ جو کاشتکاری کرنے والا ہے اس کی نگاہ میں یہ کبھی نہیں ہوتا ہے کہ اگر ایک کلو دانہ ڈال دیا گیا ہے تو دو کلو ہو جائے۔ اس کی نگاہ میں یہ نہیں ہوتا ہے کہ ایک کے دو یا ایک کے چار ہو جائیں۔ اس کی نگاہیں اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہ ہنر سیکھتا ہے اور خالی ہنر نہیں سیکھتا ہے۔ اس مالک پر اعتماد بھی کرتا ہے جس مالک کے رحم و کرم کے بغیر یہ دانہ خود باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ ایک کے چار یا سو دو سو بن جانے کا کیا امکان ہے۔ جتنا کام کاشتکار نے انجام دیا ہے وہ فقط یہ تھا کہ اچھے خاصے دانے کو زمین میں دبا کے اسے سڑا کر، گلا کر نابود بنا دیا ہے۔ جو کام پروردگار نے کیا ہے اس کے بارے میں قرآن مجید آواز دیتا ہے۔ "سات بالیاں اور ہر بالی میں سو دانے"، گویا قدرت آواز دے رہی ہے کہ تمھاری

طاقت کا ماحصل یہ ہے کہ اچھے خاصے دانے کو برباد کر دیا جائے۔ ہمارے کرم کا نتیجہ یہ ہے کہ برباد شدہ کو سات سو بنا کے پیش کر دیا جائے۔ اسی لئے مالک کائنات نے انسان کو اپنے کرم اور اس کی ناطاقتی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا ہے "ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ"۔ "کبھی تم نے اپنی زراعتوں کو دیکھنے کے بعد یہ سوچا ہے کہ یہ زراعت تمھارا کام ہے یا ہمارا کام ہے"۔ یہ تمھارا کام نہیں ہے، پیداوار تمھارے بس کی بات نہیں ہے۔ غلہ کی پیداوار تمھارے بس میں کیا ہوگی خود تمھاری اپنی پیدائش تمھارے اختیار میں نہیں ہے۔ کسی بنانے والے نے بنا دیا۔ بھیجنے والے نے دنیا میں بھیج دیا۔ پیدا کرنے والے نے پیدا کر دیا تو عالم عدم سے عالم وجود میں آگئے۔ تو جو تمھارا پیدا کرنے والا ہے وہی اس غلہ کا پیدا کرنے والا بھی ہے۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اس پیداوار کے لئے تمھارے ہاتھوں کو ذریعہ بنا دیا ہے تاکہ تمھیں اپنی طاقت کا اندازہ ہو سکے اور تمھیں یہ احساس بھی ہو سکے کہ ہم نے تمھارے ہاتھوں کو ذریعہ بنا دیا ہے۔ ہم نے تمھارے بازوؤں میں کتنا دم خم رکھا ہے۔ ہم نے تمھارے ہاتھوں میں کتنی برکتیں رکھ دی ہیں۔ ان برکتوں سے فائدہ نہ اٹھانا اور ان برکتوں کو نحوستوں میں تبدیل کر دینا یہ تمھارا عیب ہے۔ تمھارا فساد ہے۔ تمھاری خرابی ہے۔ تم امانتداری کے ساتھ ان ہاتھوں کو استعمال کروگے تو ایک ہاتھ کاٹ دینے والے کو بدترین سزا دی جائے گی اور ان ہاتھوں کو خیانت سے آلودہ کروگے تو ایک چوتھائی دینار میں تمھارے بھی ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ چند پیسوں میں تمھارے ہی ہاتھ قلم کر دیئے جائیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہم نے قیمت امانتداری کی رکھی ہے۔ قیمت گوشت و پوست کی نہیں ہے۔ ہم نے اس قیمت کو گرا دیا ہے تمھاری خیانت کی بنیاد پر۔ تمھاری ضعف و ناتوانی کی بنیاد پر اسے بیش قیمت نہیں بنایا ہے۔

تو عزیزان محترم! یہ فلاح، یہ کامیابی جس کے لئے اسلام دنیا میں آیا ہے اور جس کا پیغام سرکار دو عالمؐ لے کر آتے تھے کہ حضورؐ کا پہلا اعلان تھا "قُوْلُوْا

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفلِحُوا"۔ لا الٰہ الا اللہ کہو اسی میں فلاح ہے۔ اسی میں کامیابی ہے۔ اس کے علاوہ کامیابی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تین سو ساٹھ خداؤں کے سامنے سجدہ کرنے والے، ہر طرح کی مخلوق کو اپنا معبود ماننے والے افراد کے درمیان سرکار دو عالمؐ آواز دے رہے تھے کہ یہ تین سو ساٹھ خدا تمھیں کامیاب نہیں بنا سکتے۔ پتھروں کے سامنے سجدہ تمھیں کامیاب نہیں بنا سکتا۔ درختوں، پہاڑوں، چاند، سورج کے سامنے سجدہ اور سر جھکا دینا یہ تمھیں کامیاب نہیں بنا سکتا۔ اگر زندگی کو کامیاب بنانا چاہتے ہو تو وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سامنے سجدہ کرو۔ مالک کائنات کے سامنے سر جھکاؤ۔ لا الٰہ الا اللہ کا اعتراف کرو۔ یہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار ہی ہے جو تمھاری زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ یہ روز اوّل سرکار دو عالمؐ کا پیغام فلاح تھا جس کو ساری زندگی مختلف انداز سے تفصیلات کے ساتھ، تشریحات کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں آپ کے سامنے قرآن مجید کے بیان کئے ہوئے نقشہ کو رکھنا چاہتا ہوں۔ عزیزو! میری گذارش ہے کہ آپ ان بیانات پر مکمل توجہ کے ساتھ غور کریں تا کہ آپ یہ محسوس کر سکیں کہ مالک کائنات نے پیغمبرؐ کے ذریعہ جو پہلا اعلان کرایا تھا کہ "لا الٰہ الا اللہ" یہی وہ کلمہ ہے جو تمھاری فلاح اور تمھاری کامیابی کا ضامن ہے۔ جب قرآن مجید اس کلمہ کی تشریح کر رہا تھا تو انسان کو منزل کامیابی تک لے جانے کے لئے کتنے طریقے اختیار کئے ہیں۔ کہاں کہاں انسان کو خطرہ سے آگاہ کیا ہے۔ کہاں کہاں انسان کو کامیابی کے مواقع بتائے ہیں اور کہاں کہاں انسان کو کامیابی کا یقین دلایا ہے۔

قرآن مجید میں اس فلاح اور کامیابی کا تذکرہ متعدد مقامات پر پایا جاتا ہے لیکن سارے مقامات کا تذکرہ کرنا اور ان کا بیان کرنا اس مختصر سے بیان میں ممکن نہیں ہے لہٰذا میں آپ کے سامنے اس قرآنی بیان کے نقشہ کے صرف تین رُخ گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ توجہ فرمائیں گے تو ہماری زندگی کو کامیاب بنانے کا ذریعہ

بھی ہوگا اور ان کی معرفت کا بھی ذریعہ ہوگا جن کی زندگیاں واقعتاً کامیاب نہیں۔ یاد رکھئے فلاح اور کامیابی کے مسئلہ کو قرآن مجید نے تین طریقہ سے بیان کیا ہے۔ بعض مقامات پر یہ اعلان کیا ہے کہ وہ افراد کون سے ہیں جن کا مقدر کامیابی نہیں ہے وہ ناکام ہیں اور ناکام رہیں گے۔ کتنے ہی بلند و برتر کیوں نہ ہو جائیں، کتنے ہی صاحب دولت و ثروت و اقتدار و اختیار کیوں نہ ہو جائیں۔ یہ ناکام تھے اور ناکام رہیں گے۔ ان کے مقدر میں کامیابی نہیں ہے۔

دوسرا سلسلۂ بیان وہ ہے جہاں قرآن مجید نے اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں کامیابی کا امکان پایا جاتا ہے کہ انسان اس راستہ پر چلے تو ناکامی طے نہیں ہے۔ کامیابی کا امکان پایا جاتا ہے۔ ان دونوں مراحل کا فرق آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ پہلی منزل وہ ہے جہاں یہ طے شدہ ہے کہ انسان ناکام ہے اور ناکام رہے گا۔ ایسا انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ اور دوسری منزل وہ ہے جہاں قرآن مجید نے آگاہ کیا ہے کہ اگر اس راستہ پر چلو گے تو ناکامی تمہارا مقدر نہیں ہے اگرچہ کامیابی بھی مقدر نہیں ہے مگر کامیابی کا امکان بہرحال پایا جاتا ہے۔

تیسرا سلسلۂ کلام وہ ہے جہاں قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے کہ اس راہ پر چلو گے تو کامیابی یقینی ہے۔ اس راستہ پر چلنے والا فلاح یافتہ ہے، نجات یافتہ ہے، کامیاب ہے۔ نہ ناکاموں میں شامل ہے اور نہ مشکوک افراد میں شامل ہے۔ توجہ فرما رہے ہیں آپ؟

تو انسانی دنیا کی تین قسمیں ہو گئیں۔ کچھ افراد وہ ہیں جن کے بارے میں یہ طے ہے کہ ناکام ہیں۔ کچھ افراد وہ ہیں کہ جن کے بارے میں یہ امکان ہے کہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مقدر خراب ہو جائے تو ناکام ہو جائیں گے۔ کچھ وہ افراد ہیں جن کے بارے میں یہ طے ہے کہ یہ کامیاب ہیں اور ان کو دنیا کی کوئی طاقت ناکام نہیں بنا سکتی ہے۔

یہ تذکرے بھی قرآن مجید میں انتہائی تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں مگر نمونہ کے طور پر آپ کے سامنے ہر قسم کی پانچ پانچ علامتیں گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ وہ پانچ علامتیں جن کی بنیاد پر اسلام نے انسان کو ناکام بنایا ہے، یا وہ پانچ علامتیں جن کی بنا پر انسان کی کامیابی کا امکان پایا جاتا ہے۔ وہ علامتیں جن کی بنیاد پر انسان کی کامیابی یقینی ہے کہ ایسے انسان کو کوئی ناکام نہیں بنا سکتا ہے وہ کیا ہیں۔

پہلی منزل۔ وہ علامتیں، وہ نشانیاں، وہ زندگی، وہ کردار، وہ اعمال جو انسانی زندگی کو ناکامیاب بنا دیتے ہیں جس کے بعد کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید آواز دیتا ہے:

"اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ" یاد رکھو ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔

"لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ" کافر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔

"اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ" مجرم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔

"لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ" جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ"۔ جو خدا کے خلاف افتراء اور بہتان رکھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔

یہ قرآن مجید کی بیان کی ہوئی پانچ قسمیں ہیں، جن کے بارے میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ افراد کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔

عقیدے کی بنیاد پر جو کافر ہیں وہ ناکام ہیں۔

عمل کی بنیاد پر جو ظالم ہیں وہ ناکام ہیں۔

جو خدا پر افترا کرنے والے ہیں وہ ناکامیاب ہیں۔

جو مجرم ہیں وہ ناکام ہیں۔

جو جادوگر ہیں وہ ناکام ہیں۔

یہ پانچ قسمیں ہیں جن کے بارے میں قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ ان کے

مقدر میں کامیابی نہیں ہے اور یہ ناکام ہیں۔

میں پھر لفظوں کو دوہراؤں تاکہ آپ لفظ کے معنی پہچانیں۔ کافر کامیاب نہیں ہے۔ ظالم کامیاب نہیں ہے۔ مجرم کامیاب نہیں ہے۔ افترا پرداز کامیاب نہیں ہے۔ جادوگر کامیاب نہیں ہے۔

اب اگر خود قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ قسمیں کامیاب نہیں ہو سکتیں تو پہچانو کہ جو روز اول یہ کہہ رہا تھا کہ میرے کہنے کی بنیاد پر "لا الہ الا اللہ" کہو اسی میں کامیابی ہے۔ میرے پیغام کو قبول کرو اسی میں کامیابی ہے اور پھر یہ اعلان کر رہا ہے کہ کافر فلاح یافتہ نہیں ہے۔ مجرم کامیاب نہیں ہے۔ ظالم کامیاب نہیں ہے۔ جادوگر کامیاب نہیں ہے۔ افترا پرداز کامیاب نہیں ہے تو گویا ایک طرف کامیابی کا پیغام دے رہا ہے اور دوسری طرف اپنے کردار کا اعلان بھی کر رہا ہے کہ اگر میری زندگی میں کفر یا جرم داخل ہوتا تو میں خود ہی کامیاب نہ ہوتا جب کہ میرا پیغام فلاح اور کامیابی کا پیغام ہے اور میرا ہی یہ اعلان ہے کہ یہ پانچ طرح کے انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ تو جب میں تمھیں کامیابی کا پیغام سُنا رہا تھا تو گویا میں اپنی پوری زندگی کا بھی اعلان کر رہا تھا کہ میرے اعلانات کی روشنی میں میری زندگی کا جائزہ لے لو۔ میری زندگی میں اگر کفر شامل ہوتا تو میں خود ہی کامیاب نہ ہوتا۔ میری زندگی میں اگر ظلم شامل ہوتا تو میں خود ہی کامیاب نہ ہوتا۔ میری زندگی میں اگر ظلم شامل ہوتا تو میں خود ہی کامیاب نہ ہوتا۔ میں خدا کے خلاف کوئی بات گڑھ کے بیان کرتا تو میں خود ہی کامیاب نہ ہوتا۔ میں جادوگر ہوتا تو میں خود ہی کامیاب نہ ہوتا۔ پیغام فلاح دے کر میں نے واضح کر دیا کہ میری زندگی وہ سراپا ایمان ہے جہاں کفر کا گذر نہیں ہے۔

پھر میری زندگی وہ سراپا عدالت ہے جہاں ظلم کا گذر نہیں ہے۔

میری زندگی اتنی پاکیزہ ہے جہاں جرائم کا گذر نہیں ہے۔

میرا بیان وحیِ پروردگار ہے جہاں افترا کا امکان نہیں ہے۔

میرا طرزِ عمل معجزہ ہے اسے جادو نہیں کہا جا سکتا ہے۔
یہ قرآن مجید کے بیان کی پہلی قسم ہے جہاں یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسان اگر ان پانچ طرح کے جرائم میں مبتلا ہوگا تو ایسا انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے، جس کو انسانیت کی کامیابی کہا جا سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ صاحبِ دولت ہو جانا اگر کوئی کامیابی ہوتا تو قارون سے بڑا کامیاب کوئی نہیں تھا۔ صاحبِ اقتدار ہو جانا اگر کوئی کامیابی ہوتا تو ہٹلر جیسے لوگ بھی کامیاب ہی کہے جاتے۔ مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ نہ دولت کسی کو کامیاب بنا سکتی ہے نہ اقتدار کامیاب بنا سکتا ہے۔
اگر انسان کامیاب بننا چاہتا ہے تو کفر سے الگ ہو کر اسلام کے جادہ پر آنا ہوگا ظلم کو چھوڑ کے عدالت کے راستہ پر چلنا ہوگا۔ جرائم سے الگ ہو کر انصاف کے راستہ پر چلنا ہوگا۔ افترا پردازی کو چھوڑ کے وحیٔ خدا کا اتباع کرنا ہونا۔ جادوگری سے کنارہ کش ہو کر وہ طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا جو حقائق کے مطابق ہو، جہاں کوئی فریب نظر نہ ہو، جہاں کوئی شعبدہ کاری نہ ہو، جہاں کوئی جادوگری نہ ہو۔ اگر تم نے اپنے اندر یہ کمال کردار پیدا کر لیا تو تم بھی کامیاب کہے جانے کے قابل ہو اور اگر یہ کمال کردار پیدا نہ ہو سکا تو ایسے افراد کا مقدر ناکامی ہے کامیابی نہیں ہے۔
دوسرا سلسلۂ کلام جہاں قرآن مجید نے یہ اعلان کیا ہے کہ انسانی دنیا میں کچھ ایسے افراد پائے جاتے ہیں جن کی کامیابی کا امکان ہے۔ وہ ناکام نہیں ہیں مگر کامیابی کا یقین بھی نہیں ہے۔ تم اگر کامیاب بننا چاہتے ہو تو اس راستہ پر چلو شاید کامیاب ہو جاؤ۔ اس کی بھی پانچ مثالیں قرآن مجید سے آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔
پروردگار عالم نے پہلے اپنی نعمتیں انسان کے سامنے پیش کیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک سب نعمتِ پروردگار ہے۔ انسان کا وجود، انسان کی حیات۔ انسان کی ایک ایک سانس سب نعمتِ پروردگار ہے۔ ان ساری نعمتوں کو انسان کے سامنے پیش کرنے کے بعد پروردگار سے بہتر کون جانتا ہے کہ یہ انسان نعمتوں کو لینا جانتا ہے، نعمتوں کو یاد رکھنا نہیں جانتا ہے۔ جب آپس کی برادری میں ایک دوسرے

کے احسان کو یاد نہیں رکھتا تو ایک غیبی طاقت کے احسانات کو کیا یاد رکھے گا۔
لہٰذا پروردگار نے انسان کو متوجہ کیا کہ اگر تم نے نعمتوں کو بھلا دیا تو تمھاری زندگی ناکام ہے۔ اور اگر کامیابی کے راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو وہ "فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو شائد کامیاب ہو جاؤ۔ یہ "شاید" کیوں ہے؟۔ نعمتوں کو یاد رکھنے کے بعد تو انسان بہر حال کامیاب ہو جائے گا اس لئے کہ ہر قدم پر بھول جانے کے خطرات ہیں۔ خالی یاد رکھنا کوئی ہنر نہیں ہے۔ جب انسان نعمتوں کو یاد رکھے گا تو صاحب نعمت کا شکریہ ادا کرے گا۔ اگر نعمت کی یاد کے ساتھ شکریہ شامل ہو جائے تو کامیابی یقینی ہو جائے گی۔ اور اگر نعمتوں کو یاد رکھا اور شکریہ ادا نہ کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی امکان فلاح ہے شاید کبھی شکر گذار بن جائے۔ لیکن اگر کبھی نعمتوں کو بھول گیا تو ناکامی یقینی ہے۔ لہٰذا نعمتوں کو یاد رکھنا یہ ایک درمیانی راستہ ہے جہاں بھولنے والا ناکام ہے اور شکر گذار کامیاب ہے اور یاد رکھنے والا درمیانی راستہ پر چل رہا ہے۔ کبھی بھول گیا تو ناکام ہو جائے گا، اور کبھی شکر گذار ہو جائے گا تو کامیاب ہو جائے گا۔

دوسرے مقام پر اعلان ہو رہا ہے " تُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ اگر گناہ کرنا جانتے ہو تو توبہ کرنا بھی سیکھو۔ اگر خطا کرنا جانتے ہو تو معافی مانگنا بھی سیکھو۔ اگر غلطی کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کی بارگاہ میں معذرت کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔ "تُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ" صاحبانِ ایمان! اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو۔

خدایا! اس توبہ کا فائدہ کیا ہوگا؟

کہا "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" شاید یوں ہی کامیاب ہو جاؤ۔

یہاں بھی شاید کے معنی پہچانیں۔ یعنی اگر گناہ کر کے توبہ سے الگ رہے تو بالکل ناکام، اور اگر توبہ قبول ہو گئی تو بالکل کامیاب۔ لیکن توبہ سے الگ نہ رہنا۔ توبہ کے راستہ پر چلو "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" شاید کامیاب ہو جاؤ۔ اس لئے کہ توبہ

کرنے کے بعد قبول ہونے کا امکان ہے۔ اگر توبہ ہی نہ کیا تو قبول کیا ہوگا۔ توبہ ایک راستہ ہے کامیابی تک جانے کا۔

تیسرا راستہ "وَاعْبُدُوا اللهَ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" اے انسانو! اے اللہ کے بندو! اللہ کی بندگی کرو۔ اللہ کی عبادت کرو اور نیکیاں انجام دو "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" شاید یوں ہی فلاح مل جائے۔ شاید یوں ہی کامیاب ہو جاؤ۔ کامیابی کا راز کیا ہے۔ بندگی پروردگار اور فعل خیر۔ اس لفظ پر آپ توجہ فرمائیں گے۔ کیا بندگی سے بالاتر کوئی چیز دنیا میں ہوتی ہے۔ کیا عبادتِ الٰہی سے بالاتر دنیا میں کوئی شے ہے۔ یہی کہہ دیا ہوتا کہ اللہ کی بندگی کرو شاید کامیاب ہو جاؤ۔ نہیں اللہ کی بندگی کرو اور نیکی کرو شاید یوں ہی کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے معنی کیا ہوئے کہ اسلام اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ انسان بندہ پروردگار ہو کے دنیا سے غافل ہو جائے۔ اسلام پہاڑوں کی زندگی سکھانے کے لئے نہیں آیا ہے۔ اسلام غاروں میں زندگی گذارنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ اسلام سماج میں زندہ رہنے کے لئے آیا ہے۔ اگر پہاڑوں اور غاروں میں جا کے بندگی کرنے لگے اور نیکیوں کو بھول گئے تو کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کامیابی کا امکان اسی وقت پیدا ہوگا جب خدا کے سامنے آئے تو بندگی کرو، اور بندے سامنے آئیں تو نیکیاں انجام دو۔

"وَاعْبُدُوا اللهَ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" اللہ کی عبادت اور اللہ کی بندگی کرو اور نیکیاں انجام دو شاید یوں ہی فلاح حاصل ہو جائے۔

یہ تین مرحلے ہیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کیے۔ نعمتِ خدا کو یاد رکھنا، یہاں بھی امکان فلاح ہے۔ گناہوں سے توبہ کرنا، یہاں بھی نجات اور کامیابی کا امکان پایا جاتا ہے۔ عبادتِ خدا اور فعل خیر، یہاں بھی کامیابی کا امکان پایا جاتا ہے۔

یہاں لفظ امکان کیوں ہے کہ عبادتِ خدا کرو شاید کامیاب ہو جاؤ۔ نیکیاں کرو شاید کامیاب ہو جاؤ۔

خدایا! تیری عبادت کے بعد شاید کے کیا معنی ہیں، نیکیوں کے بعد شاید

کے معنی کیا ہیں۔ اگر عبادت کے بعد بھی کامیابی نہیں ہے تو کامیابی کہاں ہوگی؟ اگر نیکیوں میں بھی کامیابی کا یقین نہیں ہے تو کامیابی کہاں ہوگی؟

قدرت آواز دے کی عبادتوں میں کامیابی کا یقین ہے۔ تمھاری عبادت کے کامیاب ہونے کا یقین نہیں ہے، یعنی تنہا عبادت کرنا یہ کامیابی کو یقینی نہیں بنا سکتا ہے۔ عبادت کرنا تمھارا کام ہے، عبادت کو قبول کرنا ہمارا کام ہے۔ جب عبادت قابل قبول ہوجائے گی تو کامیابی یقینی ہوجائے گی۔ جب نیکیاں قابل قبول ہوجائیں گی کہ ریاکاری نہ ہو، دنیا کو دکھانے کا جذبہ نہ ہو، غریبوں پر احسان نہ جتایا جائے۔ جب ان سارے عیوب سے تمھاری نیکیاں الگ ہوجائیں گی اور نیکی قابلِ قبول ہوجائے گی تو کامیابی بھی یقینی ہوجائے گی۔ مگر عبادت جب تک خالی عبادت ہے، جب تک نیکیاں فقط نیکیاں ہیں کامیابی کا امکان ہے مگر کامیابی کا یقین نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابھی عبادت میں شبہ ہے کہ شاید قابل قبول نہ ہو۔ ابھی نیکیوں میں شبہ ہے کہ شاید خدا کی بارگاہ میں قبول ہونے کے قابل نہ ہوں۔ جب اس منزل تک پہونچ جاؤ گے تو کامیابی بھی یقینی ہوجائے گی کہ یہ کامیابی تک جانے ہی کا راستہ ہے۔

چوتھا راستہ "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" یاد رکھو شراب، جوا، انصاب، ازلام سب رجس اور شیطانی اعمال ہیں ان سے اجتناب کرو شاید فلاح پاجاؤ۔ اس مقام پر بھی لفظ 'شاید' استعمال ہوا ہے کہ صرف شراب اور جوے کا ترک کردینا کافی نہیں ہے بلکہ ہر رجس اور ہر شیطانی عمل سے پرہیز کرنا ضروری ہے کہ جس کے بغیر کامیابی یقینی نہیں ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ شراب اور جوئے سے پرہیز نہ کرنے کی صورت میں کامیابی کا احتمال بھی نہیں ہے، اور ناکامی ایک یقینی امر ہے۔

اس کے بعد پانچواں راستہ "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" ایمان والو! اللہ سے ڈرو

تقوائے الٰہی اختیار کرو۔ "وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ" اور وہاں تک جانے کا وسیلہ اختیار کرو اور راہِ خدا میں جہاد کرو کہ شاید کامیاب ہو جاؤ۔

کامیابی کا ایک راستہ یہ بھی ہے جو راستہ مرکّب ہے چار چیزوں سے۔ ایمان، تقویٰ، وسیلہ اور جہاد۔ جب یہ چاروں باتیں حاصل ہو جائیں گی تو اس کے بعد قرآن کہتا ہے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" شاید کامیاب ہو جاؤ۔ یعنی اگر ایمان نہیں ہے تو طے ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر تقویٰ نہیں ہے تو یقین ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر جہاد نہیں ہے تو طے ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر وسیلہ نہیں ہے، تو طے ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر یہ چاروں باتیں جمع ہو جائیں تو امکانِ کامیابی ضرور پیدا ہو جاتا ہے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔ کامیابی کی منزل تک پہونچنے کے لئے ایمان درکار ہے، تقویٰ کی ضرورت ہے، جہاد لازم ہے، وسیلہ کو تلاش کرنا ہے۔ اس کے بغیر انسان کامیابی کی منزل تک نہیں جا سکتا ہے۔ یہ بھی ایک راستہ کامیابی کا ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ اور شاید یہاں بھی ایک مصلحتِ پروردگار تھی جو خدا نے کہا 'شاید'۔ اور جب میں نے ہر آیت میں 'شاید' کی وضاحت کی ہے تو اس آیت کے بارے میں بھی دو لفظیں سُنیں آپ۔ کہ خدا نے یہاں 'شاید' کیوں کہا؟ چار چار کمالات پیدا کرنے کے بعد بھی ابھی کامیابی شاید ہے۔ ایمان بھی ہے۔ تقویٰ بھی ہے۔ وسیلہ بھی ہے۔ جہاد بھی ہے اور اس کے بعد بھی خطرہ ہے تو آخر کامیابی یقینی کس دن ہو گی؟ اگر اتنے کمالات کے بعد بھی ابھی شاید باقی ہے تو کامیابی کا یقین کس دن پیدا ہو گا؟ خدایا! اب اس کے بعد یہ شاید کیوں ہے؟ تو عجب نہیں کہ قدرت آواز دے تم نے غور نہیں کیا۔ ایمان لے آنا تمہارا کام ہے، ایمان کا باقی رہنا بھی ایک کام ہے۔ تقویٰ کے راستہ پر چلنا یہ پہلا کام ہے۔ دل میں خوفِ خدا کا رہ جانا یہ دوسرا کام ہے۔ میدانِ جہاد میں قدم رکھنا یہ ایک کام ہے میدانِ جہاد میں رہ جانا یہ دوسرا کام ہے۔ وسیلہ ڈھونڈھ لینا یہ ایک کام ہے، وسیلہ سے

وابستہ ہو جانا یہ دوسرا کام ہے۔

جب تک انسان اس منزل پر فائز نہ ہو جائے اس وقت تک کامیابی یقینی نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن بہر حال اگر کامیابی کا امکان پایا جاتا ہے تو انہی راہوں میں کامیابی کا امکان ہے۔ ایمان کی راہ پر چلو کامیابی کا امکان ہے۔ تقویٰ کا راستہ اختیار کرو کامیابی کا امکان ہے۔ جہاد راہِ خدا کی منزل میں قدم رکھو کامیابی کا امکان ہے۔ وسیلہ تلاش کرو کامیابی کا امکان ہے۔ ان امور سے الگ ہو گئے تو کامیابی کا امکان بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ میں نے ایک لفظ کہا ہے، شاید میرے بہت سے بچے متوجہ نہ ہوئے ہوں۔ وسیلہ تلاش کرنا ایک کام ہے، وسیلہ سے وابستہ ہو جانا یہ دوسرا کام ہے۔ ہمیں آپ کو تو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم نے تلاش بھی کر لیا، وابستہ بھی ہو گئے۔ ورنہ ہمیں تو ایسے بدقسمت بھی نظر آئے جن کو بغیر تلاش کئے ہوئے مل گیا مگر وابستہ نہ ہو سکے۔ ہم نے کتابوں میں تلاش کیا، ہم نے تاریخوں میں ڈھونڈھا ہم نے قرآن میں تلاش کیا، ہم نے حدیثوں میں تلاش کیا، پرانی داستانوں میں تلاش کیا۔ اتنی تلاش کے بعد جب وسیلہ کو پالیا تو وابستہ ہو گئے۔ مگر ایسے بھی بدقسمت تھے جنھیں ڈھونڈھنا نہیں پڑا۔ بھری دوپہر میں، کھلے میدان میں وسیلہ نگاہ کے سامنے تھا اور بغیر تلاش کے خدا نے دے دیا تھا مگر مقدر کی خرابی کہ وابستہ نہ ہو سکے۔

یہ گفتگو کا دوسرا مرحلہ، تیسرا اور آخری مرحلہ جہاں پروردگار عالم نے کامیابی کے یقینی ہونے کا اعلان کیا ہے۔

یہ کون سا راستہ ہے۔ اب تک میں نے ہر مرحلہ پر پانچ مثالیں آپ کے سامنے گذارش کی ہیں تو یہاں بھی پانچ مثالیں گذارش کرنا چاہتا ہوں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ افراد کیسے ہیں جن کو قرآن مجید نے یقینی طور پر کامیاب قرار دیا ہے۔

پہلی مثال "فَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" جسے نفس کے بخل سے نجات مل جائے وہ یقیناً کامیاب ہے۔ بخل، انسانی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت ہے جو کامیابی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

کیا بدبختی ہے انسان کی، جس کا نام ہے بخل کہ انسان دنیا کی ہر مصیبت سے نجات پا لیتا ہے۔ مگر یہ بخل انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو اس سے نجات حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ کہاں کہاں یہ انسان کو غارت کرتا ہے۔ فقط یہی نہیں ہے کہ انسان میں پیسے کا بخل ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس ہزاروں لاکھوں ہیں مگر فقیر کے لئے پانچ پیسے بھی نہیں ہیں تو آپ نے کہا کہ یہ آدمی بہت بخیل ہے۔

نہیں، بخیل کی ایک ہی قسم نہیں ہے۔ ہم تو خالی اتنا ہی جانتے ہیں کہ کوئی کسی کو پیسہ نہ دے تو اس کے معنی ہیں بخیل۔ نہیں بخل کی بڑی قسمیں ہیں۔ جانے کتنی قسمیں ہیں اگر انسان محاسبہ کرے تو اسے اندازہ ہوگا کہ ہوسکتا ہے کہ ہم میں پیسہ کا بخل نہ ہو لیکن ہزار طرح کی اور کمزوریاں پائی جاتی ہوں جن کو بخل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ پیسہ ہمارا ہے، فقیر نے ہم سے مانگا ہم نے نہیں دیا، اسے کہا گیا بخل، اور آدمی ہوگا بخیل۔

یہ جگہ جہاں آپ بیٹھے ہیں یہ جگہ آپ کی ہے۔ جتنی دیر آپ بیٹھے ہیں یہ جگہ آپ کی ہے۔ ایک انسان نے کہا کہ آپ ہٹ جائیے، ہم کو بیٹھنے دیجئے۔ آپ نے کہا یہ نہیں ہوسکتا ہے۔ تو کیا اس کا نام ہے سخاوت؟۔ ہرگز نہیں۔ وہ پیسہ جو اس نے نہیں دیا وہ پیسہ اس کا تھا۔ یہ جگہ جس پر آپ بیٹھے ہیں یہ تو واقعاً آپ کی ہے بھی نہیں۔ جتنی دیر آپ بیٹھے ہیں اتنی دیر آپ کی جگہ ہے۔ آپ اٹھ جائیں گے قصّہ ختم ہو جائے گا لیکن تھوڑی دیر کے لئے جگہ آپ کے قبضہ میں آگئی تو آپ کسی غریب کو دینے کے لئے تیار نہیں ہیں تو جس کا مال ہمیشہ اس کا مال رہنے والا ہے جب وہ نہیں دیتا ہے تو وہ غریب کیوں بخیل کہا جاتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم بخل کے ایک ہی معنی جانتے ہیں اور دوسری قسموں کو پہچانتے بھی نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر ہم غور کر رہے تھے اچانک ایک مصرع یا ایک شعر ذہن میں آگیا۔ کسی نے کہا آپ نے اس زمین میں کوئی شعر کہا ہے؟

ہم نے کہا ابھی تو ہم سوچ رہے ہیں۔

کیوں؟ اس لئے کہ خطرہ یہ ہے کہ اگر شعر اس کو سنا دیا، ہوسکتا ہے کہیں یہ

پڑھ دے اور اس کے کام آجائے۔ یہ ہمارا کمال کرم ہے، ہم بڑے کریم ہیں، اس لئے کہ ہم نے اپنا شعر کسی کو نہیں سُنایا۔

عزیزو! جیسے شاعر کے لیے شعر، ویسے ہی مال دار کے لیے مال۔ وہ اس کا مال ہے، یہ اس کا مال ہے۔ مالدار اپنا مال نہ دے تو بخیل کہا جائے گا، اور شاعر اپنے کلام میں بخل کرے تو یہ بڑے شاعر ہیں کہ کسی کو اپنا شعر سناتے ہی نہیں ہیں۔ یہ شاعر نہیں ہیں یہ بڑے بخیل ہیں۔ انھیں کرم خدا پر اعتبار نہیں ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ شعر ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ آخر ذہن میں یہ طاقت، یہ صلاحیت کس نے پیدا کی ہے۔ جس نے ذہن میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کیا اس کے بعد وہ عاجز ہوگیا ہے اب نئے شعر کی صلاحیت نہیں پیدا کرسکتا ہے؟ جب کہ مولائے کائناتؑ نے علم اور مال کا یہی فرق بیان کیا ہے کہ مال کی شان یہ ہے کہ خرچ کردیا جائے تو ختم ہوجائے گا، اور علم کی شان یہ ہے کہ جتنا لُٹایا جائے گا اُتنا ہی بڑھتا جائے گا۔

وہ مال کا بخیل ہے۔ یہ جگہ کا بخیل ہے۔ وہ شعر کا بخیل ہے۔ اور آگے بڑھئے ایک مسئلہ مجھے آتا ہے۔ ایک آدمی مسئلہ پوچھنے کے لئے آگیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے بتادیا تو مجھ میں اور اس میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا والے یہ سمجھیں کہ ایک مسئلہ ایسا بھی ہے جس کو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ ہزار پوچھنے والے آئیں میں بتانے کے لئے تیار نہیں۔ مالدار اپنا مال نہ دے تو بخیل، اور عالم اپنا علم نہ دے تو بہت بڑے عالم؟ نہیں، یہ بہت بڑے عالم نہیں ہیں، یہ بہت بڑے بخیل ہیں۔

ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم نے بخل کی قسموں کو نہیں پہچانا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خالی مال ہمارے پاس آجائے اور خدا ایسی توفیق دیدے کہ مال لُٹاتے رہیں۔ نہیں عزیزو! آپ مال لُٹاتے رہیں اس کے بعد بھی آپ کریم نہ بنیں گے۔ آپ سارا مال خرچ کردیں اس کے بعد بھی سخی نہ ہوں گے، اس لئے کہ زندگی

میں سخاوت اور بخل کے بہت سے شعبے ہیں، جب تک انسان ہر شعبے میں کرم اور سخاوت کا مظاہرہ نہ کرے گا کریم اور سخی کہے جانے کے قابل نہ ہو گا۔ غور کیا آپ نے ؟۔ اگر ان تمام خصوصیات کو آپ نگاہ میں رکھیں تو قرآن کی آیت کے معنی پہچانیں" ومن یوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون" جو نفس کے بخل سے محفوظ ہو جائے، جو نفس کی کنجوسی سے محفوظ ہو جائے بس یہ ہیں جن کی کامیابی یقینی ہے۔

توجہ کی آپ نے ؟۔ کامیابی بخل میں نہیں ہے، بخل سے محفوظ ہو جاؤ تو کامیابی ہے۔ کیوں ؟ اس لئے کہ اگر بخل سے محفوظ ہو گئے، تو آپ سے کون سا کمال بچا ہے۔ مال ہے وہ دے دیا۔ جگہ ہے وہ دے دی۔ علم ہے وہ دے دیا۔ کمال ہے وہ دے دیا۔ جو اتنا لٹانے پر آمادہ ہو جائے وہ اگر کامیاب نہ ہو گا تو کون کامیاب ہو گا۔

میں ایک لفظ اس مقام پر اور کہنا چاہتا ہوں، شاید آپ اس کے معنی محسوس کریں۔ کمال کا جمع کر لینا یہ کامیابی نہیں ہے، مال اور کمال کا لٹا دینا یہ کامیابی ہے۔ اگر کروڑوں کا خزانہ رکھ کے قارون ہو جائے تو یہ کامیاب نہیں ہے۔ بیت المال میں جھاڑو دے کر مصلیٰ بچھا دے تو کامیاب ہے۔ کمال کو دبا کے بیٹھ جائے تو کامیاب نہیں ہے۔ سَلُونِی کا اعلان کرے تو کامیاب ہے۔ اسی لئے تاریخ میں ہم نے دو لفظیں دیکھی ہیں۔ جو مال کو دبا لیتے ہیں انھیں غنی کہا جاتا ہے، اور جو لٹا دیتے ہیں انھیں جناب امیر کہا جاتا ہے۔

تو انسان کی کامیابی یقینی ہے۔ اگر انسان کے نفس سے یہ بخل نکل جائے، یہ عیب نکل جائے، یہ کمزوری، یہ نقص جدا ہو جائے۔

یہ ایک راستہ ہے جو قرآن مجید نے کامیابی کے لئے بیان کیا ہے اور جس میں کامیابی کو یقینی قرار دیا ہے۔

اس کے بعد آپ قرآن مجید کھولیں تو پہلے صفحہ پر یہ اعلان موجود ہے " ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ

الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

یہ قرآن وہ کتاب ہے جس میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صاحبانِ تقویٰ کے لئے ہدایت ہے۔ اور متّقی وہ افراد ہیں جن کا ایمان غیب پر ہے، جو نماز قائم کرنے والے ہیں۔ خدا کے دیئے ہوئے رزق میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے والے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کا ایمان اس پر بھی ہے جو نبی پر نازل ہوا ہے، اور اس پر بھی ہے جو پیغمبرؐ سے پہلے نازل ہوا ہے۔ اور یہ آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں۔ جو ایسے کمالات جمع کرلیں یہی وہ ہیں جو خدا کی طرف سے منزلِ ہدایت پر ہیں "وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" اور یہی وہ ہیں جو کامیاب ہیں۔

تو قرآن نے کامیابی کو کہاں یقینی قرار دیا ہے؟ کامیابی یقینی ہے مُتّقین کے لئے۔ مُتّقین کون ہیں؟ جن کا ایمان غیب پر ہو۔ اس کے معنی کیا ہوئے کہ اگر انسان مُتّقی نہیں ہے تو کامیابی یقینی نہیں ہے۔ اگر انسان کا ایمان غیب پر نہیں ہے تو کامیابی یقینی نہیں ہے۔ اگر انسان نماز قائم نہیں کرتا ہے تو کامیابی یقینی نہیں ہے۔ اگر راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتا ہے تو کامیابی یقینی نہیں ہے۔ اگر تنزیلِ خدا پر بھروسہ نہیں ہے تو کامیابی یقینی نہیں ہے۔ اگر آخرت کا یقین نہیں ہے تو کامیابی یقینی نہیں ہے۔ جب یہ سارے کمالات جمع ہوجائیں تو قرآن کہتا ہے "اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" یہ وہ افراد ہیں جن کی کامیابی یقینی ہے۔ جن کو پروردگارِ عالم نے فلاح یافتہ قرار دیا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں نجات کو یقینی بنایا گیا ہے، جہاں نجات کا فقط امکان اور احتمال نہیں ہے بلکہ یقین ہے۔

اس کے علاوہ نجات کے اور بھی مرحلے ہیں اور شاید سب کا وقت نہ رہ جائے۔

قرآن مجید کا سورۂ مومنون، جہاں پروردگارِ عالم نے نجات کا اعلان کیا ہے، "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" فلاح اور کامیابی صاحبانِ ایمان کے لئے ہے ـــــ کون

صاحبانِ ایمان؟ "اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ" وہ صاحبانِ ایمان جو نماز پورے خضوع وخشوع اور توجہ قلب کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ "وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ" لغویات سے اعراض کرنے والے ہیں۔ "وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْنَ" جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔ راہِ خدا میں بہت سی نیکیاں انجام دینے والے ہیں۔ "اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ" یہ وہ جنّت کے وارث ہیں جو آخرت میں جنّت کے وارث قرار دیے جائیں گے۔

تو نماز ادا کرے توجہ کے ساتھ۔ لغویات سے اعراض کرے۔ زکوٰۃ ادا کرے۔ شہادتوں کے ساتھ قیام کرے۔ نیکیوں کو انجام دے۔ جب یہ سارے کمالات پیدا ہو جائیں تو خدا کہتا ہے "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" یقیناً ایسے ایمان والے ہیں جن کی کامیابی یقینی ہے۔

تو عزیزانِ محترم، بس میں بات کو آخری مرحلے پر لاتے ہوئے ایک آخری جملہ کہہ کر اس موضوع کو یہیں پر روک دینا چاہتا ہوں۔ باقی باتیں انشاء اللہ آئندہ گذارش کروں گا۔

قرآن مجید کے بیان کی بنیاد پر عالم انسانیت تین حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔

کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں طے ہے کہ کامیاب نہیں ہیں۔

کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں امکان اور احتمال کامیابی کا پایا جاتا ہے کہ اگر شرائط کو اکٹھا کر لیں تو کامیاب ہو جائیں گے، اور اگر شرائط سے خالی رہ جائیں تو ناکام ہو جائیں گے۔

یہ کل خلاصہ ہے قرآن مجید کے ان بیانات کا۔ اب آئیے اسلام کی تاریخ کے دو جملے دیکھیں اور بات مکمّل ہو جائے۔

اسلام، پیغامِ فلاح ہے۔ اسلام کا پیغام کامیابی کا پیغام ہے۔ پیغمبرؐ اسلام نے راہِ تبلیغ میں زبان کھولی تو پہلا جملہ کہا "قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا"۔ لا الٰہ الا اللہ کہو اسی میں فلاح اور اسی میں کامیابی ہے، یعنی پیغمبرؐ کامیابی کا پیغام لے کر

آئے ہیں۔ پیغمبرؐ عالم انسانیت کو کامیاب بنانے کے لئے آئے ہیں۔ یہی نبوت کا کام تھا اور اسی ایک کام کی ساری تفصیلات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں پایا جاتا ہے۔ میں نے ناکامی کا اعلان اسی لئے کیا ہے کہ کامیابی کو پہچانو۔ کامیابی کے راستے اسی لئے بتائے ہیں تاکہ لاالٰہ الا اللہ کے راستہ پر چلنے کا طریقہ سیکھو۔ کامیاب لوگوں کا تعارف اسی لئے کرایا گیا تاکہ اندازہ ہو جائے کہ کیسے ہو جاؤ تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔ تو پیغمبر اسلام کا ابتدائی اجمال "قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" اور قرآن مجید کی ساری تفصیلات سب کا ایک ماحصل ہے ایسے ہو جاؤ کہ کامیاب کہے جاؤ۔ نبی اسی کام کے لئے آیا ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ تو نبی کا مقصد مکمّل ہو جائے۔ اب آخری جملہ کو یاد رکھئے گا پیغمبرؐ کا پہلا پیغام فلاح و کامیابی اور قرآن کی یہ ساری آیتیں اسی کامیابی کی تشریح۔ اسی کامیابی کی تفصیل۔ اسی کامیابی کی توضیح۔ جب پیغمبرؐ اور قرآن کا کل مقصد یہ ہے کہ عالم انسانیت کامیاب ہو جائے تو عزیزو! مجھے ایک بات کہنا ہے کہ جب نبیؐ کی جگہ پر نبی کے کام کو سنبھالنا ہوگا۔ جب قرآن کی جگہ پر وارث قرآن لانا ہوگا تو ایسے آدمی کو ڈھونڈھنا پڑے گا جو نبی کی طرح کامیابی کا پیغام لانے والا ہو۔ اور قرآن کی طرح کامیابی کی ضمانت دینے والا ہو۔ شاید یہی راز تھا کہ بچّے نے نبی کی گود میں آنے کے بعد جو توریت و انجیل و زبور کی تلاوت کے بعد قرآن کی تلاوت کا آغاز کیا تو سورہ حمد سے نہیں، قُل ھو اللہ سے نہیں، بلکہ سب سے پہلے سورۂ مومنون کی آیت پڑھی "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ"، کامیابی صاحبانِ ایمان کے لئے ہے۔ یعنی نبیؐ نے تبلیغ میں زبان کھولی تو پہلا اعلان تھا "تُفْلِحُوا" کامیابی۔ علیؑ نے دنیا میں زبان کھولی تو پہلا اعلان تھا فلاح و کامیابی۔

یہ نبیؐ کی حیات ہے، وہ علیؑ کی حیات ہے۔ اور کیا کہنا اس حیاتِ علیؑ کا کہ دنیا میں آکے نبیؐ کی گود میں بولے تو کامیابی کا اعلان۔ اور مسجد کوفہ میں سر پر ضربت لگی تو پھر کامیابی کا اعلان تاکہ اندازہ ہو جائے کہ یہ پوری حیات کامیابی ہی کامیابی ہے۔

یہ حیات علیؑ بن ابی طالبؑ ہے جس کا آغاز بھی کامیابی اور جس کا انجام بھی کامیابی۔ اور اسی لئے جب علیؑ نے سورۂ مومنون کی آیات کی تلاوت شروع کی تو پیغمبرؐ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا "بِكَ يُفْلِحُ الْمُؤْمِنُوْنَ"۔ جو آیتیں تم پڑھ رہے ہو "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" صاحبانِ ایمان کامیاب ہو گئے جو نماز پڑھنے والے، زکوٰۃ دینے والے، برائیوں سے پرہیز کرنے والے ہیں۔ یہ سب صاحبانِ ایمان کامیاب ہو گئے۔ مگر یا علیؑ یہ کامیابی تمہاری وجہ سے ہے۔ یہ کامیابی تمہارے ذریعہ سے ہے۔ اس کے معنی کیا ہوئے کہ نمازیوں کو کامیابی ملے گی مگر تمہارے ذریعہ۔

یعنی خالی "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" سے کام نہ چلے گا۔ اسے بھی تو درمیان میں لاؤ جس کے ذریعہ کامیابی کا اعلان ہے "خَيْرُ الْعَمَلِ"، علیؑ سے وابستگی کا اعلان ہے۔

عالم انسانیت کو منزلِ فلاح اور کامیابی تک پہونچانے کے لئے سرکار دو عالمؐ نے جتنی زحمتیں برداشت کیں اپنے اقوال کے ذریعہ، قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ تکلیف ہو، اور چھوڑ کے آدمی راحتوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ وطن میں غربت ہو اور انسان دولت کی تلاش میں نکل پڑے۔ وطن میں پریشانیاں ہوں اور انسان آرام کی تلاش میں نکل پڑے۔ یعنی انسان اس وقت گھر سے نکل رہا ہو جب اس کے سامنے بہترین مستقبل ہو، یا انسان اس وقت وطن سے نکل رہا ہو۔ جب نانا کی قبر سے آواز آرہی ہو، حسینؑ مشیت تم کو خاک و خون میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ حسینؑ جاؤ سر کٹاؤ تاکہ میرا دین باقی رہ جائے۔ ایسے پیغام کے بعد جو کوئی وطن چھوڑ رہا ہو تو اس کے وطن چھوٹنے کا انداز دنیا کے عام غریب الوطن افراد سے یقیناً مختلف ہوگا۔ وہ کتنا نازک اور سنگین موقع تھا جب حسینؑ ۲۸ رجب کی رات دربار حاکم میں طلب کئے گئے۔ مسجد پیغمبرؐ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چاہنے والے ساتھ ہیں کہ ایک مرتبہ آنے والے نے ایک پیغام پہونچایا کہ آپ کو حاکم کے دربار میں طلب کیا گیا ہے۔ ساتھ بیٹھنے والے افراد نے کہا کہ یہ وقت کوئی دربار کا نہیں ہوتا ہے اِس وقت کیوں دربار میں طلب کیا گیا ہے؟ فرزند رسولؐ نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید شام کے حاکم نے انتقال کیا ہے اور حکومت تبدیل ہو گئی

ہے۔ مجھے اس مقصد کے لئے بُلایا گیا ہے کہ مجھ سے اپنی حکومت اور اقتدار کی موافقت حاصل کی جائے۔ مشورہ دینے والوں نے کہا کہ ایسے موقع پر مناسب نہیں ہے کہ آپ دربار میں جائیں۔ بہتر یہ ہے کہ اگر خطرات زیادہ ہیں تو آپ وطن چھوڑ کے صحراؤں میں نکل جائیں۔ فرزند رسولؐ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا ہے، میں جاؤں گا اور ان کے مطالبہ کو سنوں گا، حق کا اعلان کروں گا، اس کے بعد حق کی راہ میں جو قربانی دینا پڑے گی اس قربانی کے لئے تیار ہوں۔

بس اربابِ عزا چند لمحوں سے زیادہ اور نہیں گذارش کروں گا۔ فرزند رسولؐ گھر میں آئے اور آکے بہن سے بیان کیا۔ میں مسجد میں تھا، حاکم کے کامیابی کے طریقے انسانوں کو بتائے۔ اس کے بعد اپنے عمل کے ذریعہ انسانیت کے قافلہ کو اس راستہ پر لے کر چلے جو کامیابی کا راستہ ہے۔ اگر انسان اسی راستہ پر چلتا رہتا تو یقیناً کامیاب ہو جاتا۔ اس راستہ کو باقی رکھنا، اس راستہ پر چلتے رہنا اور اس راستہ پر چلنے کی عالم انسانیت کو دعوت دینا، یہی نبیؐ اور آلِ نبیؐ کا کارنامہ تھا کہ پیغمبرؐ جس پیغام کو لائے ہیں یہ پیغامِ فلاح و کامیابی ضائع اور برباد نہ ہونے پائے۔ اسی پیغام کو عام کرنے کے لئے اور عالم انسانیت کو اسی منزلِ فلاح سے آشنا بنانے کے لئے جب فرزندِ رسولؐ نے دیکھا کہ دنیا اس راستہ سے ہٹ کے گمراہ ہوئی جا رہی ہے اور ناکامی کے راستہ پر چلی جا رہی ہے کہ قرآن کہہ رہا تھا کافر کامیاب نہیں ہے اور یہ کفر کے راستہ پر جا رہے ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ ظالم کامیاب نہیں ہیں اور یہ ظلم کے راستہ پر جا رہے ہیں۔ قرآن کا کہنا ہے کہ مجرم کامیاب نہیں ہے اور یہ جُرم کے راستوں پر جا رہے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ افترا پرداز کامیاب نہیں ہے اور یہ نبی اور خدا کے خلاف افترا پردازی کر رہے ہیں۔ جب حسینؑ نے دیکھا کہ دنیائے انسانیت، دنیائے اسلام ناکامی کے راستہ پر جا رہی ہے تو حسینؑ آگے بڑھے کہ میں ہر طرح کی قربانی دے سکتا ہوں مگر کامیابی کی راہوں کو واضح کئے بغیر نہیں رہ سکتا میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو پھر اس راستہ پر لانا چاہتا ہوں جس راستہ پر میرے نانا لگا کے گئے تھے۔ چنانچہ امام حسینؑ تیار ہو گئے اور وہ تاریخ آگئی جب فرزند رسولؐ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ اس درد کو

دنیا کا ہر انسان محسوس نہیں کر سکتا لیکن کسی نہ کسی مقدار میں اس درد کا اندازہ ہر غریب الوطن انسان کو ہوتا ہے۔ میرے سامنے جو مجمع ہے ان میں تقریباً سب ہی غریب الوطن ہیں، سب ہی اپنا وطن چھوڑ کے آئے ہیں۔ مگر عزیزو! بڑا فرق ہے۔ وطن میں حاکم نے انتقال کیا ہے اور مجھے بلایا گیا ہے مجھ سے بیعت طلب کرنے کے لئے۔ کہا بھیّا پھر کیا ارادہ ہے؟۔ کہا میں نے وعدہ کیا ہے میں دربار میں ضرور جاؤں گا تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ بس یہ سُننا تھا کہ بہن نے کہا بھیّا اگر آپ نے یہ طے کر لیا ہے کہ دربار میں جائیں گے تو میں آپ کو منع تو نہیں کر سکتی مگر ماں جائے میں آپ کو تنہا بھی نہ جانے دوں گی۔ میں ظالم کے دربار میں آپ کو اکیلے نہ جانے دوں گی۔

آواز دی عباسؑ! آقا دربار میں جا رہے ہیں۔ علی اکبرؑ! بابا دربار میں جا رہے ہیں۔ بنی ہاشم کے شیرو! مولا دربار میں جا رہے ہیں، جاؤ مولاؑ کے ساتھ جاؤ۔

بنی ہاشم کے شیر تیار ہوئے۔ اسلحے سجنے کے بعد اب مولاؑ کے ساتھ آئے۔

روایت کہتی ہے کہ تیس ہاشمی شیر مولاؑ کو اپنے حلقہ میں لئے ہوئے چلے۔ ہاں جس بہن نے یہ منظر دیکھا ہو کہ مدینۂ پیغمبرؐ میں فقط دربار تک جانے کا موقعہ آیا تھا تو میرے بھیّا کے گرد تیس ہاشمی شیر حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ وہی بہن جب عصر کے ہنگام دیکھے گی کہ ماں جایا اس عالم میں تیروں اور تلواروں کے درمیان جا رہا ہے کہ:

نہ لشکر ہے نہ سپاہ ہے نہ کثرت الناس ہے
نہ قاسم ہے نہ علی اکبر ہے نہ عباس ہے

حسینؑ چلے۔ دارالامارہ کے دروازے کے قریب پہنچے۔ چاہنے والوں سے، ہاشمی شیروں سے فرمایا، تم دربار میں نہ جانا میں دربار میں جاتا ہوں تم ٹھہر جاؤ میں جا کے صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں۔ ہاں اگر میری آواز بلند ہو جائے تو پھر کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ دربار میں آ جانا۔ مولاؑ دربار میں آئے، خبر وفات سُنائی گئی۔ مولاؑ کے سامنے بیعت کا تقاضہ رکھا گیا۔

فرمایا اتنے اہم مسائل رات کی تاریکی میں طے نہیں ہوتے۔ صبح کو دربار آراستہ ہو جائے تو مجھے طلب کر لینا تاکہ میں لوگوں کے سامنے یہ واضح کر سکوں کہ کون بیعت طلب کرنے کے قابل ہے اور کون بیعت کرے گا۔

حاکم نے کہا بے شک آپ کا بیان بالکل صحیح ہے آپ تشریف لے جائیں۔ یہ فیصلہ کل ہو گا۔ مگر پاس بیٹھے ہوئے مروان نے کہا، ولید! اگر حسینؑ اس وقت بچ کے نکل گئے تو اس وقت تک دوبارہ تیرے قبضہ میں نہ آئیں گے جب تک مدینہ میں خون کی ندیاں نہ بہہ جائیں۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی حسینؑ کا سر قلم کر لے۔ یہ بیعت کریں یا گلا کاٹ دیا جائے۔ بس یہ سننا تھا کہ حیدر کرار کے شیر کو جلال آ گیا۔ فرمایا "أَتُهَدِّدُنِي بِالْقَتْلِ يَا ابْنَ الزَّرْقَاءِ" او زن نیلگوں چشم کے بچے! تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے۔ کون مجھے قتل کرے گا۔

حسینؑ کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ ایک مرتبہ دارالامارہ کا دروازہ کھلا۔ ہاشمی شیر دارالامارہ میں آ گئے۔ کس نے مولانا کی شان میں گستاخی کی ہے۔ آگے آگے عباس علمدار۔ مولاؑ نے قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بھیّا ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ یہ تلوار چلانے کا وقت نہیں ہے۔

بس عزیزو، بیان تمام ہو رہا ہے۔ بنی ہاشم کے شیر اپنے حلقہ میں لئے ہوئے مولاؑ کو بیت الشرف تک واپس لائے۔ اب جو گھر میں قدم رکھا تو بہن نے بڑھ کر گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ بھیّا خیر تو ہے؟ کیا گذری؟ امام حسینؑ نے روداد بیان کی اور فرمایا کہ بہن اب یہ مدینہ رہنے کے قابل نہیں ہے، اب یہ وطن چھوڑنا ہوگا، بہن سفر کی تیاری کرو۔

لو عزیزو! بہن نے سامان سفر تیار کرنا شروع کر دیا۔ حسینؑ نے کہا میں جاتا ہوں نانا کی قبر سے رخصت ہونے کے لئے۔ میں جاتا ہوں مادر گرامی کو آخری سلام کرنے کے لئے۔ پہلے آئے نانا کی قبر کے سرہانے بیٹھ گئے۔ قبر سے لپٹ کے روتے رہے۔ ایک مرتبہ آنکھ لگ گئی تو دیکھا کہ جیسے قبر کھلی اور پیغمبرؐ سامنے آ گئے۔ بیٹا خیر تو ہے؟ حسینؑ یہ تمہارا کیا عالم ہے؟ کہا نانا اب مدینہ رہنے کے قابل نہیں رہ گیا ہے۔ اب

مجھے بہت ستایا جا رہا ہے۔ نانا کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ مجھے اپنے پاس بُلا لیں۔ فرمایا بیٹا اگر تم یہاں آجاؤ گے تو کربلا کون جائے گا۔ حسینؑ کربلا جاؤ سر کٹاؤ تاکہ میرا دین زندہ رہ جائے۔ اور حسینؑ یاد رکھنا اکیلے نہ جانا۔ عورتوں اور بچّوں کو ساتھ لے کر جانا۔ نانا کی قبر سے اٹھے۔ سلام آخر کیا۔ اب ماں کی لحد کے سرہانے آکے بیٹھ گئے۔ ہائے حسینؑ اس ماں کی قبر کے پاس آئے ہیں جس کے جنازہ کے قریب کھڑے ہو کر حسینؑ نے فقط اتنا کہہ دیا تھا کہ اماں ہم آپ کے بعد یتیم ہو گئے تو بند کفن ٹوٹ گئے۔ ماں نے بچّے کو گلے سے لگا لیا۔ آج وہی حسینؑ آکے آواز دے رہے ہیں۔ مادر گرامی! اپنے حسینؑ کا آخری سلام لے لیجیے، اب میں مدینہ چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر حسینؑ چلنا چاہتے ہیں کہ قبر سے آواز آئی "عَلَيْكَ السَّلَامُ يَا غَرِيْبَ الْاُمّ" اے ماں کے غریب و مظلوم مسافر حسینؑ! ماں کا سلام بھی لیتا جا اور حسینؑ تم اکیلے نہ جاؤ گے۔ یہ ماں تمھارے ساتھ رہے گی۔ جہاں جہاں حسینؑ وہاں وہاں فاطمہؑ۔ عاشور کی رات جب مقتل میں آئے تو چاہنے والے کے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ کہا مولاؑ! یہ کون بی بی ہے جو رو رہی ہے؟ فرمایا تمھیں نہیں معلوم۔ یہ اماں فاطمہ زہراؑ ہیں جب سے میں نے مدینہ چھوڑا ہے ماں اپنے لال کو جُدا نہیں کر سکی ہے اور سوچو جس کا گھر اُجڑ رہا ہو وہ فریاد نہ کرے گی تو کیا قبر میں چین سے آرام کرے گی۔ واحسیناہ واحسیناؑہ، وامحمّداہ وامحمّداہ۔

سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۲

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاۗءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیّٖنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ
بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَاۗئِھِمْ
اَجْمَعِیْنَ ○ اَمَّا بَعْدُ!

حقیقی صاحبانِ ایمان وہ ہیں جو اس رسولؐ، نبیؐ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ وہ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور بُرائیوں سے روکتا ہے۔ طیّبات کو حلال قرار دیتا ہے، خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ عالم انسانیت کے سروں سے اس بوجھ کو اُٹھا لیتا ہے جس کے نیچے انسانیت دبی ہوئی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ دیتا ہے جن میں انسانیت گرفتار ہے۔ پس وہ لوگ جو ایسے پیغمبرؐ پر ایمان لائے، جنھوں نے پیغمبرؐ کا احترام کیا اور پیغمبرؐ کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جو کامیاب کہے جانے کے قابل ہیں۔

قرآن حکیم کی اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں آغاز عشرۂ محرم کے ساتھ جس سلسلۂ مجالس کا آغاز ہوا ہے اس کے دوسرے مرحلہ پر آج کچھ باتیں اس رسول اکرمؐ سے متعلق گذارش کرنا ہیں جس کو اس رسالتِ الٰہیہ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اس کے پہلے تمہیدی مجالس میں آپ کے سامنے یہ بات گذارش کی جا چکی ہے کہ وہ پیغام جو سرکار دوعالمؐ، عالمِ انسانیت کی فلاح و کامیابی کے لئے لے کر آئے تھے وہ پیغام ہر اعتبار سے جامع اور

ہمہ گیر تھا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کا علاج اس پیغام میں نہ کیا گیا ہو اور زندگی کا کوئی رُخ ایسا نہیں ہے جس کی طرف اس پیغام میں توجہ نہ دی گئی ہو۔ اس پیغام کا تعارف سرکار دو عالمؐ نے پیغام فلاح کے نام سے کرایا ہے "قُولُوا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ تُفْلِحُوا" لا الہ الا اللہ کہو اسی میں تمہاری فلاح اور تمہاری کامیابی ہے۔

قرآن مجید نے اس فلاح اور کامیابی کے تفصیلات بیان کرتے ہوئے تین طرح کے افراد کی نشاندہی کی، اُن لوگوں کا بھی پتہ بتایا جن کے مقدر میں کامیابی نہیں ہے۔ اس راستہ کی بھی نشاندہی کی ہے جس راستہ پر چلنے کے بعد انسانی زندگی کامیاب ہو سکتی ہے اور ان لوگوں کا بھی پتہ بتایا ہے جو واقعاً کامیاب ہیں اس لئے کہ انھوں نے اس طریقۂ حیات کو اختیار کر لیا ہے، جو طریقۂ حیات انسان کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔

آج اس گفتگو کے دوسرے مرحلہ پر جو باتیں آپ کے سامنے گذارش کرنا ہیں ان کا خلاصہ تین عنوانات کے تحت آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ پیغمبر جس کو ایسی رسالت الٰہیہ اور ایسے پیغام کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اس پیغمبرؐ کی شان کیا تھی، اس پیغمبرؐ کی عظمت کیا تھی اور ایسے پیغام کے لئے واقعاً جس کو پیغامبر ہونا چاہیئے تھا سرکار دو عالم میں واقعاً وہ صفات اور کمالات پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ قرآن حکیم کی آیات کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے گا۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر پیغمبر اسلامؐ کو مالک کائنات نے ان تمام صفات اور کمالات کا حامل بنا کر دنیا میں بھیجا ہے جو صفات اور کمالات ایسے پیغام الٰہی کے لئے ضروری تھے تو وہ لوگ جن کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں، اس پیغمبر کے مقابلہ میں ان کے فرائض کیا ہیں، یہ گفتگو کا دوسرا مرحلہ ہے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ وہ اُمتیں جن کی طرف کوئی پیغمبر بھیجا گیا ہے یا وہ اُمت جنکی طرف پیغمبرؐ عربی کو بھیجا گیا ہے اس اُمت کا برتاؤ پیغمبرؐ کے ساتھ کیا رہا۔ سابق اُمتوں کا برتاؤ اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا رہا، تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اللہ کے پیغام اور

کی نجات کے لئے کیسی زحمتیں برداشت کرتے رہے اور اس نافہم دنیا نے ان پیغمبروںؑ کی زحمتوں کی کیسی ناقدری کی ہے۔

یہ میری گفتگو کے تین مراحل ہیں جو میں آپ کے سامنے گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ساری تفصیلات کے عرض کرنے کا موقع نہیں ہے، لیکن ایک اجمالی خاکہ اگر آپ کے ذہن میں رہے گا تو عظمتِ پیغمبرؐ کا بھی اندازہ ہوگا اور اُمّت کے فرائض کا بھی احساس پیدا ہوگا اور اُمّت کی ناقدری کا بھی اندازہ کیا جاسکے گا۔

جہاں تک پیغمبرِ اسلامؐ کی عظمت کا تعلق ہے، مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کی عظمت کا تعارف تین اعتبار سے کرایا ہے۔ یہ میرے سارے مطالعات کا خلاصہ ہے جو میں آپ کے سامنے اجمالی طور سے گذارش کر رہا ہوں۔

مالکِ کائنات نے اپنے پیغمبرؐ کا تعارف تین اعتبارات سے کرایا ہے:

ایک اعتبار پیغمبرؐ کے مزاج کا ہے۔

دوسرا اعتبار پیغمبرؐ کی ہمہ گیر شخصیت کا ہے۔

اور تیسرا اعتبار پیغمبرؐ کی قوت اور طاقت کا ہے۔

اگر پیغمبرؐ کے مزاج کو پہچاننا چاہتے ہو تو اس کا تذکرہ بھی قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اگر پیغمبرؐ کی شخصیت کی عظمتوں کو جاننا چاہتے ہو تو اس کا تعارف بھی قرآن مجید میں کرایا گیا ہے۔ اگر پیغمبرؐ کی طاقت کو محسوس کرنا چاہتے ہو تو قرآن مجید میں اس کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کے مزاج اور پیغمبرؐ کی رسالت کے مزاج کا تعارف قرآن حکیم نے ایک لفظ میں کرایا ہے "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ" اے پیغمبرؐ! ہم نے آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پیغمبرؐ کی شریعت میں سوائے رحمت کے کچھ نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کے قانون میں سوائے رحمت کے کچھ نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کے مزاج میں سوائے رحم اور مہربانی کے کچھ نہیں ہے۔ اگر تمھیں شریعت کے قوانین میں سختیاں نظر آتی ہیں یا تمھیں پیغمبرؐ کا کوئی برتاؤ نامناسب دکھائی دیتا ہے تو وہ تمھاری سمجھ کی کمزوری ہے،

پیغمبرؐ کے مزاج کی کمزوری نہیں ہے۔ وہ تمہارے ادراک کی کمزوری ہے، پیغمبرؐ کے قانون کی کمزوری نہیں ہے۔ اگر پیغمبرؐ دنیا کو زندگی کا سبق دیتا ہے تو یہ بھی رحمتِ الٰہیہ کا ایک نمونہ ہے۔ اگر میدان میں جاکر گلا کٹا دینے کا حکم دیتا ہے تو یہ بھی رحمت الٰہیہ کا ایک مرقع ہے۔ پیغمبرؐ اگر کسی محفل میں آنے والے کے لئے سراپا کھڑا ہو جاتا ہے تو یہ بھی ایک رحمتِ پروردگار ہے۔ اور اگر کسی کو اپنی مجلس سے اٹھا دیتا ہے تو یہ بھی ایک رحمتِ الٰہی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے قانون میں سوائے رحمت اور مہربانی کے کچھ نہیں ہے۔ سرکارِ دو عالمؐ کی اپنی حیات اور حضورؐ کا قانون وہ ہے جسے مالک کائنات نے سراپا رحمت قرار دیا ہے۔ اسی لئے پروردگار عالم نے یہ اعلان نہیں کیا ہے "وَمَا خَلَقْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ" ہم نے آپ کو رحمت بنا کر پیدا کیا ہے۔ اگر یہ کہہ دیا ہوتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ خلقتِ پیغمبرؐ رحمت ہے۔

مالک نے فرمایا ہے "وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ" ہم نے آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی آپ کا وجود تو رحمت تھا ہی، آپ کی حیات تو رحمت تھی ہی۔ آپ کا پورا پیغام بھی رحمت ہے، اور رحمت بھی کسی ایک عالم کے لئے نہیں بلکہ عالمین کے لئے رحمت ہے۔

اب اگر شریعتِ پیغمبرؐ کا تعلق زمین سے ہوتا تو رسالت اہلِ زمین کے لئے رحمت ہوتی۔ اگر شریعت کا تعلق آسمان سے ہوتا تو قانون آسمان والوں کے لئے رحمت ہوتا۔ مگر شریعتِ پیغمبرؐ کا تعلق عالمین سے ہے لہٰذا اللہ نے پیغمبرؐ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اور اگر عزیزانِ محترم آپ میں قرآن فہمی کا ذوق پایا جاتا ہے تو میں ایک جملہ گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ فرق پہچانیں۔ "وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ" پیغمبرؐ! ہم نے آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنایا ہے، ہم نے آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ نبیؐ سے عالمین کا رشتہ کیا ہے؟ نبیؐ رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں عالمین کے لئے۔ "لِلْعَالَمِیْنَ" عالمین کے لئے۔ یاد رکھئے، کسی کے لئے رحمت ہونا اور ہے اور کسی کے ذریعہ رحمت ہونا اور ہے

اس فرق کو آپ محسوس کریں گے ابھی آپ کے سامنے ایک چھوٹی سی مثال گذارش کروں گا اپنے بچّوں کے سمجھنے کے لئے۔ تو مالک کائنات نے حضورؐ کو بھیجا تو عالمین کے لئے رحمت بنا کر۔ عالمین کے لئے رحمت ہونے کے معنی نہیں ہیں کہ حضورؐ کو عالمین میں بھیجا جائے کہ ایک ہفتہ زمین پر رہیں، ایک ہفتہ آسمان پر رہیں، ایک مہینہ اس عالم میں رہیں، ایک مہینہ اُس عالم میں رہیں۔ نہیں اگر ایسا ہوتا تو خدا نے یہ کہا ہوتا کہ ہم نے عالمین میں آپ کو بھیجا ہے، مگر مالک کا اعلان ہے ہم نے عالمین کے لئے بھیجا ہے۔ کسی کے لئے ہونا اور ہے اور کسی میں ہونا اور ہے۔ اب کہاں بھیجا "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ" وہ خدا وہ ہے جس نے مکّہ والوں میں ایک رسول بھیجا ہے۔ تو جب مکّہ والوں کا ذکر آیا تو کہا کہ مکّہ والوں میں بھیجا ہے، اور جب عالمین کا ذکر آیا تو کہا کہ عالمین کے لئے بھیجا ہے۔ تو جن کے درمیان بھیجا ہے وہ اور ہیں اور جن کے لئے بھیجا ہے وہ اور ہیں۔ کل شاید یہ بات نہ سمجھی جا سکتی ہو لیکن آج اس بات کا سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ میری مجلس چودہ برس سے اس زمین کے اوپر، اس ملک میں، اس شہر میں، اس علاقہ میں، اس مجمع کے سامنے ہو رہی ہے۔ تو جن کے درمیان میں پڑھ رہا ہوں وہ مومنین وہی ہیں جو ابوظبی میں رہتے ہیں۔ جس جگہ پر میں پڑھ رہا ہوں وہ مرکز حسینی کی زمین ہے۔ جس شہر میں پڑھ رہا ہوں وہ ابوظبی ہے۔ لیکن جن کے لئے پڑھ رہا ہوں وہ یہ نہیں ہیں۔ میری نگاہ میں سارے وہ افراد ہیں جہاں یہ کیسٹ جانے والا ہے۔ جہاں یہ خبریں جانے والی ہیں۔ جہاں چھپ کے یہ مجلسیں جانے والی ہیں۔ جہاں یہ پیغام جانے والا ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ کوئی بات میں کہہ رہا ہوں شاید وہ آپ کے لیے مناسب نہ ہو، آپ کے مزاج کے مناسب نہ ہو، آپ اسے غیر ضروری سمجھتے ہوں لیکن جہاں جہاں یہ پیغام جانے والا ہے میں اس ضرورت کو پہچانتا ہوں۔ میں اس ماحول کو جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے درمیان خطاب کر رہا ہوں، لیکن خود شہر کے اندر نہ جانے کہاں کہاں یہ آواز جا رہی ہو۔ تو جن کے درمیان

تقریر ہو رہی ہے وہ اور ہیں اور جن کے لئے تقریر ہو رہی ہے وہ اور ہیں۔ اس لئے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مومنین کے مزاج پر باتیں بار ہو جاتی ہیں کہ آدھی بات کہی اور آدھی بات چھوڑ دی، اگر ذرا اسے واضح کر دیا ہوتا تو اور لطف آجاتا۔ یقیناً ایسا ہوتا اگر وہ بات آپ کے لئے ہوتی۔ لیکن یہ بات تو آپ کے درمیان کہی جا رہی ہے مگر آپ کے لئے نہیں کہی جا رہی ہے۔ ان کے واسطے بھی کچھ باتیں کہی جاتی ہیں جو آدھی ہی سمجھنے کے لائق ہیں، پوری بات سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔

تو عزیزانِ محترم جن کے درمیان گفتگو ہوتی ہے وہ بھی ایک ماحول ہوتا ہے اور جن کے لئے گفتگو ہوتی ہے وہ افراد بھی اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ مالک نے کہا میں نے بھیجا تو مکّہ والوں میں، مگر خبردار یہ نہ سمجھ لینا کہ مکّہ والوں کے لئے بھیجا ہے۔ اگر مکّہ والوں کے لئے بھیجنا ہوتا تو کوئی چھوٹا پڑھا لکھا بھی کافی ہو جاتا۔

میں نے ایک لفظ کہا آپ نے اس کے معنی پر غور نہیں کیا حضور سرورِ کائناتؐ جس دور میں آئے ہیں اس دور میں عربستان کے علم و فضل و کمال کا عالم یہ تھا کہ پورے مکّہ میں فقط ۱۷ سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اور مدینہ میں ۱۱ گیارہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آج دنیا میں آپ کوئی ایسا بد سے بدتر دیہات بھی ڈھونڈھ کے نہیں نکال سکتے جہاں تعلیم کا اوسط اتنا گرا ہوا ہو۔ ہیں دنیا میں ایسے دیہات بھی جہاں تعلیم نہیں پہونچی ہے، جہاں کے لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں۔ لیکن جہاں ایک چھوٹا سا پرائمری اسکول بھی قائم ہو گیا ہے وہاں سو پچاس تو پڑھنے لکھنے والے بہرحال مل جائیں گے۔ لیکن سرکار دو عالم جس دور میں آئے ہیں اُس دور میں علم و فضل و کمال کا کُل معیار یہ تھا کہ سولہ سترہ آدمی اِدھر۔ گیارہ بارہ آدمی اُدھر۔ کل اتنے پڑھے لکھے افراد۔ اگر وہ بھی پڑھے لکھے ہیں تو کوئی بڑی کتابوں کے پڑھے لکھے نہیں ہیں، بلکہ وہ افراد ہیں جو کچھ پڑھنا جانتے ہیں، کچھ لکھنا جانتے ہیں۔ غور کیا آپ نے ؟ تو اگر اللہ نے اس پیغمبرؐ کو ان ہی کے لئے بھیجا ہوتا تو ان کے درمیان تو میں آج کی زبان میں اگر کہوں تو ایک مڈل پاس آدمی بھی کافی ہوتا، ایک ہائی اسکول پاس آدمی بھی کافی ہوتا۔

اس لئے کہ بہر حال ان سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہوتا اور ان پر اپنی شخصیت کا رُعب قائم کر سکتا تھا، اس لئے کہ یہ کچھ نہیں جانتے وہ کچھ تو جانتا ہے۔ مگر سوچئے آپ ایسے ماحول میں جہاں گنے ہوئے افراد اور پورے علاقہ میں بلا کے کُل اٹھائیس انتیس افراد کچھ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں ان کے درمیان اتنے بڑے انسان کو بھیجا جائے جس کے پاس زمین کا علم ہو، آسمان کا علم ہو، دنیا کا علم ہو، آخرت کا علم ہو جس کے سینہ میں پوری کتاب سما گئی ہو جس کے بارے میں اعلان ہوتا ہے کہ خشک و تر کائنات کا کچھ نہیں ہے جو اس میں نہ ہو۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں جب مدرسے قائم کئے جاتے ہیں۔ چاہے دینی ہوں چاہے دنیوی تو پرائمری اسکول کو اگر کوئی ٹیچر درکار ہوتا ہے تو پی ایچ ڈی نہیں تلاش کیا جاتا بلکہ اگر کوئی مڈل پاس ہوتا ہے تو اسی کو بٹھا دیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی نے کہا کہ بھائی یہ تو مڈل پاس ہیں تو جواب یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے بھی تو پرائمری اسکول کے طالب علم ہیں، ان کے واسطے یہی کافی ہیں۔ جب مڈل والے کو پڑھانا ہوگا تو ہم انٹرمیڈیٹ تلاش کریں گے۔ جب ان کو پڑھانا ہوگا تو کوئی بی۔ اے، ایم۔ اے تلاش کریں گے۔ جب یونیورسٹی کا کلاس پڑھانا ہوگا تو کوئی پوسٹ گریجویٹ، کوئی ڈاکٹر تلاش کریں گے۔ جیسے پڑھنے والے ہوں اس سے کچھ اونچا پڑھانے والا چاہیئے۔ جیسے سمجھنے والے ہوں اس سے کچھ اونچا سمجھانے والا چاہیئے۔ یہ یکبارگی زمین و آسمان کی نسبت کہ پڑھنے والے اتنے جاہل کہ جہاں کوئی کچھ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اور پڑھانے والا اتنا بڑا عالم۔ کم سے کم وہی فریاد کرتا۔ کبھی کبھی یہ پریشانی میرے سامنے آجاتی ہیں کہ کسی مومن کو مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربانی کا شوق پیدا ہوگیا تو کہا کہ مولانا اگر آپ میرے بچّے کو الف۔ ب پڑھا دیتے تو پہلے ہی دن قابل ہو جاتا۔

ارے آپ پڑھے لکھے ہیں اگر آپ آئیں تو شاید مجھے بھی کچھ اطمینان ہو کہ آپ کچھ بات سمجھیں گے۔ یہ بچہ جو الف ب پڑھنے والا ہے اسے میں کیا پڑھاؤں گا؟ کہا کہ اتنے پڑھے لکھے ہو کے ایک کتاب نہیں پڑھا سکتے۔ آپ سے اچھے تو وہی مولوی صاحب

ہیں جو مکتب میں بیٹھ کے بچّوں کو پڑھا دیتے ہیں۔ میں نے کہا بے شک اس اعتبار سے مجھ سے اچھے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی سطح، ان کی سطح سے ملتی ہوئی ہے وہ اِن کی باتیں سمجھ سکتے ہیں، وہ اُن کی باتیں سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن نہ میں ان کی بات سمجھ سکتا ہوں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور نہ میں اپنی بات سمجھا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ فاصلہ اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ میں اسے اپنی توہین قرار دیتا ہوں کہ کوئی مجھے لے جا کے مکتب میں بٹھا دے کہ آپ بچّوں کو الف ب پڑھائیں۔ میں فریاد کروں گا کہ اگر کوئی اور سزا ہو تو وہ دید بجئے مگر یہ سزا نہیں۔ مگر اتنے بڑے علم والا پیغمبرؐ اور ایسے جاہلوں کو پڑھانے کے لئے بھیجدیا گیا۔ کم سے کم وہی پروردگار سے فریاد کرتا کہ میرے معبود! میں تو تیرا محبوب ہوں، محبوب کو اپنی بارگاہ سے جُدا کر دیا یہی کیا کم تھا اس کے بعد ان کے لئے بھیجا ہے جو کچھ سمجھنا ہی نہیں جانتے ہیں۔ کچھ پڑھنا ہی نہیں جانتے ہیں۔ قدرت نے آواز دی۔ نہیں میرے پیغمبرؐ تمھیں ان کے درمیان بھیجا ہے ان کے لئے نہیں بھیجا ہے۔ ان کے درمیان بھیجا ہے کہ کام یہاں سے شروع ہو اور دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ جو جانوروں کو انسان بنا سکتا ہے وہ انسانوں کو مسلمان کیوں نہیں بنا سکتا ہے؟

اب بات آگئی ہے تو فقط مناسبت کی بنیاد پر ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں آپ برابر سنتے رہتے ہیں اور میں ایسی باتوں کو دوہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن آپ محسوس کریں کہ جن کے درمیان بھیجا ہے وہ اور افراد ہیں، اور جن کے لئے بھیجا ہے وہ یہ افراد نہیں۔ یہ وہ عالمین ہیں جن کے واسطے پیغمبرؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ پیغمبرؐ کو اتنے کمالات سے آراستہ کیا جاتا کہ زمین و آسمان یا کوئی عالَم ہو۔ کسی عالَم کی رہنے والی مخلوق ہو۔ کسی عالَم میں بسنے والے افراد ہوں۔ وہ جس مرحلۂ کمال تک جا سکتے ہوں پیغمبرؐ کے پاس اس سے زیادہ کمالات ہوں ورنہ کل کسی عالَم میں کوئی پیدا ہونے والا صاحب کمال چیلنج کر دے گا کہ ان کو میرا مصلح بنایا گیا ہے ان سے زیادہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ ان کو ہماری اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے، ان سے زیادہ کمال تو ہمارے پاس پایا جاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ چاہے وہ چودہ

صدی پہلے آیا ہو یا اگلی دنیا سے چودہ ہزار سال پہلے آیا ہو۔ لیکن اتنے کمالات اس کے پاس ہوں کہ کسی دورِ انسانیت کا کوئی انسان، کسی عالم کا بسنے والا کوئی انسان اپنے علم و فضل و کمال میں اس سے آگے نہ جانے پائے تاکہ وہ سب محتاج رہیں اور یہ مصلح رہے۔ وہ سب محتاج ہدایت رہیں اور یہ ہدایت کرنے والا رہے۔ شاید یہ بھی اک رازِ پروردگار تھا ورنہ اس دور کے انسانوں کو قائل کرنے کے لئے جہاں آخری رفتار بارہ میل فی گھنٹہ ہو۔ فی گھنٹہ تو میں نے کہہ کر اس دور کی عظمت کو بڑھا دیا ورنہ پُرانے زمانے میں جو فاصلے شمار کئے جاتے تھے تو بارہ میل روزانہ کا حساب تھا اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ نماز قصر کب ہوگی۔ جب دو دن کا فاصلہ طے ہو جائے گا۔ دو دن کے فاصلے سے مراد کیا ہے؟ پُرانے چوبیس میل۔ جس کو آج ۴۴ کلومیٹر کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں کہ ایک آدمی بہت سے بہت جائے گا تو بارہ میل۔ تو جس دَور میں ایک آدمی کے چلنے کی آخری مقدار کل بارہ میل ہو یا تیز سے تیز رفتار کوئی سواری ہوگی تو ایک گھنٹہ میں کوئی بارہ میل چلا جائے گا۔ اُس دور میں اگر کوئی اتنا بڑا کمال دکھلا دے کہ ایک گھنٹہ میں سو میل چلا جائے تو اُس دَور کے انسان کو قائل کرنے کے لئے کافی ہے۔

توجہ نہیں کی آپ نے ....

اس دور کے انسان کے لئے یہی معجزہ تھا کہ کوئی آدمی ایک گھنٹہ میں سو میل چلا جائے تو اگر پیغمبر اسلامؐ کی رسالت اسی دَور کے لئے ہوتی تو پیغمبرؐ کہتے کہ کل رات میں سَو میل گیا تھا اور اتنا کام بھی معجزہ بننے کے لئے کافی تھا، اس لئے کہ اسے بھی کوئی چیلنج کرنے والا نہ تھا۔ مگر کہاں سَو میل، کہاں دو سو میل، کہاں ہزار میل کہاں گھنٹوں کا حساب۔ بیان کرنے والا یہ بیان کر رہا ہے کہ میں چند لمحوں میں یہاں سے اٹھا مسجد اقصیٰ تک گیا۔ مسجد اقصیٰ سے اٹھا آسمانوں کو طے کیا۔ آسمانوں کو طے کرنے کے بعد عرش پروردگار تک گیا اور جب پلٹ کے آیا تو بستر ویسے ہی گرم تھا۔ اتنے بڑے کمال کے اعلان کی ضرورت مکّہ والوں کو کیا تھی؟ اتنے بڑے کمال کا اعلان تو مکّہ والوں

کو انکار پر آمادہ کر سکتا تھا اقرار پر نہیں۔ آپ اہلِ نظر ہیں میری بات کی قیمت پہچانیں گے اتنا بڑا اعلان مکّہ والوں کو انکار پر تو آمادہ کر سکتا تھا کہ یہ بات عقل میں آنے والی ہی نہیں، یہ تو کوئی جنون آمیز گفتگو معلوم ہوتی ہے۔ اس سے کوئی اعجاز کا قائل نہیں ہو جائے گا، اس سے تو انکار کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے مگر پیغمبرؐ اتنے بڑے کمال کا اعلان کر رہے ہیں۔ خدایا اس قوم کے لئے آنے والے پیغمبرؐ کو اتنا بڑا کمال دینے کی کیا ضرورت تھی؟ قدرت آواز دے گی بے شک میں نے مکّہ والوں میں بھیجا ہے مگر مکّہ والوں کے لئے نہیں بھیجا ہے۔ اگر کل یہ دنیا آگے بڑھ گئی اور لوگ لمحوں میں، منٹوں میں ہزاروں میل کے فاصلے طے کرنے لگے تو انھیں یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ان کی رسالت ہمارے کام آنے والی نہیں ہے۔ وہ بہت پیچھے رہ گئے ہیں ہم بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

قدرت نے آواز دی جتنا بھی عالم انسانیت آگے بڑھتا جائے گا یہ عالم ترقی کر کے معراجِ پیغمبرؐ کو نہیں پا سکتا ہے۔ اُس دور میں اتنی بڑی سُرعت رفتار کا اظہار اس بات کی علامت ہے کہ مکہ میں آئے تھے مگر مکّہ والوں کے لئے نہیں آئے تھے۔

یہ ہے سرکار دو عالمؐ کے قانون کا مزاج۔ تو گویا حضورؐ کا مزاج، مزاج رحمت ہے۔ رسالت کا مزاج، مزاج رحمت ہے، جہاں سوائے مہربانی اور رحمت کے کچھ نہیں ہے۔ تو یہیں سے آپ خود پہچان لیں گے کہ جس کے قانون کا مزاج رحمت ہو، جس کا اپنا مزاج رحمت ہو، جس کی شریعت کا مزاج رحمت ہو، جہاں رحمت ہی رحمت ہو، وہاں تازیانوں کا گذر کہاں ہے۔ وہاں دُرّوں کا گذر کہاں ہے۔ وہاں ایسی تلواروں کا گذر کہاں ہے جہاں مہربانی کا کوئی شائبہ بھی نہ پایا جاتا ہو۔

اس کے بعد جب معبود نے اپنے حبیبؐ کے کمالات کا اعلان کیا تو ارشاد ہوا "یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا" اے میرے پیغمبرؐ! ہم نے آپ کو بھیجا تو شاہد بنا کر بھیجا۔ ساری کائنات کے اعمال کا گواہ بنا کر بھیجا۔ ہم نے ثواب کی بشارت دینے والا، عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ ہم نے آپ کو خدا کی طرف دعوت دینے والا بنا کر بھیجا۔

مگر اذنِ خدا سے۔ اس لفظ کی بلاغت کو پہچانیں۔ پیغمبرؐ بھی دعوت دینے والے ہیں دینِ خدا کی طرف، پروردگار کی طرف بُلانے والے ہیں مگر اذنِ خدا سے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں دعوت بھی اتنی عام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے وہ دعوت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ جس کا جی چاہے وہ خدا کی طرف دعوت دینے والا بن جائے۔ دینِ خدا میں دعوت الی اللہ بھی بلا اجازت نہیں ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی دیر تک اجازت رہے گی اتنی دیر تک دعوت دینے کا حق بھی رہے گا۔ اور جب خدا اپنی اجازت کو منسوخ کر دے گا تو دیا ہوا پیغام بھی واپس لے لیا جائے گا۔ کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اب تو ہم دعوت کے لئے نکل پڑے ہیں، اب تو ہم پیغام لے کر نکل پڑے ہیں، اب تو ہم آیتیں لے کر نکل پڑے ہیں، کوئی غلط کام تو نہیں کرنے جا رہے ہیں قرآن ہی تو پڑھنے جا رہے ہیں، دینِ خدا کی دعوت ہی تو دینے جا رہے ہیں۔ کہا نہیں، ہماری دعوت بھی "باذنہٖ" ہے۔ اذنِ خدا کے ساتھ ہے۔ جہاں تک خدا نے جانے کی اجازت دی وہاں تک آپ جا سکتے ہیں، اور جہاں خدا روک دے گا آپ کو واپس آنا پڑے گا۔ پھر جیسے اجازت ملے گی وہ آگے بڑھے گا۔

"وَسِرَاجًا مُّنِيرًا" اور ہم نے آپ کو روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔ جب اللہ نے اپنے حبیبؐ کو عالمین کے لئے شاہد بنایا، عالمین کے لئے گواہ بنایا۔ اُمّت کے سارے اعمال اور عالمین کے سارے اعمال کے نگراں ہیں سرکارِ دو عالمؐ۔ یہ مسئلہ فقط ایک اُمّت سے متعلق نہیں ہے۔ خود قرآن نے کہا ہے "كَيْفَ بِكَ اِذَا جِئْنَا" پیغمبرؐ! وہ دن کیا دن ہوگا جب ہم ہر اُمّت کو لائیں گے عرصۂ محشر میں، قیامت کے میدان میں اس کے گواہ کے ساتھ، یعنی اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ۔ اُمّتِ موسیٰؑ آئے گی جنابِ موسیٰؑ کے ساتھ۔ اُمّتِ عیسیٰؑ آئے گی جنابِ عیسیٰؑ کے ساتھ۔ اُمّتِ نوحؑ آئے گی جنابِ نوحؑ کے ساتھ۔ اُمّتِ ابراہیمؑ آئے گی جنابِ ابراہیمؑ کے ساتھ۔ ہم ہر اُمّت کو لائیں گے اس کے گواہ یعنی اس کے پیغمبر کے ساتھ۔ "وَجِئْنَا بِكَ عَلٰی

هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا" اور آپ کو ان سب کا گواہ بنا کر لائیں گے۔ یعنی جو اُمّتوں کے گواہ تھے وہ اب تک کے پیغمبر تھے، مگر آپ کو فقط اُمّتوں کا گواہ نہیں بنایا ہے بلکہ آپ سب اُمّتوں کے بھی گواہ ہیں اور ان کے گواہوں کے بھی گواہ ہیں۔

تو ہر نبی اپنی اُمّت کے اعمال دیکھ رہا ہے۔ ہر نبی اپنی اُمّت کے اعمال سے باخبر ہے۔ ہر نبی اپنی اُمّت کے اعمال کا گواہ ہے۔ جو روزِ قیامت آکر اُمّت کی اچھائی یا بُرائی کی گواہی دے گا اور سرکارِ دو عالمؐ آ کے سب کی گواہی دیں گے۔ تو عزیزانِ محترم یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ جناب ابراہیمؑ اپنی اُمّت کی گواہی دیں اس لئے کہ اُمّت نظر کے سامنے تھی۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ جناب نوحؑ اپنی اُمّت کے گواہ ہوں اس لئے کہ اُمّت نوحؑ کی نگاہ کے سامنے تھی۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ جناب موسیٰؑ اور جناب عیسیٰؑ اپنی قوموں کے گواہ ہوں اس لئے کہ قومیں انبیاء کی نگاہوں کے سامنے تھیں مگر سرکارِ دو عالمؐ کو سب کا گواہ بنا کر لایا جائے گا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

حضورؐ، ابراہیمؑ یا اُمّتِ ابراہیمؑ کی گواہی کیسے دیں گے؟ وہ پہلے یہ بعد میں۔

حضورؐ، نوحؑ یا اُمّتِ نوحؑ کے گواہ کیسے بنیں گے؟ وہ پہلے چلے گئے یہ بعد میں آئے۔

حضورؐ، جناب موسیٰؑ اور جناب عیسیٰؑ اور ان کی اُمّتوں کی گواہی کیسے دیں گے؟ وہ پہلے جانے والے ہیں یہ بعد میں آنے والے ہیں۔ بس جو موجود ہے وہ تو گواہی دے سکتا ہے، لیکن جو بعد میں پیدا ہونے والا ہے وہ اپنے پہلے والوں کے اعمال کی کس طرح گواہی دے گا۔

قرآن مجید نے کہا مگر ہم نے اپنے حبیبؐ کو ساری اُمّتوں کا گواہ بنایا ہے۔ سارے انبیاء کا گواہ بنایا ہے تاکہ میرے اس اعلان ہی سے اندازہ ہو جائے کہ تمہارے سامنے بعد میں آئے ہیں عالم میں بعد میں نہیں آئے ہیں۔

تم نے دیکھا کہ نوحؑ چلے گئے تو بعد میں پیغمبرؐ آئے مگر ہم جانتے ہیں کہ جیسے نوحؑ اپنی اُمّت کی نگرانی کر رہے تھے یہ نوحؑ کے سفینہ کی نگرانی کر رہے تھے۔

تم نے دیکھا کہ ابراہیمؑ چلے گئے تو یہ آئے مگر ہم جانتے ہیں کہ اُمّت کی نگرانی ابراہیمؑ کر رہے تھے اور ابراہیمؑ آگ میں جا رہے تھے تو یہ دیکھ رہے تھے۔

تم نے دیکھا کہ انبیاءؑ اپنی اُمّتوں کی نگرانی کر رہے ہیں مگر ہمیں خبر ہے کہ میرا پیغمبرؐ سارے اعمال کا نگراں ہے، ہم نے اسے شاہد بنا کر بھیجا ہے۔ تو اگر میرے حبیبؐ کے کمالات کی وسعتوں کو پہچاننا ہے تو نبی کا مزاج ہے مزاجِ رحمت، اور نبی کا کمال وہ کمالِ شہادت ہے جہاں حضورؐ کو ساری اُمّتوں اور سارے انبیاءؑ کا گواہ بنایا گیا ہے۔

تیسرا مرحلہ ہے نبی کی قوت۔ اعلان ہوتا ہے "هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ" وہ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت کے ساتھ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ کیوں؟ تاکہ پیغمبرؐ اس دین کو تمام ادیان پر غالب بنائیں۔ یہ کام طاقت کا ہے، یہ کام قوت کا ہے۔

بعض مفسرین نے گھبرا کے یہ تاویل کر دی کہ اللہ نے پیغمبرؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ پیغمبر اسلامؐ کے قوانین کو دوسرے مذاہب کے قوانین پر غالب بنائیں۔ یعنی نبی یہ ثابت کر دیں کہ اسلام کا قانون دیگر قوانین سے بہتر ہے۔ نبی یہ ثابت کر دیں کہ اسلام کے احکام دیگر احکام سے افضل ہیں۔ لیکن عزیزو! اس میں پیغمبرؐ کا کیا کام ہے۔ قانون تو اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اللہ نے پہلے ہی اتنا طاقتور بنایا ہوتا کہ دیگر مذاہب سے بہتر ہوتا۔ اگر خدانکردہ معاذ اللہ خدا نے قانون کمزور بنایا ہے تو پیغمبرؐ کیسے بہتر ثابت کر دیں گے، اور اگر خدا نے قانون بہتر ہی بنایا ہے تو اس میں کسی کے ثابت کرنے کا کیا کام ہے، جو قانون بہتر ہے وہ بہتر ہے۔

مسئلہ قانون کا قوانین سے افضل ہونے کا نہیں ہے، مسئلہ دین کے ادیان پر غالب آنے کا ہے اور یہ کام طاقت اور قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کا تعارف تین اعتبارات سے کرایا ہے:

۱۔ مزاجِ پیغمبرؐ مزاجِ رحمت۔

۲۔ کمالِ پیغمبرؐ کمالِ شہادت۔

۳۔ طاقتِ پیغمبرؐ طاقتِ اظہارِ دینِ خدا۔ غلبۂ دینِ پروردگار۔ اور دین کو بھی غالب آنا ہے تمام ادیان پر، اور یہی وہ وعدۂ الٰہی ہے جس کی وفا کا انتظار ہو رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس بیسویں صدی میں اسلام ایک باعزت دین ہے۔ اب اسلام کی وہ حیثیت نہیں ہے، اب وہ دن چلے گئے جب مکّہ والے سوچ رہے تھے کہ ہم جب چاہیں گے انھیں نکال باہر کر دیں گے۔ اب وہ زمانہ چلا گیا جب لوگ یہ سوچ رہے تھے جب چاہیں گے اسلام کو فنا کر دیں گے۔ اب اسلام فنا ہونے والی طاقت نہیں ہے۔ اب اسلام استقلال رکھتا ہے۔ اب اسلام قوت رکھتا ہے۔ اب اسلام اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ اسلام دنیا کے مذاہب پر غالب بھی نہیں ہے بلکہ اگر مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لیا جائے تو شاید دیگر مذاہب ہی غالب ہیں۔ ان کے ذہن پر یہودیت غالب ہے۔ ان کے ذہن پر عیسائیت غالب ہے۔ ان کے ذہن پر کوئی اور ازم غالب ہے۔ کلمہ پڑھنے والے سب مسلمان ہیں مگر کسی کا اسلام دیگر مذاہب پر غالب نظر نہیں آتا ہے کہ شرک اس بات کا اقرار کر لے کہ اب اسلام غالب ہے اور ہم مغلوب ہیں۔ یہودیت اس بات کا اقرار کر لے کہ اب اسلام غالب ہے اور ہم مغلوب ہیں۔ اور کیسے یہودیت یہ اقرار کرے گی جب کہ یہودیت یہ منظر دیکھ رہی ہے کہ اسلام اتنی بڑی طاقت رکھنے کے بعد بھی ہم سے ہاتھ ملانا چاہتا ہے۔ ہم پر حکومت نہیں کرنا چاہتا ہے، ہم سے زندگی کی بھیک رہا ہے۔ کل میں اور آج میں اتنا فرق ہو گیا ہے کہ کل ہم مسلمانوں سے رہنے کی جگہ مانگ رہے تھے، ایک خطہ زمین کا تقاضا کر رہے تھے جہاں ہم جا کے بسیں، آباد ہوں اور آج مسلمان ہم سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ ان یہودیوں کو یہ خیال کیسے پیدا ہو گا کہ اسلام ہم پر غالب آگیا ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی وعدہ خدا منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔ عیسائیت کے نام سے اگر مسلمان لرز جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی مسلمان مستقل ہو کر بھی عیسائیت پر غالب نہیں آیا ہے

پر غالب آجائے۔ اگر ابھی تک وعدۂ خدا پورا نہیں ہوا ہے تو کسی ایسے وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب دینِ خدا تمام ادیان پر غالب آجائے۔

اور واضح کر دوں کسی ایسے شخص کا انتظار کرنا پڑے گا جو دینِ خدا کو ادیانِ عالم پر غالب بنائے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ باہر والا نہ ہو کہ پیغمبرؐ پر احسان جتائے بلکہ پیغمبرؐ ہی کے دل کا ٹکڑا ہو تا کہ اس کا غلبہ پیغمبرؐ کا غلبہ کہا جائے۔

یہ ہے پیغمبرِ اسلامؐ کے قانون کی حیثیت۔ یہ ہے پیغمبرِ اسلامؐ کی عظمت و فضیلت اور کمال کی حیثیت۔ اس کے بعد مالک کائنات نے اُمّت کے سامنے جب عظمتِ پیغمبرؐ کو پیش کیا تو اس کی جو ذمہ داریاں قرار دیں انھیں بھی جلدی جلدی آپ سُن لیں، باقی باتیں آئندہ گذارش کروں گا۔

مالک نے قوم کے سامنے تین طرح کی ذمہ داریاں رکھیں:

ایک ذمہ داری عملی ذمہ داری۔ ایک ذمہ داری مالی ذمہ داری اور ایک ذمہ داری دینی ذمہ داری۔

عملی ذمہ داری کیا ہے؟ ایمان والو! تمھاری ذمہ داری ہے "اِسْتَجِیْبُوا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ" لفظ رسول نہ بھولئے گا۔ ایمان والو! اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ اور رسولؐ کی دعوت کو قبول کرو۔ جب تمھیں بُلائیں "اِذَا دَعَاکُمْ"، جب تمھیں دعوت دیں، جب تمھیں بُلائیں تو اللہ و رسولؐ کی دعوت کو قبول کرو۔ خطرات مت دیکھو۔ کیوں؟ "لِمَا یُحْیِیْکُمْ" وہ بُلاتے ہی وہاں ہیں جہاں زندگی ہوتی ہے۔ وہ دعوت ہی وہاں دیتے ہیں جہاں حیات ہوتی ہے۔ ان کا پیغام سراپا حیات ہے، جہاں نہ موت ہے نہ ہلاکت۔ یہ تو اگر موت کی بھی دعوت دیں گے اور تم ان کی آواز پر لبیک کہہ کر گلا کٹا دو گے تو ہم اسی موت کو حیاتِ جاودانی بنا دیں گے۔

دوسری ذمہ داری۔ ایمان والو! "اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰیکُمْ صَدَقَۃً"۔ جب پیغمبرؐ سے راز کی باتیں کرنے کا شوق پیدا ہو تو پیغمبرؐ سے راز کی باتیں کرنے سے پہلے صدقہ دے دینا، اس کے بغیر بزمِ پیغمبرؐ میں نہ آنا۔ یہ تمھاری

مالی ذمہ داری ہے کہ جب راز کی باتیں کرنے جاؤ تو صدقہ دے کے جاؤ۔ اور ایک عام ذمہ داری ہے "ما اٰتاکم الرسول فخذوہ" جو نبیؐ دے دیں اسے لے لو۔

بس یہ تین جملے یاد رکھئے گا باقی انشاء اللہ آئندہ گذارش کروں گا۔ یہ اُمّت کی ذمہ داریاں ہیں اب اس کے بعد اس کا ردِّ عمل کیا ہے، یہ کل عرض کروں گا کہ نبی کی طرف سے تین فرائض اُمّت کے سامنے آئے۔ جب بُلائیں تو لبّیک کہنا۔ راز کی بات کرنا ہو تو صدقہ دینا اور جو دے دیں وہ لے لینا تاکہ تم اُن کے اُمّتی کہے جاؤ۔ یہ مجسم رحمت ہیں۔ یہ شاہد ہیں۔ یہ باکمال ہیں۔ ان کا پیغام رحمت ہے۔ اور اب تمھارا حساب کرنا ہے کہ تمھارا برتاؤ ان کے ساتھ کیا ہے۔

میں لفظوں کو پھر دُہراؤں گا۔ تمھیں بُلائیں تو ان کی آواز پر لبّیک کہنا، اسی میں حیات ہے۔ یہ نہ سوچنا کہ مر گئے تو کیا ہوگا؟ اب دیکھئے قرآن نے لفظوں کو دُہرا دیا، "اِذَا دَعَاکُمْ" جب تم کو دعوت دیں، بُلائیں تو لبّیک کہو۔ یہ ہے فریضہ۔ اب اس فریضہ کے مقابلہ میں عمل کیا ہے۔ اس دن کو یاد کرو جب تم پہاڑیوں کی بلندیوں پر جا رہے تھے "وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ"، حالانکہ پیغمبرؐ تمھیں بُلا رہا تھا۔ اب رشتہ پہچانا آپ نے؟ فریضہ تو یہ تھا کہ جب وہ بُلائیں تو لبّیک کہو اس میں زندگی ہے، موت نہیں ہے۔ اور حال یہ ہے کہ وہ بُلا رہے تھے اور تم بلندیوں پر جا رہے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ تم آنے کو موت سمجھ رہے تھے۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ نبی جہاں بُلائے گا وہاں موت نہیں ہوگی زندگی ہوگی۔ تمھارا خیال ہے کہ اس میں موت ہے زندگی نہیں ہے۔

دوسرا مرحلہ، خدا نے نبیؐ کو گواہ بنایا ہے۔ اب جب پیغمبرؐ روزِ قیامت آئے گا تو کسی اور گواہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اُمّت کے اعمال کا تو نبی گواہ بن کے آیا ہے، اب نبی گواہی دے رہا ہے کہ میں انھیں بُلا رہا تھا یا تو عمل کی کمزوری تھی کہ میری بات پر لبّیک نہ کہی، یا عقیدے کی کمزوری تھی کہ میں زندگی کے لئے بُلا رہا تھا اور یہ زندگی کو موت سمجھ رہے تھے۔

تو عزیزانِ گرامی! اعمال کے سلسلہ میں تو الگ الگ تذکرے کرکے بُلانے

کا ذکر کہیں اور ہے اور نہ آنے کا ذکر کہیں اور ہے، لیکن مالیات کا تذکرہ تو اسی جگہ پر ہے جہاں پہلے یہ اعلان ہوا کہ راز کی باتیں کرنا ہے تو صدقہ دینا۔ اس کے بعد اسی جگہ پر بلا فاصلہ اعلان ہو رہا ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ تم صدقہ دینے سے ڈر گئے، تو جاؤ ہم نے اپنے حکم کو منسوخ کر دیا۔ ہمارے قانون پر عمل کرنے والے نے عمل کر لیا، ہم نے اپنے قانون کو ختم کر دیا۔ اب اس کے بعد کبھی آپ میں حوصلہ پیدا ہو تو اب پیدا ہونے والا حوصلہ بے کار ہے۔ اب آئندہ سوچنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ ہم نے مالیات میں بھی آزما لیا، اعمال سے بھی آزما لیا۔

اعمال میں بھی آزما لئے گئے۔ اموال میں بھی سب آزما لئے گئے۔ اب ایک آزمائش باقی رہ گئی ہے جو نبی دے دیں وہ لے لو۔ آدھی تہائی مت کرنا۔ جو دیدیں وہ لے لو۔ اگر ایک چیز دیں تو ایک لے لینا۔ اگر دو دیں تو دو لے لینا۔ پیغمبرؐ نے کہا کر بُلانے کا تجربہ تو بہت پہلے ہو چکا۔ مالیات کا تجربہ بعد میں ہو گیا۔ اب چلتے چلتے یہ آخری تجربہ بھی ہو جائے۔ فرمایا میں دو چیزیں چھوڑ کے جا رہا ہوں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ جو دیا وہ سب لیا۔ یا دیا کچھ اور لیا کچھ اور۔

وہ تھا سرکارِ دو عالمؐ کا پیغام۔ وہ تھا سرکار دو عالمؐ کا مزاج رحمت ـــ وہ تھی سرکار دو عالمؐ کی عظمت اور حضورؐ کی طرف سے عائد ہونے والی قوم پر ذمہ داریاں، اور ان ذمہ داریوں کو ادا نہ کرنے والوں کا تذکرہ۔ یہ سارے تذکرے قرآن حکیم کے اندر موجود ہیں۔ اب اس کے بعد صرف تتمہ باقی رہ گیا ہے وہ انشاءاللہ میں کل گذارش کروں گا اس لئے کہ شاید اس سلسلہ کا سب سے اہم نکتہ وہی ہوگا جو کل میں آپ کے سامنے عرض کروں گا۔ آپ پڑھیں قرآن مجید۔ جتنا میں نے آپ کے سامنے کل عرض کیا ہے، جو کچھ آج گذارش کی ہے اور اس کے بعد جو کچھ گذارش کروں گا، ان سارے مسائل کا تعلق رسالت سے ہوگا اور سب قرآن مجید کی روشنی میں ہوگا اس لئے کہ اللہ نے پیغمبرؐ کی رسالت کا مسلسل تذکرہ قرآن مجید میں کیا ہے۔

ایک جملہ بطور مقدمہ آپ کو یاد دلا دوں کل کے واسطے تاکہ یہ بات آپ کے

ذہن میں رہ جائے۔ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ اللہ نے پیغمبرؐ کی رسالت، رسالت کی عظمت اور رسالت کی ذمہ داریوں کا مختلف انداز سے تذکرہ قرآن مجید میں کیا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ پیغمبرؐ کو رسول کہہ کر زندگی میں دو ہی مرتبہ بلایا ہے۔

توجہ کریں گے آپ۔ ذکر رسالتؐ تو بارہا ہوا، مختلف آیات میں، مختلف سوروں میں، مختلف مقامات پر، مختلف مناسبتوں سے، رسالت، رسول، رسل، ارسلنا لیکن اتنے تذکروں کے بعد بھی اللہ نے پیغمبرؐ کو اگر رسول کہہ کر بلایا ہے تو پوری حیات رسالت میں صرف دو مواقع پر اور وہ یہی دو مواقع ہیں جن کے بارے میں کل گذارش کروں گا آج تفصیل کا موقع نہیں رہ گیا ہے اور بغیر تفصیل کے آپ کو ان باتوں کا لطف حاصل نہ ہو سکے گا۔

یہ میں نے صرف اس لئے عرض کر دیا ہے تاکہ آپ کے ذہن میں یہ بات رہے کہ آخر وہ مواقع کتنے اہم ہوں گے کہ جن مواقع پر اللہ نے پیغمبرؐ کو رسول کہہ کے خطاب کیا ہے "یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ"، تو کہا۔ طٰہٰ، مُزَمِّل، یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرْ"۔ ایسے سارے تذکرے تو بہت پائے جاتے ہیں مگر رسول کہہ کر پروردگار عالم نے اپنے حبیبؐ کو پوری حیات پیغمبر میں صرف دو ہی مرتبہ پکارا ہے اور ظاہر ہے کہ جب رسالت اتنی اہم، اتنی ہمہ گیر، اتنی جامع، اتنی باعظمت شے ہے تو وہ مسائل کتنے اہم ہوں گے جن کے تذکرے کے لئے خدا نے کوئی اور حوالہ نہیں دیا ہے۔ اگر حوالہ دیا ہے تو رسول کے رسول ہونے کا حوالہ دیا ہے۔

یہ تذکرہ انشاء اللہ کل میں آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔ آج سلسلۂ بیان کو تمام کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ نے پیغمبرؐ کو اعمال امت کا نگراں بنا کر بھیجا ہے کہ پیغمبرؐ جب کسی بات کی دعوت دے تو پیغمبرؐ کی آواز پر لبیک کہنا۔ اسی میں حیات ہے، اسی میں زندگی ہے۔ پیغمبرؐ نے کن کن مسائل کی قوم کو دعوت دی وہ ساری باتیں عرض کرنے کا موقع نہیں ہے۔ صرف ایک منزل۔ سرکار دو عالم مسجد میں ہیں، منبر پر موعظہ فرما رہے ہیں۔ دیکھا ایک کمسن شہزادہ مسجد میں داخل ہوا۔ دیکھنے والوں نے یہی منظر دیکھا کہ جیسے پیر دامن میں اُلجھ رہا ہے اور بچہ زمین پر گر رہا ہے اور پیغمبرؐ خطبہ توڑ رہے

ہیں۔ غرض آپ منبر سے اُترے۔ بچّے کو گود میں اٹھایا۔ منبر پر لے گئے۔ کسی ایک صحابی یا مجمع میں بیٹھنے والے سے نہ کہا کہ میرا بچہ گر گیا ہے اسے اٹھالو، بلکہ خود منبر سے اُتر کر اُٹھایا۔ نبیؐ جانتے ہیں کہ حسینؑ کے اٹھانے کا کام قوم نہیں کر سکتی ہے۔ یہ کام میرا ہے۔ یہ ذمہ داری میری ہے۔ خطبہ توڑ دیا۔ حسینؑ کو لے کر منبر پر آئے۔ اب قوم کی نبیؐ ذمہ داریوں کا اعلان ہو رہا ہے۔ قرآن آواز دے رہا تھا کہ نبیؐ جس بات کی دعوت دے قبول کرنا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا "ھٰذَا حُسَینٌ فَاعْرِفُوْہُ" یہ حسینؑ ہے اسے پہچانو۔ یہ پہلی ذمہ داری ہے۔ "وفضلوہ" اور اس کی فضیلت کا اقرار کرو۔ تم نہیں دیکھتے کہ اس کے واسطے میں نے خطبہ توڑا ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ اس کی فضیلت کا یہ عالم ہے کہ میں منبر سے اُتر آیا ہوں۔ اب اس کی فضیلت کا اقرار کرو۔ اور اس کے بعد آخر میں ایک جملہ فرمایا "وانصروہ" اور جب وقت آجائے تو اس کی مدد کرنا۔ اب اُمّت کی حیات انھیں تین باتوں میں ہے۔ حسینؑ کو پہچان لے۔ حسینؑ کی فضیلت کا اقرار کرے۔ حسینؑ کی مدد کرے۔

یہ نبیؐ کی دعوت ہے جس پر لبّیک کہنا امت کی ذمہ داری ہے۔ مگر کیسی امت ہے نہ حسینؑ کو پہچانا، نہ حسینؑ کی فضیلت کا اقرار کیا، نہ وقت آنے پر کوئی حسینؑ کے کام آیا۔ حد یہ ہو گئی کہ حسینؑ آواز دیں "ھَلْ مِنْ نَاصِرٍ یَّنْصُرُنَا" کوئی ہے جو ہماری مدد کے لئے آئے اور فضا میں آواز پیغمبرؐ گونج رہی ہو "وَانْصُرُوْہُ" حسینؑ کی مدد کرو، مگر کوئی مدد کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اسی لئے حسینؑ نے روز اوّل سے جب سے مدینہ چھوڑنے کا ارادہ کیا قدم قدم پر یہ اعلان کرتے رہے کہ میرا رُخ کربلا کی طرف ہے، میرا رُخ مصائب کی طرف ہے تاکہ اُمّت کو معلوم ہو جائے کہ نصرت کا وقت آگیا ہے، مدد کا وقت آگیا ہے۔ کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ مدد کا وقت ہے، ورنہ حسینؑ خاموشی سے چلے جاتے۔ یہ حسینؑ بار بار منزل مصائب کا حوالہ دیتے جا رہے ہیں تاکہ اُمّت پر حجّت تمام ہو جائے کہ میں انھیں مدد کے لئے بُلا رہا تھا مگر کوئی مدد کے لئے تیار نہیں تھا۔ کتنے واضح طریقہ سے حسینؑ مدینہ سے نکلے۔ جب لوگوں نے کہا فرزند رسولؐ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ فرمایا میں جا رہا ہوں اس لئے کہ نانا نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جاؤ

حسینؑ قربانی دو۔ اسی میں میرے دین کی حیات ہے۔ کیا اب بھی لوگوں کو نہ معلوم ہو سکا کہ مدد کا وقت آگیا ہے۔

حسینؑ نکلے اور ایسے اعلان کے ساتھ نکلے کہ گھروں میں جا کے اعلان کیا، محفلوں میں جا کے اعلان کیا، ہر مرحلہ پر اعلان کیا میں منزل شہادت کی طرف جا رہا ہوں۔ اب تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ اس دعوت پر لبیک کہنے کا وقت آگیا ہے جو میرے جد بزرگوار نے دی تھی، جو میرے نانا نے کہا تھا کہ حسینؑ کی مدد کرنا۔ عزیزو! اب وقت مدد آگیا ہے اس کے بعد بھی سوائے چند افراد کے کوئی مدد کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔

عجیب بات ہے کتنے تھے جو مدد کرنے کے قابل تھے۔ مدینہ میں تھے مگر کوئی حسینؑ کے ساتھ نہیں آیا، اور کتنے ایسے تھے جو مدد کرنے کے قابل نہ تھے۔ چھ مہینہ کے تو کربلا میں آکے ہوئے جب مدینہ چھوڑا ہے تو دس پندرہ دن سے زیادہ کی عمر نہیں تھی مگر کسی کی گود میں بچہ ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ جذبۂ نصرتِ حسینؑ ہے جو آج اصغرؑ کو مدینہ سے لیکر چلا ہے، یہی جذبہ ہوگا جو کل علی اصغرؑ کو مجبور کرے گا کہ اپنے کو جھولے سے گرادیں۔

جہاں جذبۂ نصرتِ حسینؑ پایا جاتا ہے وہاں سن و سال کی قید نہیں ہوتی ہے۔ جہاں یہ جذبۂ نصرت نہیں پایا جاتا ہے وہاں کوئی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔

لو اربابِ عزا، حسینؑ چلنا چاہتے ہیں اور اعلان عام کے ساتھ نبیؐ کی قبر پر آئے۔ ماں کی لحد سے آکے رخصت ہوئے۔ بھائی کو آخری سلام کیا۔ ایک مرتبہ جناب اُم سلمہؓ کے پاس آئے نانی میں کل رخصت ہو رہا ہوں۔ میں مدینہ سے جا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ جناب ام سلمہؓ نے کہا۔ بیٹا کہاں کا ارادہ ہے؟ کہا نانی میں اور واضح بتادوں میں کربلا جا رہا ہوں۔ کہا بیٹا پیغمبرؐ نے کربلا کے بارے میں عجیب خبریں بیان کی ہیں، یہ تم نے کربلا کا ارادہ کیوں کرلیا؟ کہا نانی میں قربانی دینے کے لئے جا رہا ہوں۔ میں نانا کی قبر پر گیا تھا۔ فرمایا جاؤ حسینؑ کربلا میں قربان ہو جاؤ۔ اب میں قربانی دینے کے لئے جا رہا ہوں۔

بس یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ تڑپ کے کہا... ام سلمہؓ نے ... لگے

مگر مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ تم پر کیا گذر گئی؟

کہا نانی اماں میں پورے علم و ادراک کے ساتھ جارہا ہوں۔ مجھے وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں میں مارا جاؤں گا۔ وہ دن بھی معلوم ہے جب شہید ہوں گا۔ وہ جگہیں بھی معلوم ہیں جہاں میرے عزیز قربان ہوں گے۔ وہ منزلیں بھی معلوم ہیں جہاں میرے چاہنے والے قربان ہوں گے۔ اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو بھی وہ جگہ دکھلادوں۔

ام سلمہؓ کا دل لرز رہا ہے کہ یہ حسینؑ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ حسینؑ نے اشارہ کیا زمینیں پست ہوگئیں، زمین کربلا بلند ہوئی۔ فرمایا نانی اماں دیکھ لیجئے یہ جگہ ہے کہ جہاں آپ کا حسینؑ مارا جائے گا۔ اور اگر آپ پہچاننا چاہتی ہیں تو میں ایک نشانی چھوڑ کے جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر ہاتھ بڑھا۔ ایک مٹھی خاک اٹھائی۔ کہا نانی اس خاک کو آپ محفوظ رکھیں۔ جب تک یہ مٹی، مٹی رہے سمجھیں آپ کا حسینؑ زندہ ہے، اور جب یہ خاک خون میں تبدیل ہو جائے تو آپ سمجھیں کہ اب آپ کا حسینؑ دنیا میں نہیں ہے۔

یہ کہہ کر حسینؑ رخصت ہوئے۔ جناب اُم سلمہؓ کو بھی الوداع کہا۔ لیکن اب جو حسینؑ کا قافلہ چلنے لگا سیدانیاں محملوں میں سوار ہوگئیں۔ قاسمؑ نے جناب اُم فروہ کو سوار کیا۔ علی اکبرؑ نے بڑھ کے لیلیٰ کو سوار کیا۔ جوانوں نے بڑھ کے جناب ام کلثومؑ کو سوار کرایا اور جب ثانیٔ زہراؑ کی سواری کا وقت آیا تو حسینؑ خود کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ دیکھنے والے نے گھبرا کے پوچھا اب یہ کون بیت الشرف سے برآمد ہو رہا ہے کہ سارے جوانانِ بنی ہاشم کے ساتھ حسینؑ بھی مصروف خدمت ہیں۔ کہا یہ علیؑ کی بڑی بیٹی ہیں زینبؑ۔ عباسؑ نے بازو تھامے۔ علی اکبرؑ نے پردہ محمل اٹھایا۔ قاسمؑ نے نعلین سیدھی کی حسینؑ نے سہارا دیا تو زینبؑ سوار ہوئیں۔ قافلہ چلنا چاہتا ہے ایک مرتبہ مدینہ کی عورتیں آگے بڑھیں۔ کہا مولاؑ ہم سمجھ گئے کہ اب یہ قافلہ پلٹ کر نہ آئے گا۔ ہم نے جانے کا انداز دیکھ لیا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ اب یہ قافلہ پلٹ کر نہ آئے گا۔ اتنی اجازت دیں کہ ہم دورویہ قطار بنالیں اور سیدانیوں کی سواری درمیان سے گذر جائے۔

اے رونے والو! حسینؑ نے اجازت دی۔ بیبیوں نے صفیں بنائیں۔ اب سیدانیوں کی سواری گذر رہی ہے۔ الوداع الوداع بیبیو خدا حافظ۔ جاؤ سیدانیو خدا حافظ۔ اے میرے مولا آج یہ قافلہ بیبیوں کے درمیان سے گذر رہا ہے۔ کل یہ قافلہ کوفہ اور شام کے بازاروں سے گذرے گا جہاں عابدؑ بیمار قافلہ سالار۔ منادی کی آواز تماشائیو! تماشا دیکھو! دختران پیغمبرؐ ہیں جنھیں قیدی بنا کر لے جایا جا رہا ہے۔

سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

مجلس ۳

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَهْلِ
بَیْتِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی
اَعْدَآئِهِمْ اَجْمَعِیْنَ o
اَمَّا بَعْدُ!

صاحبانِ ایمان وہ ہیں جو اس رسول نبیٔ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ وہ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور بُرائیوں سے روکتا ہے، پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت جس بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے اور جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ان سے آزادی دلاتا ہے۔ وہ لوگ جو ایسے پیغمبر پر ایمان لائے، اس کا احترام کیا اور اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو پیغمبرؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے یہی لوگ وہ ہیں جو زندگی میں کامیاب ہیں۔

آیۂ کریمہ کے ذیل میں رسالت الٰہیہ کے عنوان سے جو سلسلۂ بیان آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے تیسرے مرحلہ پر آج کچھ باتیں تسلسل رسالت سے متعلق گذارش کرنا ہیں لیکن اس حقیقت کو پہچاننے سے پہلے ایک نکتہ پر توجہ دینا ہوگی اور وہ یہ ہے کہ کسی برادری میں بھی جب افراد زیادہ ہو جاتے ہیں تو برادری ہونے کے باوجود اختلافات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں،

حقیقی بھائی ہیں لیکن بھائیوں کے درمیان نظریات کا اختلاف نہ ہو یہ ممکن نہیں ہے۔ دونوں کی پسند الگ الگ ہے۔ دونوں کا مزاج الگ الگ ہے۔ دونوں کی طبیعت الگ الگ ہے۔ دونوں کے خیالات الگ الگ ہیں۔ یہ سب ہونے کے بعد بھی دونوں حقیقی بھائی کہے جاتے ہیں۔ تو جب تک یہ بھائی دو رہیں گے اختلافات دو ہی ہوں گے۔ اِن کا مزاج الگ اُن کا مزاج الگ۔ دو حقیقی بھائی دسترخوان پر بیٹھے ہیں، ایک مٹھاس کو پسند کرتا ہے ایک نمکین کو۔ ایک کا مزاج نزلاوی ہے، ٹھنڈی چیز استعمال نہیں کر سکتا ہے۔ ایک کا مزاج گرم ہے وہ ٹھنڈا پانی ہی پینا چاہتا ہے۔ نہ اس سے کوئی برادری پر اثر پڑتا ہے نہ قرابت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ لیکن بہرحال دو ہیں تو مزاج دو ہوں گے۔ پھر یہی برادری اگر بڑھ کر تین اور چار تک پہونچ جائے تو اختلافات بھی تین چار طرح کے ہو جائیں گے۔ جتنی برادری میں وسعت ہوتی جائے گی اتنا ہی اختلاف بڑھتا جائے گا۔ یہ غلط سمجھا جاتا ہے کہ برادری کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اختلاف نہ ہو۔ اگر بھائیوں کے پاس عقل نہ ہو، اگر بھائیوں کے پاس شعور نہ ہو، اگر بھائیوں کے پاس فکر نہ ہو، اگر بھائیوں کے پاس مزاج نہ ہو، اگر بھائیوں کے پاس طبیعت نہ ہو تب تو یہ ممکن ہے کہ سو پچاس بھی ہو تو ایک ہی جیسے ہوں۔ جس طرح کہ ایک سانچے میں اگر ہزار گلاس ڈھال کر نکال لئے جائیں تو انشاء اللہ کسی طرح کا اختلاف گلاسوں میں نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ گلاسوں کے پاس نہ عقل ہے نہ شعور ہے۔ نہ ارادہ ہے نہ فکر۔ نہ مزاج ہے نہ طبیعت۔ لیکن مالک نے انسان کو ان نعمتوں سے بھی نوازا ہے۔ تو اگر یہ نعمتیں پائی جاتی ہیں تو یہ اختلافات بہرحال ہوں گے۔ اب ان اختلافات کو کن حدوں میں رہنا چاہیئے اور کہاں نہ ہونا چاہیئے۔ یہ الگ مسئلہ ہے لیکن افراد کی زیادتی اختلافات کی زیادتی کا سبب بہرحال ہوتی ہے جس سے دنیا کا کوئی آدمی انکار نہیں کر سکتا ہے۔

اگر یہ مسئلہ جاہلوں تک محدود رہتا تو شاید یہ خیال پیدا ہوتا کہ یہ اختلاف جہالت کی پیداوار ہے۔ نہیں اگر آپ اہل فکر، اہل فن، اہل ...

وہاں بھی یہ بات آپ کو نظر آئے گی۔ اگر ایک صاحبِ فکر ہو، اور ایک کے پاس قوتِ فکر نہ ہو تو ممکن ہے یہ جو کہے وہ تسلیم کر لے۔ لیکن اگر یہ بھی صاحبِ فکر ہے اور وہ بھی صاحبِ فکر ہے تو افکار کا اختلاف تو بہر حال ہوگا۔ اگر یہ بھی صاحبِ فن ہے اور وہ بھی صاحبِ فن ہے تو فن کا اختلاف بہر حال ہوگا۔ بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اتحاد پسند بھی نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر ایک محفل میں دس شاعر اکٹھا ہو جائیں اور کمال اتحاد کو ظاہر کرنے کے لئے سب ایک ہی قصیدہ پڑھ دیں کہ دیکھئے ہمارے درمیان نہ فکر کا کوئی اختلاف ہے نہ فن کا کوئی اختلاف ہے، نہ سوچنے کا کوئی اختلاف ہے۔ جو انھوں نے پڑھا ہے وہی ہم پڑھیں گے۔ جو ہم پڑھیں گے وہی ہمارے بعد والا پڑھے گا۔ تو دو کو برداشت کرنے کے بعد لوگ کہیں گے جناب اس کے بعد آپ زحمت نہ فرمائیں، ہمیں تو اختلاف ہی چاہیئے۔ اختلاف کے معنی لڑائی نہیں، جھگڑا نہیں مگر الگ چیز چاہیئے۔ آپ کچھ اور کہیں، وہ کچھ اور کہیں۔ اُن کے اشعار الگ ہوں، آپ کے اشعار الگ ہوں۔ اُن کی فکر الگ ہو، آپ کی فکر الگ ہو۔ یہ اگر متحد ہو جائیں تو نا قابل برداشت ہو جائیں گے، اور اگر الگ الگ خیالات پیش کریں تو اس سے بہتر کوئی شے نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جہاں فکر ہوتی ہے، جہاں شعور ہوتا ہے، جہاں عقل ہوتی ہے، جہاں سمجھ ہوتی ہے، جہاں نظر ہے، جہاں نظریات ہیں وہاں اختلافات ضرور ہوں گے۔ چاہے برادری ایک ہو، شجرہ ایک ہو، نسب ایک ہو، خاندان ایک ہو۔ کتنا ہی اتحاد کیوں نہ پیدا ہو جائے جہاں عقل و فکر و شعور ہے وہاں اختلاف نظر و نظریات ضرور ہوگا۔

توجہ فرمائیں۔ یہ تمہید جو میں آپ کے سامنے گذارش کر رہا ہوں اسے اگر کسی نے محسوس نہ کیا تو اس کے بعد جتنی باتیں کہنے والا ہوں وہ اسے محسوس نہیں کر سکتا۔

یہ ہے عالم انسانیت کا مزاج۔ یہ ہے عالم انسانیت کی ایک انسانی دنیا کہ جہاں اہل فکر و نظر و شعور زیادہ ہوں گے تو جتنے ہوں گے اتنے نظریات، اتنے خیالات، اتنے مزاج اور اتنی طبیعتیں بھی ہوں گی۔ ان میں اختلافات چاہئے ٹکراؤ

کے معنی میں نہ ہو، لیکن خیالات کے معنی میں اختلاف ضرور پیدا ہوگا۔

تو عزیزو! جب دو بھائیوں کا یہ حال ہے، جب برادری کے چار آدمیوں کا یہ حال ہے، جب چھ علمار کا یہ حال ہے، جب دس شعرار کا یہ حال ہے۔ تو اگر کسی برادری میں ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد ہوں تو وہاں کا حال کیا ہونا چاہیئے۔ یہ بھی ایک برادری ہے جس طرح مومنین کی ایک برادری ہوتی ہے، علمار کی ایک برادری ہوتی ہے، شعرار کی ایک برادری ہوتی ہے۔ ایسے ہی رسولوں کی ایک برادری ہے، پیغمبروں کی ایک برادری ہے، جس میں ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد پائے جاتے ہیں۔ تو جس برادری میں اتنے زیادہ افراد پائے جاتے ہوں اور سب صاحبانِ عقل ہوں۔ ایسے صاحبانِ عقل کہ کسی کی اُمت کے پاس ایسی عقل نہ ہو جیسی عقل پیغمبر کے پاس ہے ورنہ اگر قوم کے پاس فکر و شعور کی مقدار پیغمبر سے زیادہ ہو گئی تو یہ ظلم ہوگا کہ ایسی قوم کے لئے ایسا پیغمبر بھیجا جائے۔ تو ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ جس برادری میں ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوں گے اس برادری میں ایک لاکھ چوبیس ہزار قسم کے اختلافات ہوں گے۔ اور جو بچے نہیں جانتے ان کے معلومات کے لئے ایک لفظ گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

پروردگار عالم نے جن کو نبی بنایا ہے ان کی تعداد ہے ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ان ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کے درمیان اب میں نے لفظ بدل دیا ہے، پیغمبروں کے درمیان نہیں کہہ رہا ہوں اس لئے کہ ہمارے یہاں نبی کا ترجمہ پیغمبر کیا جاتا ہے جو کہ غلط ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار خدائی منصب دار نبیوں کے درمیان جن کو پیغمبر بنایا گیا ہے وہ صرف تین سو تیرہ ہیں جنھیں رسول کہا جاتا ہے۔

میری ابتدائی تقریریں اگر آپ کے ذہن میں ہیں تو جس کے پاس خدائی خبر آتی ہے وہ ہے نبی، اور جس کے پاس خدائی پیغام آتا ہے وہ ہے رسول۔ تو جس کے پاس پیغام آئے گا وہی تو پیغمبر ہوگا، پیغام کا لے جانے والا ہوگا۔

تو نبی تھے ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ان کے درمیان رسول ہیں تین سو تیرہ (۳۱۳)۔

تو اگر اس برادری میں ایک لاکھ چوبیس ہزار اختلافات نہ بھی ہوں تو کم سے کم تین سو تیرہ اختلافات تو ہونے چاہئیں اس لئے کہ یہ بھی پیغامبر ہیں۔ اِن کے پاس بھی کوئی پیغام ہے۔ وہ بھی پیغامبر ہیں اُن کے پاس کوئی پیغام ہے۔ یہ بھی ایک بشر ہیں وہ بھی ایک انسان ہیں۔ یہ بھی صاحبِ فکر ہیں وہ بھی صاحبِ نظر ہیں، تو ان کے درمیان کوئی اختلاف تو ہونا چاہیئے لیکن جب ہم نے تاریخ مرسلین پڑھی، تاریخ انبیاء پڑھی تو نہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کے درمیان کوئی اختلاف دیکھا، نہ تین سو تیرہ (۳۱۳) رسولوں کے درمیان کوئی اختلاف دیکھا تو آخر کیا وجہ ہے کہ دو حقیقی بھائیوں کے درمیان مزاج و طبیعت و فکر و نظر کا اختلاف ہو جاتا ہے اور تین سو تیرہ کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ کیا ان کے پاس کوئی مزاج نہیں ہے، نہ سرد نہ گرم۔ ان کے پاس کوئی طبیعت نہیں ہے ان کے پاس کوئی فکر نہیں ہے ایسا تو نہیں ہو سکتا اور اگر یہ سب ہے تو اختلاف کیوں نہیں ہے۔

اب میں پہلے چند لمحوں میں آپ کے سامنے تاریخ قرآن گذارش کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد میں اس مسئلہ کو حل کروں گا جس کو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے رکھ دیا تھا تاکہ اتنی دیر تک آپ خود بھی کچھ سوچتے رہیں۔

رسول ایک دو نہیں تین سو تیرہ کی تعداد جو روایات میں بیان کی گئی ہے اور قرآن مجید نے ان کا حوالہ دیا ہے۔ پہلا اعلان قرآنی "لِکُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلٌ"، اللہ کی طرف سے ہر اُمّت کے لئے، ہر قوم کے لئے ایک رسول ہے۔ کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کے لئے اللہ نے کوئی رسول نہ بنایا ہو۔ خدا نے ہر قوم کے لئے ایک رسول بنایا ہے۔ ہر قوم کے لئے ایک رسول ہے۔ ہر قوم میں رسول نہیں ہر قوم کے لئے خدا نے ایک رسول بنایا ہے۔ لیکن ہر قوم میں ایک رسول ہو ایسا نہیں ہے۔ تو کیا بعض قومیں ایسی ہیں کہ جن کے لیے خدا نے ہدایت کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے؟

قرآن مجید دوسرا اعلان کرتا ہے "اِنْ مِنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ"، کوئی اُمّت، کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے درمیان کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ اگر آپ ذہنوں پر تھوڑا زور دیں تو میری یہ محنت ضائع نہ ہو۔ کوئی قوم ایسی نہیں ہے

جس کے درمیان کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ اب یہ "درمیان" اور "لئے" کا آپ فرق محسوس کر رہے ہیں۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ نے پیغمبرؐ کو بھیجا مکہ والوں کے درمیان۔ مگر رسول بنایا عالمین کے لئے۔ تو اب اس لفظ کے فرق کو پہچان لیں کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے درمیان خدا نے کوئی ڈرانے والا نہ بھیجا ہو۔ تو جو درمیان میں آیا ہے وہ ہے ڈرانے والا۔ اور جو قوموں کے لئے آیا ہے وہ ہے رسولؐ۔ دونوں کا فرق پہچانا آپ نے؟ ڈرانے والا الگ ہوتا ہے، اور رسول الگ ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم میں، کسی قریہ میں، کسی گاؤں میں کوئی عالم چلا جائے تو وہ کس کام کے لئے جاتا ہے؟ خود قرآن مجید نے کہا کہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ تم میں سے کچھ افراد نکلیں اور جا کر علم دین حاصل کریں۔ اور جب علم دین حاصل کر کے پلٹ کے آئیں تو ان کا کام ہوگا "لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ" جب قوم میں پلٹ کے آئیں تو قوم کو ڈرائیں۔ اس کے معنی کیا ہوئے کہ ڈرانا رسول کا کام بھی ہے، ڈرانا نبی کا کام بھی ہے، ڈرانا عالم کا کام بھی ہے۔ یہ کام ایسا مشترک ہے جو خدا کبھی نبی سے لیتا ہے، کبھی یہ کام رسول سے لیتا ہے اور کبھی یہ کام عالم سے لیتا ہے۔ تو جب قرآن نے کہا کہ کوئی قریہ، کوئی گاؤں، کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جس میں خدا نے کوئی ڈرانے والا نہ بھیجا ہو تو یہ کام تو عالم سے بھی ہو جائے گا۔ یہ کام وصی سے بھی ہو جائے گا۔ یہ کام نبی سے بھی ہو جائے گا۔ لیکن خدا نے ہر قوم "کے لئے" رسول بنایا ہے۔ تو اگر ہر قوم میں رسول ہوتا تو تین سو تیرہ نہ ہوتے۔ اقوام عالم کی تعداد تین سو تیرہ نہیں، اقوام عالم کی تعداد ہزاروں میں ہے تو خدا نے ان ساری قوموں کے لیے جن کو رسول بنایا ہے وہ ہیں تین سو تیرہ، اور جن کو اتمامِ حجّت کے لیے ان کے درمیان بھیجا ہے ان کا نام رسول نہیں ہے، ان کا نام ڈرانے والا ہے۔

تو جو قوموں کے "درمیان" آئے وہ تھے نذیر، اور جو قوموں "کے لئے" آئے وہ تھے رسول۔

آپ تھوڑی دیر اپنے ذہنوں کو میرے ساتھ رکھیں۔ پروردگار عالم نے

تین سو تیرہ (۳۱۳) رسول بھیجے اتنی اقوام کے لئے جو ہزاروں کی تعداد میں تھیں اور ہیں۔ مگر سب کے لئے خدا نے تین سو تیرہ رسول بھیجے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے ایک کو پیغام دے کر بھیجا اور دس کو اس پیغامبر کے ساتھ لگا دیا کہ اس کے پیغام کو آگے بڑھائیں۔ توجہ کر رہے ہیں آپ؟۔ پیغام لانے والا ایک، اور اس پیغام کو گاؤں گاؤں، شہر شہر، علاقے علاقے پہونچانے کے لئے متعدد۔ کسی کے ساتھ دس ہیں، کسی کے ساتھ بیس ہیں، کسی کے ساتھ سو ہیں، کسی کے ساتھ ہزار ہیں، یہاں تک کہ تین سو تیرہ کے درمیان ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد پوری ہو گئی۔ یہ تین سو تیرہ کا پیغام تھا جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پہونچا رہے تھے۔ یہ تو انبیاء تھے۔ اس کے علاوہ جو پہونچانے والے اوصیاء ہیں وہ الگ ہیں، جو پہونچانے والے علماء ہیں وہ الگ ہیں اور چونکہ علماء کے سر وہ ذمہ داری رکھی گئی ہے جو کل رسولوں کے ساتھ نبی انجام دیتے تھے۔ اسی لئے پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ میری اُمّت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء جیسے ہیں۔ یہ مرسلین جیسے نہیں ہیں اس لئے کہ انھیں پیغامبر نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ انبیاء جیسے ہیں ان کا کام پیغام کو عام کرنا ہے اور اس پر عمل کرانا ہے۔

تو خدا نے ہر قوم کے لئے رسول بنائے، پھر اعلان کیا "ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا" ہم نے مسلسل رسولوں کے بعد رسول بھیجے۔ برابر رسول آتے رہے۔ کچھ کی مثالیں بیان کر دیں کہ ہم نے نوحؑ کو رسول بنایا۔ ہم نے ابراہیمؑ کو رسول بنایا۔ ہم نے ہودؑ و لوطؑ و شعیبؑ و صالحؑ کو رسول بنایا۔ ہم نے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو رسول بنایا۔ مگر فقط اتنے ہی رسول نہیں ہیں، یہ ایک سلسلہ تھا جس کا اعلان قرآن مجید نے کیا ہے کہ ہم نے رسول تو بہت سے بھیجے "مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ" کچھ وہ ہیں جن کے قصّے ہم نے بیان کر دیئے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جن کے قصّے بھی بیان نہیں کئے۔ مگر ساری امتِ اسلامیہ کا فرض ہے کہ چاہے قرآن میں ان کا ذکر ہو چاہے نہ ہو مگر مانیں۔

دیکھئے میری بات ضائع نہ کیجئے گا۔ اگرچہ یہ طے ہے اور خود خدا کہتا ہے کہ ہم نے ذکر بھی نہیں کیا ہے مگر مسلمان کا فرض ہے کہ مانے۔ تو اتنی عقل تو ہر مسلمان

کے پاس ہونی چاہیئے کہ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر ایمان ہے تو کبھی کسی مسئلہ میں یہ نہیں کہے گا کہ قرآن میں نہیں ہے تو نہ مانیں گے۔

دیکھئے کتنا احمقانہ مطالبہ ہے اکثر مسائل کے بارے میں جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن میں کہاں ہے۔ قرآن میں نہیں ہے تو نہیں مانیں گے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرؑ قرآن میں کہاں ہیں، اور ایک لاکھ چوبیس ہزار تو بہت ہوتے ہیں، تین سو تیرہ رسول کہاں ہیں قرآن میں۔ قرآن میں تو بیس بائیس کا تذکرہ ہے بس اتنے ہی کو مانئے باقی کو چھوڑ دیجئے۔ اس لئے کہ ہم تو وہی مانیں گے جو قرآن میں ہے ہمارے لئے قرآن کافی ہے۔ مگر جب بات ایمان پر آپڑی تو کہا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کچھ قرآن ہی میں ہو، بلکہ جو قرآن میں ہے وہ بھی مان لیں گے اور جو حضورؐ نے فرمایا ہے وہ بھی مان لیں گے۔ تو دیکھئے اب بات قرآن سے آگے بڑھ گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اتنے رسول تھے لہٰذا مان لیں گے۔ حضورؐ نے کہا ہے کہ اتنے نبی تھے لہٰذا مان لیں گے، چاہے قرآن میں ان کا ذکر ہو یا نہ ہو۔ تو مسئلہ عقیدہ میں کم سے کم مسلمان اتنا آگے تو بڑھا کہ صرف اتنا نہ مانیں گے جتنا قرآن میں ہے بلکہ جو قرآن میں ہے وہ بھی مانیں گے اور جو حضورؐ نے فرمایا ہے وہ بھی مانیں گے۔ حالانکہ اگر آپ انصاف کریں تو جتنا قرآن میں ہے وہ بہت کم ہے، اور جتنا حضورؐ نے فرمایا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ کہاں بیس بائیس اور کہاں ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ اگر کم سے کم یہی ہوتا کہ چوبیس ہزار قرآن میں ہوتے اور باقی ایک لاکھ حضورؐ نے فرمائے ہوتے تو کم سے کم تگنے چوگنے کا فرق ہوتا۔ یہ بیس بائیس کہاں اور ایک لاکھ چوبیس ہزار کہاں۔ مگر جب حضورؐ نے بیان کر دیا تو ہر مسلمان سر جھکا کے ایمان لے آیا۔ ارے ایک لاکھ چودہ ہزار تو صحابی تھے حضورؐ کے۔ ایک لاکھ چودہ ہزار صحابی حضورؐ مدینہ میں چھوڑ کے گئے تھے۔ کاش صحابہ نے ہم پر اتنا ہی احسان کیا ہوتا کہ ہر ایک نے ایک ایک نبی کا نام یاد کر لیا ہوتا تو یہ بالکل اندھیرے کا ایمان نہ ہوتا۔ ایک آتا حضورؐ ایک نبی کا نام بتلایئے۔ دوسرے نے کہا ہوتا حضورؐ ایک نبی کا نام بتائیے۔ جن کا

حافظہ اچھا تھا کہ پورا پورا قرآن یاد کر سکتے تھے وہ دو چار کے نام یاد کر لیتے اور اس طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار تو پورے ہو ہی جاتے اور آج مسلمانوں کے پاس کم سے کم ان کے عقیدے کی ایک سند تو ہوتی کہ آج دوسری قوم کا کوئی آدمی اُٹھ کے کہہ دے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کو مانتے ہو ذرا چوبیس ہزار کے نام تو بتاؤ۔ تو سوائے اس کے کہ کہہ دیں کہ ہمارے حضورؐ نے فرمایا ہے۔ اس کے آگے کیا کہیں گے جب کہ طنز کرنے والا کہے گا سبحان اللہ یہ عجب ایمان ہے کہ نہ نام معلوم ہیں نہ نسب معلوم ہے۔ نہ قوم معلوم ہے نہ جگہ معلوم ہے۔ نہ کچھ معلوم ہے۔ خالی ایمان لے آئے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ انھوں نے فرما دیا ہے۔ تو جب وہ فرما رہے تھے تو کہیں آسمانوں پر تو نہیں فرمایا تھا، بزمِ اصحاب ہی میں تو فرمایا تھا آپ نے پوچھا کیوں نہیں۔

دیکھئے یہ ایک عجیب مسئلہ ہے کہ میں ہر بات کو وضاحت سے گذارش نہیں کر سکتا ہوں لیکن ایک لمحہ آپ میرے ساتھ رہیں شاید آپ کے ذہن اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جائیں تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر قرآن مجید کے یہ معنی نہیں ہیں۔ جو لوگ بیان کرتے ہیں اور کوئی اور معنی ہیں تو اتنے چاہنے والے اہلِ بیتؑ کے گرد رہا کرتے تھے انھوں نے پوچھ لیا ہوتا کہ اس آیت کے معنی کیا ہیں اور نوٹ کر لیا ہوتا تو آپ کے معنی الگ ہوتے اور ہمارے معنی الگ ہوتے۔

اس کے معنی کیا ہیں کہ فلاں امام کی تاریخ ولادت یہ ہے یا وہ ہے آخر اتنے آدمی امامؑ کے پاس تھے کسی نے پوچھ کر نوٹ کر لیا ہوتا کہ یہ جھگڑا ہی نہ ہوتا۔ عزیزو! یہ جتنے مطالبے ہم سے ہیں۔ یہی مطالبہ ہمارا اُمّتِ اسلامیہ سے ہے۔

تاریخ ولادت تو کوئی مذہب نہیں ہے۔ اگر کسی آدمی کو نہیں معلوم ہے کہ پیغمبرؐ کس تاریخ کو پیدا ہوئے تو کیا وہ آدمی مسلمان نہیں ہے؟ تاریخ ولادت، وفات کا عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن شخصیت کا تعلق ہے۔ کوئی نبی ہی کو نہ جانتا ہو تو کیسے ایمان لائے گا۔ تو ہم سے یہ مت پوچھئے کہ تاریخ ولادت کیوں نہ طے

چودہ ہزار سیکھنے والے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار کا ایمان۔ کم سے کم شخصیتیں تو معلوم ہو جاتیں۔ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے درمیان کتنے آدمی تھے اور ان کے نام کیا تھے، کسی نے نہ پوچھا۔

سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ آنکھ بند کرکے لوگ کیسے ایمان لے آئے۔ ہم تو اس لئے ایمان لائے کہ کس سے پوچھنے جائیں۔ نہ عالم کو خبر نہ جاہل کو، نہ قوم کو خبر نہ مرشد کو۔ نہ قاری کو خبر نہ حافظ کو۔ کسی کو نہیں معلوم، ہم کس سے پوچھیں؟ مگر حضور کو تو خبر تھی جو حضورؐ کے سامنے بیٹھے تھے اگر انھوں نے پوچھ لیا ہوتا تو کیا پیغمبرؐ بھی کہہ دیتے کہ مجھے نہیں معلوم۔ پیغمبرؐ تو یہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ حضور نے بتا دیا ہوتا۔

مگر مسلمان نے کہا کہ بس حضورؐ نے فرما دیا یہی کافی ہے۔ حضور سے کیا پوچھنا ہے۔ وہ اگر کہتے دس لاکھ تو ہم وہ بھی مان لیتے۔ نہ ہمیں نام پوچھنے کی ضرورت ہے، نہ شجرہ دریافت کرنا ہے۔ نہ باپ کا نام نہ ماں کا نام۔ نہ قوم نہ قبیلہ۔ نہ جگہ نہ پیدائش نہ وفات۔ بس حضور نے کہہ دیا اتنا ہی کافی ہے۔

اللہ! مسلمان جب ماننے پر آتا ہے تو اتنا شریف ہو جاتا ہے کہ بغیر نام، نسب، شجرہ، تاریخ ولادت و وفات، ایک لاکھ چوبیس ہزار کا ذکر سُن لیا اور سادگی سے ایمان لے آیا اور جب نہ ماننا ہو تو ایک کا پتہ بھی دے دیا، نام بھی بتا دیا۔ باپ کا نام بتایا۔ شجرہ بتایا۔ غیبت صغریٰ بتائی، غیبت کبریٰ بتائی۔ ظہور بتایا۔ انقلاب بتایا۔ سب کچھ بتایا مگر اب تک بات سمجھ میں نہیں آئی۔

تو عزیزانِ محترم! میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ رسولوں کا ایک سلسلہ ہے جس کی طرف قرآن مجید نے بار بار اشارہ کیا ہے۔ اب میرا بنیادی مسئلہ جہاں سے میں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا کہ اختلاف کیوں نہیں ہے۔ اتنی بڑی برادری اور برادری میں بھی اگر سب برابر والے ہوتے تو شاید اختلاف نہ ہوتا لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی بھائیوں میں ذرا اونچ نیچ پیدا ہو گئی اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ بڑے بھائی ایسے کیوں ہو گئے، اور بڑا بھائی سوچ رہا ہے کہ چھوٹے بھائی اتنے

پریشانی باہر والوں کو ہونی چاہیئے۔ مگر بلا وجہ اختلاف پیدا ہوجاتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ آدمؑ ہی کے بیٹے کا نام ہابیل ہے اور آدمؑ ہی کے بیٹے کا نام قابیل ہے۔ اگر ایک بھائی کسی وجہ سے آگے بڑھ گیا تو دوسرے بھائی کو خوش ہونا چاہیئے کہ میں تو اتنا اونچا نہیں مگر میرا چھوٹا بھائی اتنا اونچا ہے مگر حسد جہاں داخل ہوجائے وہاں پھر برادری کام نہیں کرتی ہے۔ جہاں حسد آجائے وہاں نہ شجرہ کام آتا ہے نہ رشتہ کام آتا ہے۔ نہ نسب کام آتا ہے، خالی حسد کام کرتا ہے۔ جب پہلے دن دیکھا تو یہ دیکھا کہ ایک باپ کے دو بیٹے مگر بڑے بھائی سے یہ برداشت نہیں کہ چھوٹا بھائی کیسے آگے بڑھ گیا۔ اور جب یہ نفسانیت بڑھ کے آخری مرحلہ پر آئی تو باپ یہ سوچ رہا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے بیٹا کیسے آگے بڑھ گیا۔ یہ عجب تاریخ انسانیت ہے کہ نہ بھائی سے بھائی برداشت ہوتا ہے نہ باپ سے بیٹا برداشت ہوتا ہے، مگر یہ سب وہاں ہوتا ہے جہاں نفسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن جہاں نفسانیت نہ پائی جاتی ہو وہاں جب باپ طنز کیا جائے گا کہ تمہارے ہوتے ہوئے تمہارے بیٹے کو وصی، وزیر، جانشین بنا دیا گیا تو وہ کہے گا، ہو تو کوئی ایسا مقدر والا باپ جس کا فرزند کائنات کا امیر ہوجائے۔

تو عزیزانِ محترم! یہ تین سو تیرہ (۳۱۳) کی برادری یا ایک لاکھ چوبیس ہزار کی برادری ہے اور سب برابر کے بھی نہیں ہیں، خود قرآن مجید کہتا ہے تیسرے پارے کے آغاز میں "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ" ہم نے ان رسولوں میں بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے۔ تو ایسا بھی نہیں ہے کہ سب برابر ہیں، لہٰذا اختلاف نہیں ہے بلکہ برابر بھی نہیں ہیں، بعض بعض سے افضل ہیں۔ تو جو افضل نہیں تھے انھیں کو سوچنا چاہیئے تھا کہ یہ افضل کیوں ہوگئے اور جو افضل تھے انھیں کو اکڑ جانا چاہیئے تھا کہ یہ کیا ہیں ہمارے سامنے۔ ان کی کیا حقیقت ہے۔

اتنی طویل و عریض برادری، کتنے افراد، کتنے مزاج، کتنی طبیعتیں، افضلیت اور غیر افضلیت کے مسائل مگر کوئی اختلاف نہیں۔ آخر یہ اختلاف کیوں نہیں ہے؟ آپ میرے ساتھ چلیں انشاء اللہ جب نتیجہ گذارش کروں گا تو آپ کو لطف آئے گا۔

اب پروردگارِ عالم اعلان کرتا ہے پیچانو اختلاف کیوں نہیں ہے پیغمبر! "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ" آپ سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی طرف ایک ہی وحی کی، اسے ایک ہی پیغام دیا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا" میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ "فَاعْبُدُوْنِ" میری بندگی کرو۔ پروردگارِ عالم نے ہر رسول کو ایک پیغام دے کر بھیجا ہے کہ قوم کو جا کر یہ بتا دو کہ میں تم سب کا خدا ہوں، میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، تم سب کی ذمہ داری ہے کہ میری عبادت کرو۔ یہ خدا نے کیوں کہا؟ تا کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اختلاف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب پیغامات الگ الگ ہوتے ہیں۔ اگر ان کا پیغام کچھ اور ہوتا، ان کی بات کچھ اور ہوتی تو اختلاف پیدا ہو جاتا۔ ہم نے تو جس کو بھیجا ایک ہی بنیادی پیغام دیا کہ ہم سب کے پروردگار ہیں، سب کے خدا ہیں، اور سب کی ذمہ داری ہے کہ ہماری عبادت کریں۔ تو جناب نوحؑ یہی پیغام لے کر آئے، جناب ابراہیم یہی پیغام لے کر آئے، جناب موسیٰؑ نے یہی کہا کہ وہ خدا ہے اس کی عبادت کرو، جناب عیسیٰؑ نے یہی کہا کہ وہ خدا ہے اس کی عبادت کرو۔ سب کے پاس پیغام ایک تھا اور اگر شریعتوں کا کوئی اختلاف ہے تو وہ اختلاف طریقۂ عبادت میں ہے، پیغام میں نہیں ہے۔

مثلاً اگر جناب ابراہیمؑ کی شریعت جناب موسیٰؑ سے الگ ہے تو اس کے معنی کیا ہیں؟

پیغام ایک ہے خدا کی بندگی کرو۔

ابراہیمؑ کی قوم نے کہا کیسے؟

کہا ایسے۔

جناب موسیٰؑ نے کہا وہ تمھارا خدا ہے تم اس کی عبادت کرو۔

قوم نے کہا کیسے؟

جناب موسیٰؑ نے کہا ایسے۔

ہر ایک نے اپنی قوم کو اس قوم کی صلاحیت کے مطابق طریقۂ بندگی سکھایا ہے، تو طریقۂ بندگی الگ ہے پیغام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خدا نے سب کو بھیجا تھا

ایک پیغام دے کر۔

پہلی وحدت پیغام میں ہے، اور جب اتنی بڑی قوم کے سامنے ایک انسان کو اتنا بڑا پیغام دے کر بھیجا ہے کہ وہ خدا ہے باقی کوئی نہیں ہے تو یہ پتھروں والے کہاں جائیں گے؟ درختوں والے کہاں جائیں گے؟ چاند سورج والے کہاں جائیں گے؟ ہر طرف حملہ ہی تو ہو گا کہ ہمارے سارے خداؤں کو باطل کرنے کے لئے آگئے۔ خدا نے کہا اگر ہم نے بھیجا ہے اور یہ پیغام دے کر بھیجا ہے تو خالی ہاتھ نہیں بھیجا ہے، اسلحہ ساتھ کیا ہے "لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ" ہم نے جو رسول بھیجا اس کو دلیلوں کے ساتھ، معجزات کے ساتھ بھیجا۔ اب جس کا جی چاہے مقابلہ پر آجائے۔ جو مقابلہ پر آئے گا اتنا ہی کر سکتا ہے جتنا بشر کی طاقت میں ہو۔ اور معجزہ وہ کر سکتا ہے جو طاقت بشر سے بالاتر ہو۔ تو ہم نے جس کو بھیجا لاوارث بنا کے نہیں بھیجا۔ معجزات ساتھ کئے ہیں اور اگر پوچھئے آپ کیا کرنے کے لئے آئے ہیں تو "اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ" ان کے ساتھ کتاب کر دی ہے تاکہ پیغام سنا سکیں، اور اگر اچھے برے کو طے کرنا ہے تو ان کے ساتھ ایک میزان، ایک ترازو بھی کر دی ہے، تاکہ شخصیتوں کو تول لیا جائے۔ اعمال کو تول لیا جائے۔ کون اچھا عمل ہے کون برا عمل ہے۔ اور اتنا اگر ناکافی ہو گا تو "اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ" پھر ہم نے آسمان سے لوہا بھی نازل کر دیا، اس لئے کہ سب اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے ہیں کہ معجزہ دیکھ کر مان جائیں۔ سب اتنے شریف نہیں ہوتے ہیں کہ کتاب پڑھیں اور سمجھ جائیں۔ سب ایسے نہیں ہوتے ہیں کہ میزان سامنے آئے اور میزان پر تل جائیں۔ کچھ شریر بھی ہوتے ہیں، لڑنے جھگڑنے والے بھی ہوتے ہیں۔ تو ہم نے انبیاء و مرسلین کو خالی ہاتھ نہیں رکھا۔ ہم نے لوہا بھی نازل کر دیا۔ ایسا لوہا "فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ"، اس میں طاقت پائی جاتی ہے۔ یعنی ہم نے ان کو مسلح بنا دیا۔ معجزات سے مسلح، کتاب سے مسلح اور لوہے سے مسلح۔ تاکہ شریف آئیں تو کتاب سنائیں۔ جاہل آئیں تو معجزات دکھلائیں۔ شریر آئیں تو لوہا سامنے آئے۔

میرے ایک ایک لفظ پر غور کریں گے آپ۔ معجزات عام طور سے اہلِ علم کے لئے نہیں ہوتے ہیں۔ اہلِ علم کے لئے تو کتاب ہوتی ہے۔ معجزات بے چارے جاہلوں کے لئے ہوتے ہیں جو غریب سمجھ نہیں پاتے ہیں کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ کہا بتائیے آپ پیغمبرؐ ہیں؟ کہا دیکھو چاند توڑے دیتے ہیں۔ اس میں کسی علم کا کام تو نہیں ہے۔ کسی نے کہا اگر یہ جانور گواہی دے گا تو ہم مان لیں گے۔ جانور نے گواہی دے دی اس میں کسی علم کا کام تو نہیں ہے۔ کسی نے کہا یہ ذرّے اگر تسبیح پڑھ لیں گے تو ہم مان لیں گے۔ ذرات ہاتھ میں لے لئے اور تسبیح پڑھنے لگے۔ مان گئے۔ یہ تو خالی دیکھنے کا مسئلہ ہے یہ کوئی عقلی مسئلہ تو ہے نہیں۔ گویا عوام الناس کے لئے ہوتے ہیں معجزات اور خواص، پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ہوتی ہے کتاب، اور دونوں سے ہٹ کر شریر طبیعت والوں کے لئے ہوتے ہیں اسلحے۔ ان کے لئے ہوتی ہے تلوار۔ ان کے لئے ہوتا ہے لوہا، اس لئے کہ یہ لوہا ہی ہے جو ان شریروں سے لوہا منوا سکتا ہے۔

عزیزانِ محترم! اب آپ کی زحمت تمام ہوگئی۔ آخری نکتہ پر توجہ دیں تاکہ اتنی دیر کی میری محنت ضائع نہ ہونے پائے۔ تو پروردگار نے کہا کہ ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا اسے تین طرح سے مسلح کر دیا معجزات دیدئے۔ کتاب دیدی۔ لوہا نازل کر دیا۔

کتاب دے دی تاکہ پڑھے لکھے سمجھیں۔ معجزات دیدئیے تاکہ عوام النّاس سمجھیں۔ لوہا دے دیا تاکہ شریروں کا علاج ہو جائے۔

اب ہم کو پرانے رسولوں کی تاریخ میں تو ان کے نام تک نہیں معلوم ہیں، ان کی کتاب کے بارے میں کیا بتائیں؟ ان کے معجزات کے بارے میں کیا بتائیں؟ ان کے اسلحوں کا کیا پتہ بتائیں، ہمیں تو انھیں کا پتہ نہیں معلوم ہے؟ تو ہم مسلمانوں سے یہ نہ پوچھیں گے کہ تین سو تیرہ کے نام کیا تھے؟ ان کی کتابیں کیا تھیں؟ ان کے معجزات کیا تھے؟ ان کا اسلحہ کیا تھا؟ اس لئے کہ جب مسلمان کو نام تک نہیں معلوم ہیں تو یہ سب پوچھنا ہی بے کار ہے۔ لیکن جس کے بارے میں سب معلوم ہے کہ کم سے کم اپنے پیغمبرؐ کا حال تو معلوم ہے۔ نام معلوم ہے۔ باپ کا نام معلوم ہے۔ ماں کا نام معلوم ہے۔ ولادت

معلوم ہے۔ وفات معلوم ہے۔ شجرہ معلوم ہے۔ اس کے بارے میں کتاب تو ہمیں بھی معلوم ہے۔ خدا نے پیغمبرؐ کو جو کتاب دی ہے وہ ہمیں بھی معلوم ہے، یہی قرآن مجید ہے۔

خدا نے پیغمبرؐ کو جو معجزات دئیے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ شق القمر سے لے کر سنگریزوں کی تسبیح تک۔ اب ایک آخری سوال رہ گیا کہ پُرانے مرسلین کا لوہا نہ بتاؤ تو کم سے کم اپنے پیغمبر کا اسلحہ بتا دو۔ وہ لوہا کون سا تھا جو نبی پر نازل کیا گیا؟ میں یہی کہوں گا کہ میدانِ جہاد میں آکے دیکھو۔ خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ معجزات ملے تو تمھارے حوالے کر دئیے۔ کتاب ملی تو اہل کے حوالے کر دیا۔ اور جب ذوالفقار آئی جو اس کے قابل تھا اسے اس کے حوالے کر دیا۔

تو مالک کائنات نے مرسلین کو بھیجا ایک پیغام دے کر۔ پیغام میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کی مدد کے لیے۔ ان کی نصرت کے لیے انھیں مسلح بنا کر بھیجا۔ اب آخری جُملہ سُن لیں ورنہ بات بہت طویل ہے اور وقت زیادہ گذر جائے گا۔

مالک کائنات نے تمام مرسلین کے درمیان جہاں سے سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اور سرکار دو عالمؐ تک ایک رشتہ رکھا ہے تاکہ کہیں سے اختلاف نہ پیدا ہونے پائے اور وہ رشتہ یہ ہے کہ جسے پہلے بھیجا اس سے کہا کہ بعد والے کی بشارت دو اور جسے بعد میں بھیجا اس سے کہا کہ پہلے آنے والے کی تصدیق کرو۔ پہلے آنے والے کا نام ہو گا مُبشّر یعنی بشارت دینے والا اور بعد میں آنے والے کا نام ہو گیا مصدّق یعنی تصدیق کرنے والا۔ اب اختلاف کہاں سے پیدا ہو گا۔ اگر پہلے والے کو مبشّر نہ بنایا ہوتا اور وہ کہتا کہ ہم نہیں جانتے کہ بعد میں کون آنے والا ہے۔ خبردار کوئی آئے تو ماننا نہیں تو اختلاف ہوتا۔ لیکن اس کی تو ذمہ داری ہے کہ کہے کہ جب آئے تو ماننا اور جو بعد میں آیا اسے بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ پتہ نہیں پہلے کون آیا تھا، ہم سے کیا تعلق ہے۔ کہا نہیں تم بعد میں آئے ہو، تم پہلے آنے والے کی تصدیق کرو۔ وہ بھی پیغمبر تھا تو خدا نے اس پوری برادری میں اتنا بڑا اتحاد قائم کر دیا کہ ہر پہلے والے کو مبشّر بنا دیا اور ہر بعد والے کو مصدّق بنا دیا۔ اُس کی بشارت کا تقاضا یہ ہے کہ بعد والے پر

ایمان لاؤ۔ اس کی تصدیق کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے والے پر ایمان لاؤ۔ تو اب اختلاف کہاں سے پیدا ہوگا۔ اسی لئے جناب عیسیٰؑ آئے تو اعلان کیا "مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" میں تمہیں بشارت دینے آیا ہوں ایک ایسے رسول کی (لفظ رسول نہ بھولئے گا) جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمدؐ ہوگا۔ تو جناب عیسیٰؑ اپنے بعد والے پیغمبر کی بشارت دینے آئے ہیں۔ اور جب حضورؐ آئے تو حضورؐ نے کیا کیا۔ یہی کہہ دیا ہوتا کہ اس کے پہلے جو لوگ آئے تھے ہم نہیں جانتے یہ کون لوگ تھے۔ نہیں "وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ" پیغمبرؐ! یہ کتاب جو ہم نے آپ کے حوالے کی ہے یہ کتاب حق ہے اور اپنے پہلے کے سارے پیغامات کی تصدیق کرنے والی ہے۔ یہ قرآن وہ قرآن ہے جو توریت کی تصدیق کرنے آیا ہے۔ یہ قرآن وہ قرآن ہے جو انجیل کی تصدیق کرنے آیا ہے۔ یہ قرآن وہ قرآن ہے جو صحیفوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ یہ پیغمبرؐ وہ ہے جو سارے پیغمبروں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ پیغمبرؐ نے بھی کہا کہ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ مجھے مانو اور آدمؑ کا انکار کر دو۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ مجھے مانو اور نوحؑ کا انکار کر دو۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ مجھے مانو اور ابراہیمؑ کا انکار کر دو۔ اگر مجھے ماننا ہے تو سب کو ماننا ہوگا۔ تو خدا نے اس رسالتی برادری میں اتنا بڑا اتحاد پیدا کر دیا کہ پہلے والے کو بعد والے کا مبشر بنا دیا، اور بعد والے کو پہلے کا مصدّق بنا دیا۔ اب اختلاف کہاں سے پیدا ہوگا۔

یہاں تک آپ کے ذہن میرے ساتھ آئے ہیں تو اب آخری جملہ سنیں۔ تقریر تمام ہوگئی۔ پیغام میں اختلاف نہیں سب کا پیغام ایک ہے۔ عہدوں میں اختلاف نہیں اس لئے کہ پہلا والا مُبشّر ہے اور بعد والا مصدِّق۔ اب ایک جگہ تھی اختلاف کی، وہ تھا مزاجوں اور خیالات کا اختلاف، جہاں سے میں نے گفتگو شروع کی تھی کہ حقیقی بھائی بھی ہوں تو انھیں کچھ پسند ہے، انھیں کچھ پسند ہے۔ ان کی سوچ کچھ اور ہے، ان کی فکر کچھ اور ہے۔ تو یہ تین سو تیرہ ہیں ان میں کم سے کم مزاجوں کا اختلاف تو ہونا چاہیئے۔ طبیعتوں کا اختلاف تو ہونا چاہیئے۔ چاہے پیغام کا اختلاف نہ ہو چاہے ...

کا اختلاف نہ ہو۔ مزاجوں کا اختلاف تو ہونا چاہیئے۔ یہ اختلاف کیوں نہیں ہے، یہی نکتہ سمجھنے کا ہے جس کے لئے اتنی دیر میں نے آپ کو زحمت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ پروردگار یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ جس کو ہم عہدہ دار بناتے ہیں اس کا مزاج ہماری مرضی کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا مزاج مشیّت کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ وہ مزاج سے نہیں بولتا مشیّت سے بولتا ہے۔ وہ طبیعت سے کام نہیں کرتا ہے مشیّت سے کام کرتا ہے۔ تو یاد رکھئے گا اگر مزاج سے کام ہوتا ہے تو دو حقیقی بھائیوں میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے اور اگر مشیّت سے کام ہوتا ہے تو چودہ بھی ہو جائیں تو ذرّہ برابر اختلاف نہ ہو سکے گا۔ نبیؐ کے سامنے چودہ تو نہ تھے مگر جتنے تھے نبیؐ نے چاہا کہ پہچنوا دیں کہ یہ مشیّت والے ہیں، طبیعت والے نہیں ہیں۔ کیسے سمجھائیں گے۔ آؤ کاندھوں پر بیٹھ جاؤ، آدھی زُلفیں اِن کے حوالے، آدھی زُلفیں اُن کے حوالے۔

اب جو حضورؐ نے زلفوں کو دو بچّوں کے درمیان تقسیم کر دیا تو اب یہاں سے طبیعت اور مشیّت کا فرق سامنے آگیا۔ اگر یہ طبیعت والے ہوتے تو دونوں اپنی اپنی برتری کو ثابت کرتے کہ نانا اُدھر جاتے ہیں جدھر ہم لے جاتے ہیں۔ آپ اُدھر نہیں لے جا سکتے جدھر آپ چاہیں۔ وہ کہتے نہیں نہیں میری ناز برداری زیادہ کریں گے۔ جدھر ہم چاہیں گے اُدھر جائیں گے۔ جدھر آپ چاہیں گے اُدھر نہیں جائیں گے۔ لیکن یہاں طبیعت کام نہیں کرتی ہے۔ یہاں مشیّت کام کرتی ہے۔ نہ یہ کہیں لے جائیں گے نہ وہ کہیں لے جائیں گے۔ دونوں اُدھر لے جائیں گے جدھر مشیّت لے جائے گی۔

اب ایک لفظ آ ہی گیا ہے درمیان میں تو بات مکمل کر دوں۔ طبیعت اور مشیّت کا فرق یاد رکھئے گا۔ طبیعت کے تقاضے الگ ہوتے ہیں اور مشیّت کے تقاضے الگ۔ پروردگار کہتا ہے اگر حق طبیعت کا اتباع کر لیتا تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے۔ "لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ" اگر حق خواہشات کا اتباع کر لیتا تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے یعنی مزاج، طبیعت، خواہش۔ حق اس کا اتباع نہیں کر سکتا ورنہ حق اگر طبیعتوں کے پیچھے چلنے لگے تو زمین و آسمان برباد ہو جائیں گے۔

آپ نے پہچانا کہ جہاں طبیعت ہوتی ہے وہاں طبیعت والے کو حق کے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ طبیعت کی ذمہ داری ہے کہ حق کے پیچھے پیچھے چلے۔ لیکن جہاں مشیّت ہوتی ہے وہاں وہ حق کے پیچھے نہیں چلتا ہے۔ بلکہ خدایا! حق کو اُدھر اُدھر موڑ دینا جدھر جدھر علیؑ مڑ جائیں۔

طبیعت کا کام ہے حق کا اتباع کرنا۔ حق کا کام ہے مشیّت کا اتباع کرنا۔ سرکارِ دوعالمؐ نے اپنی حیات میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ وہ ہیں جو مشیّت کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو مشیّت کے پیکر بنے ہوئے ہیں۔ "نحن محال مشیۃ اللہ" ہم محل مشیت پروردگار ہیں۔ اگر مشیّت الٰہی کو پہچاننا ہے تو ہمیں دیکھو مشیت سمجھ میں آ جائے گی۔ ہمیں مشیت کے سانچہ میں ڈھالا گیا ہے۔ اسی لئے پیغمبرؐ نے کہا "خدایا! حق کو اُدھر اُدھر پھیر دینا جدھر جدھر علی جا رہے ہوں" اس لئے کہ حق مشیّت کے ساتھ چل سکتا ہے، طبیعت کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے۔ بس یہی سلسلہ تھا کہ اہلِ دنیا طبیعت والے تھے اور آلِ محمدؐ مشیّت والے تھے اور حق درمیان میں تھا طبیعت والوں کی ذمہ داری تھی کہ حق کے پیچھے چلیں، اور حق کی ذمہ داری تھی کہ مشیّت والوں کے پیچھے چلے۔ اب اگر حق کو پہچاننا ہے تو یوں پہچانو کہ مشیّت والے کا نام ہے حسینؑ اور طبیعت والے کا نام ہے یزید۔ یزید کا فرض ہے کہ حق کے پیچھے چلے۔ حق تو حسینؑ کے ساتھ خود ہی چلتا رہے گا۔ لہٰذا کسی طبیعت والے کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ مشیّت والا ہماری بیعت کر لے۔ یہ طبیعت والوں کی ذمہ داری ہے کہ مشیّت والوں کی بیعت کریں۔ جو بندۂ خدا ہیں ان کو مشیت کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ کسی کو مشیّت کو اپنے اشارے پر چلانے کا حق نہیں ہے۔

کربلا کا کُل اختلاف یہی تھا۔ کربلا کی کُل بنیاد یہی تھی کہ طبیعت، مشیّت کو اپنے اشاروں پر چلانا چاہتی تھی اور حسینؑ طبیعتوں کو مشیّت کے اشارہ پر چلانا چاہتے تھے۔ اب اس راہ میں جو قربانی دینا پڑے ہر قربانی گوارہ ہے مگر مشیّت، طبیعت کی تابع نہ ہو سکے گی۔ مشیّت کے نمائندے، مشیّت کے ترجمان، مزاجوں اور خواہشوں کے

پابند نہ ہو سکیں گے۔

اسی لئے حسینؑ جب مدینہ سے نکلے تو یہ کہہ کر نکلے " ان کان دین محمدؐ لم یستقم الا بقتلی یا سیوف خذینی" اگر دینِ پیغمبرؐ میں استحکام نہیں آتا ہے جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں، تو آؤ تلوارو یہ گردن حاضر ہے۔ میں سر دے سکتا ہوں مگر حق کی بربادی کو برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔

بڑا مفصّل موضوع تھا عزیزو! میں نے سب چھوڑ دیا۔ بس آخری جملے ہیں مجلس تمام کرنے کے لئے۔ جو مشیت کے پیکر ہوتے ہیں ان کی شان الگ ہوتی ہے اور جو طبیعت والے ہیں ان کا مزاج اور ان کا انداز فکر، انداز عمل الگ ہوتا ہے۔ طبیعت اور خواہش والے ہمیشہ اپنی برتری کے بارے میں سوچتے ہیں کہ دنیا ہمیں اونچا مان لے۔ دنیا ہماری بزرگی تسلیم کر لے۔ دنیا ہماری بڑائی کو مان لے۔ مگر جو مشیّت والے ہوتے ہیں وہ خود بلند ہوتے ہیں اور دوسروں کو بلند کرنا چاہتے ہیں۔ کتنا فرق ہوتا ہے ان انسانوں میں جو گھروں میں غلام لا کر رکھتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ بڑے آدمی ہیں اس لئے کہ ان کے گھر میں غلام ہیں اور اُن انسانوں میں جو غلاموں کو اتنا اونچا کرنا چاہتے ہیں کہ اگر غلام سے کبھی یہ کہہ بھی دیں کہ جا تجھے راہِ خدا میں آزاد کر دیا تو غلام یہ کہے کہ آپ کے قدموں کو چھوڑ کے کہاں جاؤں گا؟ اس آزادی کو لیکر کیا کروں گا جو آپ کے قدموں سے جُدا ہونے کے بعد ملے۔

کتنا فرق ہے اہلِ دنیا میں اور اہلِ مشیّت میں۔

آج چونکہ مجھے سلسلۂ کربلا میں ان قربانیوں کا تذکرہ کرنا ہے جو قربانیاں راہِ خدا میں غلاموں نے پیش کی ہیں اور حسینؑ کی اس غلام نوازی کا تذکرہ کرنا ہے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ مشیّت اپنی بڑائی اور اپنی برتری کے لئے کام نہیں کرتے ہیں وہ دنیا کو اونچا کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے غلاموں کو اونچا کر دیا۔

یہ پوری تاریخ ہے آلِ محمدؐ کی۔ دو لباس مولائے کائنات بازار سے لائے ہیں۔ اچھا لباس، معمولی لباس۔ جو لباس قیمتی تھا وہ قنبر کو دے دیا۔ جو معمولی لباس تھا وہ خود

اختیار فرمالیا۔ قنبر نے ہاتھ جوڑے، مولاؑ آپ مولا ہیں، میں غلام ہوں۔ آپ امیرالمومنین ہیں، میری تو کوئی اوقات نہیں ہے، آپ حاکم ہیں، میں محکوم ہوں۔ مولاؑ یہ اچھا لباس آپ کو زیب دیتا ہے۔ فرمایا نہیں قنبر تم جوان ہو۔ کیا کوئی بندہ پرور، غلام نواز اپنے غلاموں کو اتنا اونچا کر سکتا ہے؟ کیا تاریخ میں کوئی ایسی مثال ملے گی جتنا بلند مولائے کائناتؑ نے قنبر کو کر دیا ہے؟ غلامی کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے، اور جتنا بلند صدیقہ طاہرہؑ نے فضہؓ کو کر دیا ہے کنیزی کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اسی لئے اس راہ پر چلنے والوں میں سب کا ایک طریقہ تھا کہ جب حبیب گھوڑے پر سوار ہونے لگے اور مڑ کے غلام کو دیکھا۔ کہا تو نے بڑی خدمت کی ہے۔ بڑا کام کیا ہے۔ جا میں نے تجھے راہِ خدا میں آزاد کر دیا۔ یہ سُننا تھا کہ غلام نے بڑھ کے قدم تھام لئے۔ کہا آقا! جب تک اپنی خدمت کا وقت تھا مجھے ساتھ رکھا اور جب فرزندِ رسولؐ کی خدمت کا وقت آیا تو اب مجھے جدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نہ ہو سکے گا۔ عزیزو! یہ وہ گھرانہ ہے کہ جہاں کی غلامی دنیا کی شہنشاہی سے بہتر ہے۔ جنھوں نے غلاموں کے مرتبہ کو اتنا بلند کر دیا کہ سلسلۂ تاریخ۔ بڑھتے بڑھتے کربلا تک آگیا۔

اب جو کربلا میں وہ وقت آیا جو قربانی کا وقت تھا اور وہ رات آئی جب فرزندِ رسولؐ محضرِ شہادت پڑھ کر سُنا رہے تھے اور ایک ایک کو بتا رہے تھے کہ حبیب کل تم کام آؤ گے۔ مسلم کل تم مارے جاؤ گے۔ زہیر کل تم قتل ہو جاؤ گے۔ چاہنے والو! کل تمھارے سر کٹ جائیں گے۔ اپنے عزیزوں کے بارے میں خبر سُنائی حسینؑ نے۔ ہر ایک کو آگاہ کر دیا یہاں تک کہ جب قربانی کا وقت آگیا اور ایک ایک اجازت لے کر مولاؑ سے میدان میں جانے لگا مگر مولاؑ کی غلام نوازی کا عالم یہ تھا کہ جب کوئی میدان سے آواز دیتا تھا "یَا مَوْلَاہُ اَدْرِکْنِیْ"، مولاؑ، غلام دنیا سے جا رہا ہے آپ غلام کی خبر لیجئے۔ تو آقا کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ فرماتے علی اکبرؑ تم چلے جاؤ۔ حبیب تم چلے جاؤ۔ زہیر تم چلے جاؤ۔ حسینؑ کی ذمہ داری تھی کہ خود میدان میں آئیں، تاکہ جانے والے کو یہ احساس ہو کہ جس کی غلامی اختیار کی ہے وہ اپنے غلاموں کو کتنا اونچا کرنا چاہتا ہے۔ عزیزو! اب سب

تو وہ تھے جو معنوی غلام تھے۔ جو واقعی غلام کربلا میں تھے ان کا بھی یہ عالم تھا کہ جب قربانی کا وقت آگیا تو ایک مرتبہ جون سامنے آئے۔ مولاؑ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہوئے۔ آقاؑ! اب مجھے بھی اجازت دے دیجئے۔ کیا شہادت میں غلاموں کا حصّہ نہیں ہے؟ کیا غلام اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کے قدموں پر ان کے سر قربان ہو سکیں۔

فرزندِ رسولؐ جون کو دیکھ رہے ہیں، جون کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ مولاؑ! اجازت دیجئے۔ حسینؑ خاموش ہیں۔ جون نے عجیب فقرہ کہا۔ مولاؑ! کیا اس لئے مجھے اجازت نہیں مل رہی ہے کہ میرا رنگ سیاہ ہے؟ کیا اس لئے اجازت نہیں مل رہی ہے کہ میں غلام ہوں؟ کیا اس لئے مجھے اجازت نہیں دے رہے ہیں کہ میرے پسینہ سے بُو آ رہی ہے؟ تو مولاؑ اگر یہ غلامی سچی ہے۔ آقا! اگر یہ غلامی سچّی ہے تو اسی غلامی کے اعتماد پر یہ گذارش کر رہا ہوں کہ یہ خون آپ کے خون سے الگ نہ رہ سکے گا۔ یہ غلام آقا سے جُدا نہ رہ سکے گا۔ بس یہ سُننا تھا کہ امام حسینؑ برداشت نہ کر سکے۔ فرمایا جون! میں نے تم کو اپنے بیمار بیٹے کی خدمت کے لئے بچا کے رکھا تھا۔ اگر وہ رخصت کر دیں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ میں روکنے والا نہیں۔ میں اجازت دے دوں گا۔ آئے جون بیمارِ کربلا کے خیمہ کے قریب پُشتِ خیمہ پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ فرزندِ رسولؐ! جون کی آواز بیمارِ کربلا کے کانوں میں آئی۔ بیمار نے آنکھیں کھول دیں۔ جون! خیر تو ہے؟ کہا مولاؑ! آپ کو تو خبر ہے کہ صبح سے راہِ خدا میں قربانیاں پیش ہو رہی ہیں، میں مولاؑ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے میدان میں جانے کی اجازت مانگی۔ مولاؑ نے فرمایا کہ جون میں نے تم کو اپنے بیمار بیٹے کی خدمت کے لئے بچا کے رکھا ہے۔ اگر زین العابدینؑ اجازت دے دیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔ مولاؑ فرمائیے آپ کیا فرماتے ہیں؟ عجب فقرہ فرمایا۔ جون! اگر میری قسمت میں نہیں ہے کہ میں بابا پر قربان ہو جاؤں تو کوئی تو ایسا فدیہ ہو جو میری طرف سے بابا پر قربان ہو جائے۔ جون جاؤ جلدی جاؤ۔ آئے مولاؑ کی خدمت میں۔ آقاؑ اجازت مل گئی ہے حسینؑ نے مقتل میں بھیج دیا۔ لو اب جون کا وعدہ پورا ہو رہا ہے۔ گھوڑے سے گرے راہِ خدا میں کام آئے۔

اب جو ابن عباس نے نبی کو خواب میں دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ میں اس شیشہ میں سارے شہیدوں کا خون جمع کر رہا ہوں۔

یہ تو ایک غلام تھا جس کی غلامی کی لاج خدا نے رکھ لی۔ نبی نے اس کا خون وہیں رکھا جہاں نواسہ کا خون تھا۔ اب ایک اور غلام راہِ خدا میں قربانی دینے کے لئے اجازت لے کر میدان میں آیا ہے۔ جب گھوڑے سے گرنے لگا تو آواز دی "یَا مَوْلَاہُ اَدْرِکْنِیْ" مولاؑ! غلام کی خبر لیجئے۔ حسینؑ دوڑتے ہوئے مقتل میں آئے۔ اب جو غلام کے قریب پہونچے تو دیکھا کہ اتنا زخمی ہو گیا ہے کہ بیہوش ہو گیا ہے۔ حسینؑ نے دیکھا کہ زخموں کی تاب نہ لا کے چاہنے والا غلام بے ہوش ہو گیا ہے۔ حسینؑ سرہانے بیٹھ گئے۔

رونے والو! آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی بے ہوش کو ہوش میں لانا ہوتا ہے تو پانی چھڑکا جاتا ہے۔ مگر جس کے خیموں میں تین دن سے قحطِ آب ہو۔ جس کے بچے العطش العطش کی آوازیں بلند کر رہے ہوں وہ مظلوم کیا کرے۔ حسینؑ نے اپنا رُخسار غلام کے رخسار پر رکھ دیا۔ اب جو آنسوؤں کے قطرے ٹپکے تو غلام نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ منظر دیکھ کر دل بے چین ہو گیا۔ ارے مولاؑ یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا یہ تمھاری غلامی کا حق ہے۔ کہا آقا یہ نہ کریں۔ مولاؑ یہ غلام کا سر آپ کے زانو پر۔ یہ آپ کا رُخسار غلام کے رُخسار پر۔ مگر جب آپ کا آخری وقت آئے گا تو آپ کا سر کس کے زانو پر ہوگا؟ عجب نہیں ماں آواز دے آ میرے لال، آ میرے حسینؑ آ۔ میری آغوش میں آجا۔ زہراؑ کا زانو حسینؑ کا سر.....

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۸

اَعُوذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ
اَلْحَمْدُ لِلہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ
وَ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَھْلِ
بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ
اَجْمَعِیْنَ ہ

امّا بعد!

صاحبانِ ایمان وہ ہیں جو اس رسول نبیٔ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ جو نیکیوں کا حکم دیتا ہے۔ برائیوں سے روکتا ہے۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے۔ خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت جس بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے اور جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس سے اس انسانیت کو آزادی دلاتا ہے۔ پس جو لوگ اس پیغمبرؐ پر ایمان لائے، جنھوں نے اس پیغمبرؐ کا احترام کیا۔ اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو پیغمبرؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہی لوگ وہ ہیں جو زندگانیٔ دنیا میں کامیاب ہیں۔

آیۂ کریمہ کے ذیل میں رسالت الٰہیہ کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے چوتھے مرحلے پر آج پیغمبرِ اسلامؐ کی اس صفت کے بارے میں کچھ باتیں گذارش کرنا ہیں جن کی طرف قرآن مجید کی ان دو لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے "یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ" پیغمبرؐ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

اس سلسلہ میں چند مسائل انتہائی اہم ہیں اور ان کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ مسئلہ فقط حیاتِ پیغمبرؐ سے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ وہ کمال ہے جس کو مالک کائنات نے پیغمبرؐ کی نشانیوں میں قرار دیا ہے اور پیغمبرؐ نے قوم کے فرائض میں قرار دیا ہے۔

نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا یہ اسلام کے فرائض اور واجبات میں اسی طرح شامل ہے جس طرح کہ مسلمان کے لئے نماز واجب ہے۔ روزہ واجب ہے۔ صاحبِ استطاعت کے لئے حج واجب ہے۔ صاحبِ نصاب کے لئے زکوٰۃ واجب ہے۔ ایسے ہی واجباتِ اسلامی میں یہ دو واجبات بھی شامل ہیں جنکی ذمہ داری ہر مسلمان مرد پر ہے۔ ہر مسلمان عورت پر ہے۔ نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا۔

سلسلۂ کلام کو آگے بڑھانے سے پہلے دو تین چھوٹی چھوٹی باتیں آپ سماعت فرمالیں، تاکہ اصل مسئلہ کی وضاحت آسان ہو جائے۔ یہ دو الفاظ جو امر و نہی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہماری زبان کے اعتبار سے بھی اور عربی زبان کے اعتبار سے بھی "معروف" اسے کہا جاتا ہے جو پہچانا ہوا ہو، اور "منکر" اسے کہا جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہو۔ جسے ہر آدمی پہچاننے سے انکار کر دے۔ آپ نے اپنے ماحول میں دیکھا ہو گا کہ اگر آپ کے خاندان میں انتہائی دور کا رشتہ دار بھی صاحب کمال ہو جائے اور کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ فلاں کو پہچانتے ہیں تو آپ فوراً کہیں گے ہاں ہاں کیوں نہیں پہچانتے۔ ہمارے نانا کی خالہ کی نانی کے نواسے ہیں۔ لیکن آپ ہی کا بیٹا۔ آپ ہی کا بھائی۔ آپ ہی کا رشتہ دار خدانکردہ اگر نالائق نکل جائے اور کسی محفل میں آجائے اور کوئی پوچھ لے کہ آپ اسے پہچانتے ہیں؟ تو آپ کوئی جواب نہیں دینا چاہتے ہیں۔ وہ چاہے پہچانا ہوا نہ ہو مگر اسے پہچان لیا۔ یہ پہچانا ہوا رشتہ دار ہے مگر پہچاننے سے انکار کر دیا۔ دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ جو باکمال ہوتا ہے اسے سب پہچانتے ہیں اور جو بے کمال ہوتا ہے اُسے کوئی نہیں پہچاننا چاہتا ہے۔

اسلام نے یہ لفظ معروف اور منکر اسی لئے استعمال کیا ہے تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ ہم جن باتوں کے حکم دینے کے لئے تمھیں تعلیم دے رہے ہیں وہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ جو فطرتِ بشر کی پہچانی ہوئی نہ ہوں، بلکہ جنھیں انسان کی فطرت سلیم پہچانتی ہے انھیں کو معروف کہا جاتا ہے اور جس کو پہچاننے سے فطرتِ بشر انکار کر دیتی ہے اسی کو منکر کہا جاتا ہے۔

پیغمبر کا کمال اور پیغمبر کی شان یہ ہے کہ پیغمبرؐ ان باتوں کا حکم دیتا ہے جو معروف ہیں یعنی فطرت کی پہچانی ہوئی ہیں۔ اسلام کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو فطرتِ بشر کے خلاف ہو۔ اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جسے فطرت انسانی نہ پہچانتی ہو۔ سماج نہ پہچانتا ہو یہ ممکن ہے۔ معاشرہ نہ جانتا ہو یہ ممکن ہے۔ اہلِ مصلحت نہ جانتے ہوں یہ ہو سکتا ہے۔ اہلِ غرض نہ جانتے ہوں یہ ہو سکتا ہے۔ مگر فطرت نہ پہچانتی ہو یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر مالک نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اسی لئے سرکار دو عالمؐ نے اپنے دین اسلام کا تعارف کرانے کے لئے یہ اعلان فرمایا تھا کہ "اسلام اس دین فطرت کا نام ہے جس پر پروردگار عالم ہر انسان کو پیدا کرتا ہے"۔ یہ تو بعد کے مراحل ہیں کہ ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔ ورنہ "كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَىٰ فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ" ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اگر اس کو اس کی فطرت کے حوالے کر دیا جائے تو فطرتِ اسلام سے اس قدر قریب ہے کہ اگر کوئی روکنے والا نہ ہو تو اسلام چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ حالات ہیں جو انسان کو بہکا کے لیجاتے ہیں۔ یہ حالات ہیں جو انسان کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ ورنہ الٰہی قانون فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور ہونا بھی چاہیئے اس لئے کہ جس نے فطرت بنائی ہے اسی نے تو قانون بنایا ہے۔ اگر فطرت بشر کا بنانے والا کوئی اور ہوتا اور قانون کا بنانے والا کوئی اور ہوتا تو کبھی فطرت کے تقاضوں سے بے خبر ہوتا۔ کبھی قانون کو فطرت سے الگ کر دیتا۔ لیکن جب دونوں کا بنانے والا ایک ہی ہے تو وہ تو جانتا ہے کہ فطرت کا تقاضا کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فطرتِ بشر کس قانون کو برداشت کرے گی اور کس

قانون کو برداشت نہ کرے گی۔ تو جو قانونِ فطرت کا پہچانا ہوا تھا وہی قانون بنایا اور جو فطرت کے لئے قابلِ انکار تھا، نا قابلِ برداشت تھا اسلام نے ایسا کوئی قانون نہیں بنایا۔

تھوڑی دیر آپ اپنے ذہنوں کو میرے ساتھ رکھیں گے تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ اسلام نے اپنے قوانین کو فطرت سے کتنا ہم آہنگ کیا ہے۔ پہلے تو جتنے قوانین بنائے سب فطرتِ بشر کے مطابق۔ اس کے بعد اگر کبھی حالات کی بنیاد پر انسان کے لئے قانون نا قابلِ عمل ہو جائے اور فطرت یہ اعلان کر دے کہ اگرچہ قانون قابلِ عمل ہے مگر اب قابلِ عمل نہیں رہ گیا ہے تو یہ کمالِ اسلام ہے کہ اسلام قانون کو پیچھے ہٹا لیتا ہے۔ توجہ! ۔ یہ مسائل ہمارے آپ کے سمجھنے کے ہیں۔ اسلام ہمارا ہی آپ کا دین ہے۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ ہمارے بچّے، ہمارے نوجوان، دین اسلام کو اس لئے اختیار کئے رہیں کہ ماں کا مذہب ہے، باپ کا مذہب ہے، خاندان کا مذہب ہے، سماج کا مذہب ہے۔ آپ اسلام کے خصوصیات کو، اسلام کے امتیازات کو پہچانیں۔ ایک انسان کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ بازار میں ملنے والے دس طرح کے گوشت میں دو قسموں کو استعمال کرے اور آٹھ کو چھوڑ دے۔ سوال یہ ہے کہ اگر گوشت کھانے ہی کا شوق ہے تو کتنی قسمیں بازار میں پائی جاتی ہیں، کیا یہ واجب ہے کہ آپ یہی ایک قسم استعمال کریں۔ آپ کا کام دوسری قسموں سے بھی چل سکتا ہے جس کو دینِ خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی غذا نہ مل رہی ہو، نہ گوشت اور نہ گوشت کے علاوہ کوئی غذا۔ اور اگر بازار میں کوئی شے ہے تو فقط حرام گوشت ہے اور انسان کی زندگی اس مرحلہ پر آگئی ہے کہ اگر نہ کھائے گا تو بھوک سے مر جائے گا۔ تو ابھی تک قانون یہ کہہ رہا تھا کہ آپ اس گوشت کو ہاتھ نہیں لگا سکتے اس لئے کہ آپ کے جینے کے سہارے موجود ہیں۔ آپ کی زندگی کے وسائل موجود ہیں۔ لیکن اب انسان اس

اب فطرت فریاد کر رہی ہے قانون سے اگر آپ نے اپنے قانون کو باقی رکھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے بشر کو موت کی طرف ڈھکیل دیا ہے۔ آپ انسان کی زندگی پسند نہیں کرتے ہیں اس لئے کہ اس انسان کی زندگی کا ایک ہی سہارا ہے اور اسے بھی آپ نے حرام کر رکھا ہے۔ تو جیسے ہی فطرت نے مخصوص حالات میں فریاد کی، آواز بلند کی کہ اب یہ آپ کا قانون ہمارے لئے قابلِ برداشت نہیں ہے۔ اسلام نے اپنے قانون کو فوراً پیچھے ہٹا لیا اور کہا، ایسے انسان کے لئے یہ گوشت بھی حلال ہے جب تک تمہاری زندگی کا سہارا تھا ہم نے تمھیں پابند بنا کے رکھا تھا۔ لیکن جب تمہاری زندگی کا کوئی سہارا نہیں رہ گیا ہے تو زندگی زیادہ عزیز ہے۔ زندگی کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ زندہ رہو گے تو آئندہ قانونِ الٰہی پر عمل کرو گے۔ مر جاؤ گے تو عمل کرنے والے کہاں سے لائے جائیں گے۔ تو اسلام نے پہلے قوانین کو فطرت کے مطابق بنایا اور اگر کبھی وہی قانون کسی بنیاد پر فطرت سے ٹکرانے لگا تو اسلام نے فطرت کی آواز کو آگے بڑھا دیا تاکہ کوئی جگہ ایسی نہ آئے جہاں قانون فطرت سے ٹکرا کے مر جائے۔ اس لئے کہ فطرتِ بشر مرنے والی نہیں ہے۔ قانون فطرت کے ساتھ چلے گا تو زندہ رہے گا، اور فطرت سے ٹکرا جائے گا تو مر جائے گا۔ میں کہاں آپ کو دور لے جاؤں گا۔ بہت سامنے کی مثال اسی سال کی ہے، ابھی سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی کا مسئلہ ہے ایک دو دن نہیں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۹۲ء تک سارا زور، ساری دنیا کی آدھی طاقت کا زور لگا رہا کہ فطرتِ بشر کو کمیونزم سے قریب کر دیا جائے یا اشتراکیت کو فطرت انسانی کے لئے قابلِ قبول بنا دیا جائے۔ انسان کی فطرت یہ برداشت کر لے کہ ہماری ذاتی کوئی ملکیت نہیں ہے ہم سماج کی ملکیت پر زندگی گذار لیں گے۔ اسلحوں کا زور، حکومت کا زور، طاقت کا زور، دنیا کی آدھی قوت کا زور، اتنا زور ستّر اسّی سال تک لگا رہا، مگر ستّر اسّی سال کا زور بھی فطرت کی آواز کو دبا نہ سکا، اور جیسے ہی ایک بندۂ خدا نے فطرت کی آواز کو ذرا سہارا دے دیا ایسا انقلاب آگیا کہ جو نظام کل آدھی دنیا پر قبضہ کئے ہوئے تھا اب وہ نظام خود اپنے ملکوں میں نظر نہیں آرہا ہے۔

توجہ کی آپ نے ؟ روس اور روس سے متعلق ملکوں میں اشتراکیت کی موت اس بات کا کھُلا ہوا اعلان ہے کہ کوئی قانون، فطرت سے ٹکرا کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ تو مجھے ایک لفظ کہنے دیجیے کہ فقط اسّی سال تک اتنا زور لگانے کے بعد فطرت سے ٹکراؤ کی بنیاد پر قانون نہ رہ سکا اور جہاں کوئی زور لگانے والا نہیں ہے۔ وہ قانون چودہ سو برس سے آج تک زندہ ہے۔ حکومتیں اسلام کو نہیں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ فطرت سے ہم آہنگی ہے جو اسلام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اگر فطرتِ انسانی علم کو دوست رکھتی ہے تو اسلام نے طلب العلم کو واجب بنا دیا ہے۔ اگر فطرتِ انسانی سچائی کو پسند کرتی ہے تو اسلام نے صداقت کو واجب قرار دے دیا ہے۔ اگر فطرتِ انسانی جھوٹ کو بُرا سمجھتی ہے تو اسلام نے جھوٹ کو حرام کر دیا ہے۔ اگر فطرت انسانی دوسرے کے مال کو ہاتھ لگانے سے روکتی ہے تو اسلام نے غصب کو حرام کر دیا ہے۔ اگر فطرتِ انسانی دوسرے کی آبرو پر ہاتھ ڈالنے سے روکتی ہے تو اسلام نے بدکاری کو حرام کر دیا ہے۔ جہاں جہاں فطرت نے ناپسندیدگی کا اعلان کیا وہیں اسلام نے حرام ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور جن جن باتوں کو فطرت نے پسند کر لیا اسلام نے اسے واجب یا مستحب بنا دیا۔ اگر فطرت یہ کہتی ہے کہ جو محسن ہے اس کا شکریہ ادا کرو تو اسلام نے عبادت کو واجب کر دیا۔ اگر فطرت نے کہا کہ جو انعام دینے والا ہے اس کے سامنے سر جھکاؤ تو اسلام نے سجدۂ پروردگار کو لازم قرار دے دیا۔ جہاں جہاں فطرت نے پسندیدگی کا اعلان کیا وہیں اسلام نے فرائض قرار دیے، اور جہاں فطرت نے ناپسند کر دیا اسلام نے اسی کو حرام بنا دیا۔ بس فرق اتنا تھا کہ چونکہ فطرت کے پہلو میں خواہشات بیٹھے ہوئے تھے ــ توجہ کریں ــ فطرت کے پہلو میں خواہشات بیٹھے ہوئے تھے، یہ بے چارہ انسان سمجھ ہی نہیں پاتا تھا کہ فطرت کا تقاضا کیا ہے، اور خواہش کا تقاضا کیا ہے۔ اور اکثر دھوکہ کھا جاتا تھا۔ کبھی فطرت کو خواہش کہتا تھا اور کبھی خواہش کو فطرت کہتا تھا ورنہ اگر خواہشات کا حملہ نہ ہوتا تو شاید شریعت کی کوئی

ضرورت ہی نہ ہوتی، فطرت خود انسان کو راستہ پر لانے کے لئے کافی ہوتی۔ نہ شریعت، نہ انبیاء، نہ مرسلین، نہ آئمہ۔ مگر فطرت کے پہلو میں بیٹھی ہوئی خواہش قدم قدم پر گمراہ کر رہی ہے۔ اپنے کو فطرت بنا کے پیش کر رہی ہے۔ اپنے فعل کو عقل بنا کے پیش کر رہی ہے۔ اپنے کو شعور بنا کے پیش کر رہی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کوئی درمیان میں آئے جو یہ آپس کے اختلاف کو دور کرے، ایک دوسرے کو مخلوط نہ ہونے دے۔ فطرت کی آواز کو الگ کرے، خواہش کے تقاضہ کو الگ کرے۔ یہی کام شریعت نے کیا۔ یہی کام مرسلین نے کیا۔ یہی کام آئمہ نے کیا اور یہی کام ہر وہ آدمی کر سکتا ہے جس کی فطرت خواہشات سے مخلوط نہ ہوتی ہو۔ نہیں توجہ کی آپ نے۔ اگر بتانے والے کے یہاں بھی فطرت اور خواہش دونوں کا گذر رہے گا تو وہ خود بھی دھوکہ کھاتا رہے گا۔ وہ لوگوں کو سمجھائے گا کیا۔ بتانے والے کے لئے شرط ہے کہ اس کے پاس فطرت کے تقاضے ہوں، خواہش کے تقاضے نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے جس کو رسول بنا کے بھیجا، کہا "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى" یہ تو اپنی خواہش سے بولتا بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کے بیان پر بھی خواہش کا قبضہ ہو گیا تو اس کا بیان بھی فطرت کی آواز نہ بنے گا خواہش کی آواز بن کر رہ جائے گا۔

بس یہ ایک مختصر تمہید تھی اس معروف اور منکر کو پہچاننے کے لئے۔ اسکے بعد دو جملے اصل موضوع کی وضاحت کے لئے، اور یہ بھی ایک لطیف مرحلہ ہے۔ اسلام نے جو واجبات ہمارے لئے قرار دیئے ہیں ان کا نام کیا ہے "امر بالمعروف" نیکیوں کا حکم دینا۔ امر کے معنی ہیں حکم۔ "نہی عن المنکر" بُرائیوں سے روکنا۔ اگر چہ ہم نے بھی دینیات میں یہی لکھا ہے کہ "نیکیوں کی ہدایت دینا"۔ "بُرائیوں سے روکنا۔ لیکن امر کے معنی ہدایت دینے کے نہیں ہے، یہ خالی بچّوں کو سمجھانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ کہیں بچّوں میں حکم دینے کی ادا نہ پیدا ہو جائے۔ ورنہ امر کے معنی ہیں حکم دینا۔ تو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے "نیکیوں کا حکم دینا"۔ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے

"برائیوں سے روکنا"۔ آپ نے ابھی امر و نہی کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانا۔ ہر انسان اندر سے یہ چاہتا ہے کہ مجھے ایسا شرف، ایسا مرتبہ مل جائے کہ میں حکم دوں اور لوگ عمل کریں۔ مگر کیا کرے بے چارہ، نہ اس کے ہاتھ میں حکومت ہے، نہ اس کے ہاتھ میں اقتدار ہے، نہ اس کے پاس کوئی قوت ہے۔ یہ ایک حسرت ہے جو دل ہی دل میں رہ جاتی ہے۔ کوئی آدمی دنیا میں ایسا نہیں ہے جو آمر نہ بننا چاہتا ہو، جو حاکم نہ بننا چاہتا ہو۔ اس کی مثال ہر گھر میں صبح و شام آپ دیکھتے ہیں کہ حکومت ہاتھ نہیں آئی، اقتدار نہیں ملا، ملک نہیں، صوبہ نہیں ہے، شہر نہیں، محلہ نہیں ہے۔ حسرت دل میں ہے کہ مجھے بھی آمریت نصیب ہو جائے تو اس آمریت کا مظاہرہ کہاں کریں۔ چھوٹا بچہ دو برس کا، تین برس کا، چار برس کا کچھ نہیں سمجھتا۔ لیکن آپ کیا کریں انسان اپنی حسرت آمریت نکالنا چاہتا ہے۔ اِدھر آؤ، اُدھر جاؤ۔ سُن رہے ہیں آپ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ آپ ہی کا حال زار ہے۔ یہ میری ہی زندگی ہے کہ چھوٹا بچہ کچھ سمجھے یا نہ سمجھے مگر مسلسل اس پر آرڈر پر آرڈر دیئے جا رہے ہیں۔ یہ کام کرو، یہ کام نہ کرو۔ اِدھر آؤ، اُدھر جاؤ، اِدھر نہ جاؤ، اُدھر چلے جاؤ۔ یہ کیا ہے انسان کے اندر جو آمریت پائی جاتی ہے یہ حسرت کہاں نکالے۔ مجھ سے کہے گا میں سُنوں گا ہی نہیں۔ میں آپ سے کہوں گا آپ برداشت ہی نہ کریں گے۔ کسی بڑے سے کہے گا کوئی قبول نہ کرے گا۔ ملک کا اقتدار اپنے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تو کیا کرے چھوٹا سا ملک جو خدا نے دے دیا ہے چار بچّوں کا ساری آمریت کا مظاہرہ وہیں ہو رہا ہے۔ اگر کبھی بس چلتا ہے تو بچوں سے آگے بڑھ کے ہمّت کر کے دو چار اوامر اور نافذ کر دیتے ہیں۔ مگر جب دیکھا حالات ٹھیک نہیں ہیں تو وہیں پر احکام واپس لے لیتے ہیں۔ لیکن ہر انسان میں اندر سے یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ میں حکم دوں اور لوگ عمل کریں۔ اس سے کوئی آدمی خالی نہیں ہے۔ نہ عالم نہ جاہل۔ نہ غریب نہ امیر۔ کسی کو حالات نصیب ہوتے ہیں، کسی کو نہیں ہوتے ہیں۔ مگر یہ تڑپ ہر ایک کے اندر پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی صاحبِ اقتدار ہے اور اس کے پاس یہ صلاحیت

موجود ہے تو وہ اپنی حسرت نکال لیتا ہے، ورنہ اگر صاحبِ اقتدار نہیں ہے تو بے چارہ ہی رہ سکتا ہے۔

قصّہ آپ نے سُنا ہوگا کہ جب بادشاہ وقت کا اقتدار زائل ہوا اور اسے گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا تو جیل میں ڈالنے والوں نے سوال کیا کہ آپ کی تمنّا اور آرزو کیا ہے؟ آپ جیل میں کیا چاہتے ہیں۔ کھانا پینا غذا اچھا سامان راحت، تکلیف کیا چاہتے ہیں؟ کہا مجھے کچھ نہیں چاہیئے، چند بچے لاکر بٹھا دیجئے پڑھانے کے واسطے۔ جیسے اب انھیں شوق پیدا ہوا ہے تعلیم دینے کا۔ جب پورے ملک کا اقتدار ہاتھوں میں تھا تب تعلیم نہیں یاد آئی تھی۔ تب یہ جاہل تھے اب جیل میں جاکر قابل ہو گئے ہیں۔ کسی نے کہا آپ کو یہ شوق کیوں پیدا ہو گیا؟ کہا کیا کروں عادت پڑی ہوئی ہے حکم دینے کی۔ عادت پڑی ہوئی ہے احکام نافذ کرنے کی۔ جیل میں جانے کے بعد تو خالی احکام سُننا پڑیں گے اب حکم دینے کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن اگر یہ چار پانچ بچّے بطور شاگرد مل جائیں تو کم سے کم حسرتِ اقتدار تو پوری ہو جائے، حکم دینے کی حسرت تو نکل جائے۔

اگر آپ میری باتوں پر غور کر رہے ہیں تو یہ یاد رکھئے گا کوئی دنیا کا انسان ایسا نہیں ہے جس کے اندر یہ حسرت نہ پائی جاتی ہو کہ میں حکم دوں لوگ عمل کریں۔ کسی کے لئے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کسی کے لئے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر اندر سے سب میں یہ خواہش پائی جاتی ہے۔ اسلام نے ہر مسلمان کی اس خواہش کو پورا کر دیا کہ جب اس پر فریضہ عائد کیا تو فریضہ کا نام نہ تبلیغ رکھا، نہ بیان رکھا، نہ تشریح رکھا، نہ ہدایت رکھا۔ فریضہ کا نام رکھا "امر بالمعروف" نیکیوں کا حکم دینا۔ یعنی اگر تمھیں حکم دینے کا شوق ہے تو ہم مسئلہ کو تمھارے شوق پر نہیں رکھیں گے ہم مسئلہ کو فریضہ بنا دیں گے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حکم دے اب تو آمریت کی حسرت نکل گئی، اب تو حکم دینے کی حسرت نکل گئی۔ مگر ایک بات یاد رکھنا جو دنیا میں آمر بن جاتے ہیں وہ جو چاہتے ہیں حکم دیتے ہیں، اس لئے کہ اقتدار ان کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ لیکن ہم مسلمان کو ایسا آمر نہ بننے

دیں گے۔ حاکم تو بنادیں گے مگر شرط یہ ہے کہ جب حکم دینا تو نیکیوں کا حکم دینا، برائیوں کا حکم نہ دینا۔ دنیا کی آمریت میں اور اسلام کی آمریت میں یہی فرق ہے کہ دنیا میں آمریت جو چاہے حکم دیدے مگر اسلام کی آمریت اس شرط کی ہے کہ وہ کہے جو صحیح ہو۔ وہ کہے جو فطرت کے مطابق ہو۔ وہ کہے جو قانون الٰہی کے مطابق ہو۔ اس سے ہٹ کر کسی کو حکم دینے کا حق نہیں ہے۔ اور ایک دوسرا جملہ بھی اضافہ کر دوں تاکہ میں جہاں آپ کے ذہنوں کو لے جا رہا ہوں آپ میرے ساتھ چلیں تو آپ کو لطف آئے گا۔

اسلام نے ہر مسلمان کو حق حکم دے دیا کہ حکم دو مگر کیسے حکم دو؟

ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے، اسے آپ حکم دیں کہ نماز پڑھو۔ نہیں۔ ایک آدمی روزہ رکھ رہا ہے اس سے آپ کہیں کہ روزہ رکھو۔ لوگ آپ ہی کو دیوانہ کہیں گے، اندھے ہو گئے دیکھتے نہیں کہ پڑھ رہا ہے۔ دیکھتے نہیں کہ روزہ رکھ رہا ہے۔ تو آپ حکم نماز کس کو دیں گے جو نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔ روزہ کا حکم کس کو دیں گے جو روزہ نہیں رکھتا ہے۔ شراب سے کسے روکیں گے جو شراب پی رہا ہے۔ بدکاری سے کسے روکیں گے جو بدکاری کر رہا ہے۔ تو نہی عن المنکر اس کے لئے ہے جس کی زندگی میں منکر ہے۔ امر بالمعروف اس کے واسطے ہے جس کی زندگی میں نیکیاں نہیں ہیں۔ تو جو نیکی نہیں کرتا ہے اسے حکم دو، اور جو برائی کرتا ہے اسے روکو۔ ہم نے تمھیں روکنے اور حکم دینے کا حق دے دیا ہے۔ مگر یہ حق ہر ایک جگہ استعمال نہ کرنا۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسی بات کا حکم دینا جو صحیح ہو، اور دوسری شرط یہ ہے کہ اسی کو حکم دینا جو نہ کر رہا ہو۔ جو نیکی نہیں کرتا اسے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے اسے روکنا جو برائی کر رہا ہو تاکہ تمھیں اسلام کا یہ مزاج معلوم ہو جائے کہ ہم کسی کو اس وقت حاکم بناتے ہیں جب دو باتیں پیدا ہو جائیں۔ سماج میں عیب پیدا ہو جائے کہ نیکیاں نہ ہوں تو اس میں یہ کمال ہو کہ نیکیوں کو پہچان کے نیکیوں کا ہی حکم دیتا ہو۔ جسے حکم دیا جائے وہ نیکیوں سے الگ ہو، اور جو حکم دینے والا ہو وہ نیکیوں والا ہو۔ جب ایسا ہو جائے گا تو ہم آمریت کو برداشت کر لیں گے۔ ورنہ جب نظام الٹ جائے گا کہ شراب پینے والا، زنا کرنے والا،

بُرائی کرنے والا، دینِ خدا کا مذاق اُڑانے والا وہ اسے حکم دے گا جو نبیؐ کا نواسہ ہوگا، دین کا ذمہ دار ہوگا، قرآن کا مفسر ہوگا تو اسلام ایسی حاکمیت کو ہرگز برداشت نہ کرے گا۔

اس پوری تمہید کو آپ اپنے ذہن عالی میں محفوظ رکھیں تاکہ میں اس کے بعد نتیجہ آپ کے سامنے گذارش کرسکوں۔ پروردگار عالم نے ہر مسلمان کو حکم دیا کہ تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دو۔ لوگوں کو بُرائیوں سے روکو یہ تمہاری ذمہ داری ہے، اور یہ ذمہ داری وہ ہے جو اسلام کے واجبات میں ہے۔ ہر مسلمان کے لئے فرض ہے کہ وہ انسان کو نیکیوں کا حکم دے، بُرائیوں سے روکے۔

واجبات کے معنی کیا ہیں؟ یعنی حکمِ خدا یہ ہے کہ تم حکم دو۔ جیسے حکمِ خدا ہمارے لئے ہے کہ نماز پڑھیں۔ حکمِ خدا ہے کہ روزہ رکھیں۔ حکمِ خدا یہ ہے کہ حج کریں۔ اسی طرح حکم خدا یہ ہے کہ ہم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیں یعنی ہماری دو حیثیتیں ہیں جب بے عمل لوگوں کے سامنے آتے ہیں تو ہم حکم دینے والے ہوتے ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہوتی ہے کہ ہم لوگوں کو حکم دیں نیکیوں کا۔ ہم ہوں گے حاکم۔ یہ سب جو بے عمل ہوں گے یہ سب ہوں گے ہمارے محکوم۔ لیکن جب ہم خدا کے سامنے گئے تو خدا نے کہا، یہ ہے تمہارا فریضہ۔ یعنی ہم نے تم کو حکم دیا ہے کہ تم حکم دو۔ یعنی اسلام میں ہر مسلمان بہ یک وقت حاکم بھی ہے، محکوم بھی ہے اور یہ تنہا ہمارا آپ کا حال نہیں ہے سوائے پروردگار کے کوئی ایسا نہیں ہے جو صرف حاکم ہو محکوم نہ ہو۔ یہ ہمارا آپ کا مذہب ہے اسے پہچانیں آپ۔ سوائے پروردگار کے اس کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے، جو صرف حاکم ہو، اور محکوم نہ ہو۔ یہ تنہا خدا ہے جو حاکم ہے اور کسی کا محکوم نہیں ہے۔

اس کے بعد جو بھی ہے چھوٹا انسان، بڑا انسان، جاہل، عالم، صاحب دولت، فقیر، حاکم، رعایا۔ حد یہ ہے کہ امام، نبی، افضل مرسلین، سید الانبیاء، جتنے بھی ہیں سب بہ یک وقت حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی ہیں۔ سنئے قرآنی آیتیں، جس دن پیغمبرؐ کو پہلے دن تبلیغ اسلام کا حکم دیا گیا، اُس دن خدا نے کیا کہا "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ"، پیغمبرؐ جس

بات کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اس کا اعلان کر دو۔ اب نبی جب اعلان کرے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ آپ مسلمان ہو جائیں گے۔ یہ کلمہ پڑھیں گے۔ وہ کلمہ پڑھیں گے۔ محکوموں کی دنیا آباد ہو گی۔ یہ سب ہوں گے پیغمبر کے محکوم۔ لیکن جب خدا کہہ رہا تھا تم اس کا اعلان کرو جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے تو اس کے معنی کیا ہوئے کہ تم میرے محکوم ہو۔ پیغمبرؐ! تم میرے محکوم ہو، میں نے تم کو حکم دیا ہے کہ اعلان کرو۔ تو خدا کے سامنے نبیؐ محکوم اور دُنیا کے سامنے حاکم۔ یہ پہلا دن تھا اس کے بعد جب سرکارِ دو عالمؐ نے کارِ تبلیغ شروع کر دیا۔ مصائب سامنے آئے۔ مشکلات سامنے آئے۔ کانٹے بچھ رہے ہیں۔ پتھر مارے جا رہے ہیں۔ گالیاں دی جا رہی ہیں۔ بُرا بھلا کہا جا رہا ہے۔ کوڑا پھینکا جا رہا ہے۔ تو پروردگار نے کہا میرے حبیب! ان حالات سے گھبرائیے گا نہیں۔ "فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ" ویسے ہی سیدھے راستہ پر چلتے رہیئے گا جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ "حکم دیا گیا ہے" کے معنی کیا ہیں؟ کہ میں حاکم آپ محکوم۔ یہ دوسرا موقع۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے کہا تھا تم مسلمان نہیں ہو۔ اے مسلمانو! کلمہ پڑھ کے نہ سوچنا کہ تم ہی مسلمان ہو۔ تم سے پہلے تو میں خود ہی مسلمان ہوں۔ مسلمان کے معنی کیا ہیں؟ اطاعت گذار۔ تم سے پہلے میں مسلمان ہوں "مَا أُمِرْتُ" مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کس بات کا؟ "بِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ" کہ سب سے پہلا اطاعت گذار میں بنوں۔ "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ" آخر میں "بِذٰلِكَ أُمِرْتُ" اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ غور کیا آپ نے؟۔ جو کل کائنات سے افضل تھا۔ جو صاحبِ معراج تھا، جس کی نعلین عرشِ اعظم تک گئیں خدا کے سامنے وہ بھی محکوم ہے۔ بار بار خدا کہہ رہا ہے تمھیں میں نے حکم دیا ہے۔ جو حکم دیا ہے وہ کرو۔ جو حکم دیا گیا ہے وہ بیان کرو۔ جو حکم دیا گیا ہے اس کا اعلان کرو، تاکہ دُنیا کو اندازہ ہو جائے کہ جو کائنات کا حاکم ہے وہ بھی خدا کے سامنے محکوم ہے۔

اور آگے بڑھیں۔ انبیاء میں سرکارِ دو عالمؐ کے بعد جس نبی کا مرتبہ ہے وہ کون ہیں؟ وہ جناب ابراہیمؑ ہیں درجہ کے اعتبار سے، مرتبہ کے اعتبار سے۔ سب سے بالاتر مرتبہ ہے سرکارِ دو عالمؐ کا اور سرکارِ دو عالمؐ کے بعد انبیاء میں دوسرا درجہ جناب ابراہیمؑ کا

ہے۔ جناب ابراہیمؑ نے جناب اسمٰعیلؑ سے کہا کہ بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں، بتاؤ کہ تمھاری کیا رائے ہے۔ صبح و شام سُنتے رہتے ہیں آپ کبھی سوچئے بھی اسمٰعیلؑ نے کیا کہا؟ "یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ"۔ بابا آپ وہ کریں جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ حکم دینے والا کون ہے؟ خدا۔ محکوم کون ہے؟ ابراہیمؑ۔ اب آپ کو اندازہ ہوا کہ سوائے خدا کے کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تنہا حاکم ہو اور محکوم نہ ہو۔ بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ معبود کا محکوم رہے اور یہیں سے تو اسلام کا امتیاز ثابت ہوتا ہے کہ ساری دنیا کے حاکم وہ ہیں جو خدا سے ہٹ کے حاکم بن جاتے ہیں خدا کو بھول کے حاکم بن جاتے ہیں تو حاکم ہی حاکم رہ جاتے ہیں۔ لیکن اسلام کا ہر حاکم خدا کا بنایا ہوا ہے تو میرے سامنے آئے گا، آپ کے سامنے آئے گا تو حاکم ہو کر آئے گا۔ لیکن خدا کے سامنے جائے گا تو محکوم بن کر جائے گا۔ انبیاءؑ کی یہی شان، مرسلین کی یہی شان، خاصانِ خدا کی یہی شان، اولیاء اللہ کی یہی شان۔ خدا کے لئے سب محکوم اور قوم کے لئے سب حاکم۔ وہی حاکم جس کو خدا نے حاکم بنایا ہے اس کے علاوہ دنیا میں کوئی حاکم نہیں ہے۔ اسی لئے خدا نے "اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ"، رسولؐ کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔ یہ اعلان ہم نے واجب کی ہے اس اطاعت کا ہم نے حکم دیا ہے۔ تو اب آپ نے اندازہ کر لیا کہ یہ امر زیادہ ہے کہ سب کو اسلام نے حاکم بنایا ہے مگر محدود طریقہ سے نیکیوں کا حکم دینے کے لئے۔ تم حاکم ہو کُل کائنات کے اور تمھارے واسطے پیغمبرؐ حاکم ہیں اور پیغمبرؐ کے واسطے خدا حاکم ہے۔

تو پہلی حاکمیت خدا کی ہے۔ خدا نے حاکم بنایا نبی اور امامؑ کو۔ نبیؐ اور امام حاکم ہیں کُل کائنات کے لئے۔ یہ ہے اسلام میں امر کا رشتہ۔ یہ ہے اسلام میں حکم کا رشتہ۔ اور یہ سلسلہ یونہی آگے بڑھا۔ اگر اتنی باتیں آپ کے ذہن عالی میں محفوظ ہو گئی ہیں تو اب نتیجہ کو پہچانئے۔ سرکارِ دو عالمؐ کی شان یہ ہے کہ حضور لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

ایک شخص پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اُس کو یہی بات گوارہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی

ہمیں نیکی کا حکم دے اور بُرائیوں سے روکے اور اسلام نے اسی کو فریضہ بنا دیا ہے۔ اُس نے کہا اگر ہر آدمی یہی کام شروع کردے گا تو لوگ جینے نہیں دیں گے۔ اب بھی لوگوں کو یہی پریشانی ہے کہ آخر آپ سے کیا تعلق ہے، کوئی کچھ کررہا ہے کرنے دیجئے۔ ہاں بیشک اگر کوئی ہوگا تو چھوڑ دیں گے۔ اسلام کی فکر میں اور دنیا کی فکر میں یہی تو ایک فرق ہے کہ دنیا والے سمجھتے ہیں کہ ان سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ اسلام کہتا ہے اگر تم مسلمان ہو تو ہر مسلمان سے تمہارا تعلق ہے۔ آپ کا بھائی اگر کارنش پر ڈوب رہا ہو تو کبھی آپ نہ کہیں گے کہ ڈوبتا ہے تو ڈوبنے دیجئے ہم سے کیا تعلق ہے۔ چاہے تیرنا جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ تقاضائے فطرت یہ ہے کہ آدمی چھلانگ لگادے۔ کیوں؟ اپنا بھائی ڈوب رہا ہے ہم نہ ڈوبنے دیں گے۔ غور کررہے ہیں آپ؟ یہ کاہے کا تقاضا ہے بھائی ہونے کا۔ قرآن نے پہلے ہی کہا "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ"، ہم نے سارے مومنین کو بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ اب اگر تم مومن ہو تو کسی مومن کے بارے میں نہ کہنا کہ ڈوبتا ہے تو ڈوبنے دو ہم سے کیا تعلق ہے۔ اور اگر تم نے سمندر میں ڈوبتے ہوئے بھائی کو بچا لیا اور گناہوں میں ڈوبتے ہوئے بھائی کو نہ بچایا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سمندری ہلاکت کو ہلاکت سمجھتے ہو، اور جہنمی ہلاکت کو ہلاکت نہیں سمجھتے ہو۔

آپ میری طرف متوجہ رہیں یہ بڑا حساس مسئلہ ہے ہماری آپ کی زندگی کا اور سرکار دو عالمؐ کے فضل و کمال کا۔ دنیا میں جب کوئی خطرہ سامنے آتا ہے تو ہم اپنے ہر عزیز کو خطرہ سے بچانا چاہتے ہیں اور مذہب میں جب کوئی خطرہ سامنے آتا ہے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے وہ خطرہ کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہماری نگاہ میں دنیا کی قیمت زیادہ ہے۔ مذہب کی قیمت کم ہے۔ میں نے کبھی یہ بات بطور مزاح کہی تھی، لیکن یہ مزاح نہیں ہے ایک حقیقت ہے۔ اگر کل کسی مقام پر صبح کے وقت ناشتہ پر سارے مومنین مدعو ہو جائیں۔ کوئی آدمی مرد مومن کھڑا ہو کر یہ اعلان کردے کہ کل صبح سارے مومنین غریب خانہ پر آکے ناشتہ فرمائیں، اور میرے ساتھ دس آدمی رہتے ہیں یا میرے فلیٹ میں، یا میرے کمرہ میں، یا میرے ڈیرے میں، یا میرے مکان میں

جہاں میں رہتا ہوں دس آدمی رہتے ہیں دیر میں سوئے سب سوتے رہ گئے اور میں صبح سویرے سات بجے ناشتہ کا ٹائم تھا اُٹھا اور خاموشی سے چلا گیا ناشتہ پر، اور جب پلٹ کے آیا تو میں نے خبر کی کہ بھئی ناشتہ بہت عمدہ تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنا زبردست انتظام۔ سب خوش ہو گئے ماشاء اللہ مبارک ہو مبارک ہو۔ یہی ہوگا؟ نہیں بلکہ اگر مار پیٹ نہ ہو جائے تو غنیمت ہے۔ اب آئے ہیں خبر سُنانے کے لئے۔ یہ زبان جاتے وقت گونگی ہو گئی تھی۔ اُس وقت مر گئے تھے آپ۔ اُس وقت آپ کو ہوش نہیں آیا تھا۔ ارے ہم سو گئے تھے جگا لیا ہوتا۔ ہم سو گئے تھے اُٹھا لیا ہوتا۔ ہم سو گئے تھے تو بتا دیا ہوتا۔ اب آئے ہیں خبر لے کر پلاؤ اچھا تھا۔ اور زردہ خراب تھا۔ بات صحیح ہے یا نہیں۔ اور اگر کسی کو اعتبار نہ ہو تو میں اتنا بھی ایثار کر سکتا ہوں کہ ایک جگہ رہنے والے پانچ آدمیوں کو بلالوں اور تجربہ کر لیجئے۔ آپ ہمیں کیوں نہ لے گئے؟ ہمیں کیوں نہ جگایا؟ ہمیں کیوں نہ اُٹھایا؟ سب ناراض ہیں۔ لیکن جب صبح موذن کی آواز آئی "حیّ علیٰ خیرِ العمل" اور ہم چلنے لگے۔ ہم نے کہا خدا کی دعوت پر جا رہے ہیں۔ یہ ناشتہ کی دعوت نہیں ہے، بندے کی دعوت نہیں ہے، یہ خدا کی دعوت ہے۔ کل ان کو نہ لے گئے تھے یہ ناراض ہو گئے تھے، آج چھوڑ کے نہ جائیں گے۔ ہم نے کہا اُٹھئے اُٹھئے چلئے دعوت میں جا رہے ہیں۔ کہنے لگے آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے، آپ کو خبر نہیں ہے کہ ہم دیر میں سوئے ہیں؟ ـ نہیں نہیں۔ ایمان پہچانئے ایمان۔ یہ ہے ہمارا بیسویں صدی کا ایمان۔ اگر روٹی کی دعوت میں کوئی کسی کو نہ لے جائے تو ناراض، اور بندگی کی دعوت میں لے جائے تو ناراض۔ اب پہچانا کہ ہمارے ایمان میں روٹی کہاں ہے اور بندگی کہاں ہے۔ ہمارے ایمان میں روٹی کی جگہ کیا ہے اور بندگی کی جگہ کیا ہے۔ روٹی کی اہمیت زیادہ ہے بندگی کی اہمیت کم ہے ـ اور یہی وہ فساد ہے، یہی وہ بُرائی ہے کہ جب آگے بڑھ جاتی ہے تو ایک دن وہ آتا ہے کہ ابتدا میں روٹی کو نماز سے افضل بنا رہا تھا اور آخر میں وہ دن آجاتا ہے جب ملک رے سامنے آجائے تو کسی بندہ خدا کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی ہے یہ اُسی ابتدا کی آخری انتہا ہے۔

اسی لئے اسلام نے امر بالمعروف کو واجب قرار دیا ہے کہ پہلے دن سے سنبھالو، پہلے مرحلہ سے سنبھالو ورنہ اگر ابتدا میں بگڑ گیا تو پھر آخر میں کوئی نہیں سنبھال سکتا ہے۔ مگر میں نے عرض کیا کہ یہ بات آدمیوں کے لئے قابلِ برداشت نہیں ہوتی ہے اور ہم آپ کیا ہیں پیغمبرؐ کے سامنے آ کے اعتراض کر دیا۔

ایک شخص آیا اور گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضورؐ آپ نے جو فرمایا ہے کہ ہر آدمی کو چاہیئے کہ دوسرے کو نیکیوں کا حکم دے، بُرائیوں سے روکے۔ یہ حکم کیوں آپ نے دیا ہے۔ وہ بُرائی کر رہا ہے، وہ جہنّم میں جا رہا ہے اس کو جانے دیجئے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ بھئی آپ بہت سے بہت یہی تو کہیں گے کہ جو نماز نہ پڑھے گا جہنّم میں جائے گا۔ وہ جائے گا آپ تو نہیں جائیں گے۔ جو شراب پیئے گا جہنّم میں جائے گا۔ جا رہا ہے جانے دیجئے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ یہ آپ نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے سر پر جو مسلّط کر دیا ہے کیوں؟ لوگوں کی آزادی چھین لی آپ نے۔ جو جو کچھ کر رہا ہے اپنا انجام خود جا کے دیکھے گا۔ آپ نے مسلمانوں کو مسلمانوں کے سروں پر کیوں لاد دیا ہے؟ ہر آدمی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ وہ اپنے نتیجہ کا ذمہ دار ہے۔ یہ امر و نہی کیا چیز ہے۔ حضورؐ نے عجب جملہ ارشاد فرمایا: کہا بات صحیح کہتے ہو، اگر کبھی تم کشتی میں سفر کرو اور مثلاً پچاس آدمی کشتی میں بیٹھے ہیں۔ ایک آدمی جس جگہ پر بیٹھا ہوا ہے اپنے پیروں کی جگہ پر کشتی میں سوراخ کر رہا ہے۔ ہم ڈوبنا چاہتے ہیں۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں آپ کی جگہ پر نہیں، دوسرے کی جگہ پر نہیں، جہاں بیٹھے ہیں وہاں سوراخ کر رہے ہیں۔ ہم ڈوبنا چاہتے ہیں۔ اُس وقت تم کیا کرو گے؟ کہو گے کہ ٹھیک ہے ڈوبنا چاہتا ہے ڈوبنے دیجئے کیا کرنا ہے؟ کشتی میں سوراخ کر رہا ہے کرنے دیجئے ہم سے کیا مطلب ہے۔ وہ ڈوبے گا۔ وہ مرے گا ہم سے کیا تعلق ہے، یہی کہو گے؟

دیکھئے حضورؐ نے کہاں کس حسّاس نکتہ کو سامنے رکھا ہے اور کہاں انسان کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ فرمایا بتاؤ کیا کرو گے، منع کرو گے یا نہیں؟ آپ بتائیے

آپ کیا کریں گے ؟ اگر ہم آپ اس کی جگہ پر ہوں تو ہم کیا کریں گے ؟ منع کریں گے یا نہیں ؟ کریں گے۔ کیوں منع کریں گے۔ وہ ڈوب رہا ہے ڈوبنے دیجئے آپ سے کیا تعلق ہے۔ آپ کی جگہ پر تو ہاتھ نہیں لگا رہا ہے۔ جہاں خود بیٹھا ہے وہیں سوراخ کر رہا ہے۔ اس نے کہا نہیں حضورؐ۔ منع کریں گے۔ کہا کیوں منع کرو گے؟ ڈوب رہا ہے ڈوبنے دو تم سے کیا تعلق ہے؟ کہا مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر کشتی میں سوراخ ہو گیا تو تنہا ایک ہی نہیں ڈوبے گا پھر سب کو ڈوبنا پڑے گا۔ کہا بس مشکل یہ ہے کہ جب دریا میں کشتی میں بیٹھ گئے تب یہ اندازہ ہوا کہ ایک کا جرم کہاں کہاں اثر کرتا ہے۔ اگر تمھاری نگاہ اتنی ہی بصیر ہوتی کہ جتنا کام کشتی میں کر رہی ہے اتنا ہی کام سماج میں کرتی تو یہ اندازہ ہوتا کہ ایک آدمی کا جرم ایک آدمی کا جرم نہیں ہوتا ہے۔ ایک مجرم پیدا ہوگا' دو مجرم پیدا ہوں گے' چار مجرم پیدا ہوں گے اور ایک دن جرم سارے سماج میں پھیل جائے گا تو ایک دو نہیں ڈوبیں گے سارا سماج ڈوب جائے گا۔ اگر یزید کو اتنا آزاد نہ چھوڑ دیا گیا ہوتا اور مسلمانوں نے پہلے مرحلہ پر روک دیا ہوتا تو اتنا بڑا اقتدار ہوتا نہ اتنے بیعت کرنے والے ہوتے۔ یہ سارا سماج جو ڈوب گیا یہ ایک آدمی کو آزاد چھوڑ دینے کا نتیجہ تھا۔ اسی لئے اسلام نے کہا ہے کہ مجرم کو آزاد نہ چھوڑنا ورنہ تنہا مجرم نہ ڈوبے گا سارے سماج کو ڈبو دے گا۔

عزیزانِ محترم! آپ جانتے ہیں کہ آج کا موضوع ہماری اصطلاح کے اعتبار سے خشک ہے۔ مگر بہر حال پیغمبر اسلامؐ کے فضائل میں شامل ہے اور ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ میں قرآن مجید کی جس آیت کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں اس آیت کا یہ ایک ٹکڑا ہے لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔ جتنی باتیں میں کہہ چکا ہوں ایک آخری بات اور سُن لیں تاکہ یہ بات تمام ہو جائے۔ سارے واقعات نہیں عرض کر سکتا۔ اگر واقعات پڑھنا ہیں تو وہ کتابیں پڑھیں جن میں یہ واقعات لکھے گئے ہیں۔ میری بھی ایک کتاب چہاردہ معصومینؑ کے حالات میں ہے' اگر آپ کو مل جائے تو وہاں آپ دیکھیں گے اور اندازہ ہوگا کہ آئمہ طاہرینؑ نے اور پیغمبر اسلامؐ نے اس امر ونہی کے

فریضہ کو کیسے ادا کیا ہے اور یہ ہر مسلمان کی ذمّہ داری ہے کہ دوسرے مسلمان کو سنبھالے، ڈوبنے نہ دے، تباہ نہ ہونے، برباد نہ ہونے دے، اپنا بھائی سمجھے، اپنا عزیز سمجھے، غیر نہ سمجھے۔ مگر اس بات کا خیال رکھے کہ جس کام کے لئے کہہ رہا ہے وہ کام ہوجائے، رُکنے نہ پائے۔ یعنی اگر کوئی بے نمازی ہے تو آپ اسے حکم دیں مگر ایسے کہ نمازی ہوجائے۔ ایسے نہیں کہ اگر کبھی نماز پڑھنے کا ارادہ ہو تو وہ ارادہ بھی ملتوی ہوجائے۔ بعض لوگوں کی تبلیغ کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ اب جو مجلس میں سُن لیا کہ امر و نہی واجب ہوگیا ہے تو جیسے ہی مجلس تمام ہوئی۔ ایک ایک کا ہاتھ پکڑا۔ شرم نہیں آتی ہے۔ آپ نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ تاکہ سارا مجمع سمجھ لے کہ یہ نمازی ہیں اور وہ تارک الصّلوٰۃ ہے۔ اس نے بھی کہا کہ اب تو عزّت چلی ہی گئی ہے۔ اب پڑھ کے کیا کریں گے۔ جب سارے مجمع کو معلوم ہی ہوگیا کہ ہم تارک الصلوٰۃ ہیں، بھرے مجمع میں توہین ہو ہی گئی تو اب پڑھ کے کیا کریں گے۔ تو بجائے اس کے کہ نماز سے قریب آتا اگر آنے کا ارادہ بھی تھا تو واپس چلا گیا۔ یہ امر بالمعروف نہیں ہے۔ یہ فریضہ کی ادائیگی نہیں ہے۔ یہ جُرم ہے، یہ گناہ ہے، یہ معصیت ہے، یہ اختیار آپ کو نہیں دیا گیا ہے کہ آپ کسی مردِ مومن کی توہین کریں۔ آپ کو حکم دینے کا حکم دیا گیا ہے توہین کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

یہ بڑا احساس نکتہ ہے عزیزو! یاد رکھئے گا بد سے بدتر مسلمان ہو، بدترین مجرم ہو، راہ راست پر لانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ مگر توہین کرنے کا حق آپ کو نہیں دیا گیا ہے۔ سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی میں ایک مثال ہے۔ خدا جانتا ہے کہ پیغمبرؐ نے کیسے قوم کی تربیت کی ہے اور کیسی قوم کو برداشت کیا ہے۔ میں جو واقعہ آپ کے سامنے گذارش کرنے جا رہا ہوں میں جانتا ہوں کہ مجلس کے خاتمہ کے بعد بہت سے لوگ کہیں گے کہ مولانا کو ایسے واقعات کو منبر سے نہیں پڑھنا چاہیئے یا ایسے الفاظ منبر سے نہیں بولنا چاہیئے۔ ابھی ہم اُس دنیا میں آباد ہیں کہ الفاظ کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ پیغمبرؐ سے بات کرنے آیا ہے ہمارے مخاطب تو آپ ہیں۔ آپ کے سامنے تو میں بیٹھا ہوں پیغمبرؐ تو نہیں ہیں مگر وہ پیغمبر سے بات کرنے کے لئے آیا ہے۔ پیغمبرؐ کہتے ہیں جو بات ہو صریح ہو، واضح

ہو۔ جو کہنا چاہتے ہو کہو تا کہ میں جواب دے سکوں۔ لفظوں کا تکلّف کیا ہے۔ جھوٹی تہذیب سے فائدہ کیا ہے۔ مہمل آداب سے فائدہ کیا ہے کہ آدمی بے ادب رہ جائے اور سمجھے بڑے مہذب ہیں۔

ایک شخص آیا پیغمبر کی خدمت میں اور آنے کے بعد کہتا ہے سرکارِ دو عالمؐ! میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ اپنے نفس پر کنٹرول کروں۔ اپنے نفس پر قابو پاؤں مگر جو کوئی عورت سامنے سے گذر جاتی ہے یا جب کسی عورت کا خیال آجاتا ہے تو نفس بہکنے لگتا ہے۔ آپ نماز کے لئے کہہ دیں میں پڑھوں گا۔ روزہ کے لئے کہئے جو کہئے سب کروں گا لیکن آپ مجھے زنا کرنے کی اجازت دید یجئے۔ سُن رہے ہیں آپ؟ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ یہی سوچ رہے ہیں کہ یہ الفاظ منبر سے نہیں بولنا چاہئیں۔ مگر وہ پیغمبرؐ کے سامنے بولنے کے لئے آیا ہے اور پیغمبرؐ یہ نہیں کہتے کہ تو بیہودہ ہے نالائق ہے یہ الفاظ نہیں استعمال کرنا چاہیئے بلکہ آپ نہایت ہی متانت، سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ اس کی گفتگو سُن رہے ہیں۔ فرمایا کیا چاہتے ہو؟ کہا حضورؐ مجھے اجازت دیجئے۔ اور کسی جرم کی اجازت نہیں چاہتا۔ چوری نہیں کروں، شراب نہیں پیوں گا۔ مگر نفس پر کنٹرول نہیں ہوسکتا ہے۔ بس مجھے اجازت دید یجئے۔ فرمایا کوئی بڑی بات نہیں ہے جو رحمۃ للعالمین ہے وہ ہر ایک کے مسئلہ کو حل کرے گا۔ مگر یہ اجازت تنہا تم ہی کو کیوں دی جائے باقی لوگ کیا میرے اُمتی نہیں ہیں؟ باقی کیا مسلمان نہیں ہیں؟ باقی لوگوں سے کیا مجھے محبت نہیں ہے؟ کیا یہ میرے چاہنے والے نہیں ہیں؟ میں اگر اجازت دوں گا تو سب کو دوں گا۔ وہ سوچ رہا ہے کہ حضورؐ کیا فرما رہے ہیں۔ حضورؐ نے کہا اور واضح کر دوں۔ ظاہر ہے جب میں کسی کو بدکاری کی اجازت دوں گا تو یہ تو میں جانتا ہوں کہ وہ بدکاری اپنی ماں کے ساتھ نہیں کرے گا۔ اپنی بہن کے ساتھ نہیں کرے گا۔ اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں کرے گا۔ کرے گا تو غیر کے ساتھ۔ تو جب میں سب کو اجازت دوں گا تو کوئی ایسا بھی ہوگا جو تیری ماں کے ساتھ بدکاری کرے گا۔ تو راضی ہے؟ کہا حضورؐ یہ تو برداشت نہیں کروں۔ کہا کوئی ایسا بھی ہوگا جو تیری بیٹی کے ساتھ بدکاری کرے گا تو راضی ہے؟

کہا حضورؐ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کہا کوئی ایسا بھی ہو گا جس کے ناجائز تعلقات تیری بہن کیساتھ ہوں گے تو راضی ہے؟ کہا حضورؐ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ فرمایا جب اپنی ماں بہن بیٹی کے واسطے راضی نہیں ہے تو اپنے واسطے یہ اجازت لینے کیوں آیا ہے کہ جس کی ماں کو چاہے غلط نگاہ سے دیکھے؟ جس کی بہن کو چاہے غلط نگاہ سے دیکھے؟ جس کی بیٹی کو چاہے غلط نگاہ سے دیکھے؟ یہ حق تجھے کیسے دے دیا جائے گا؟ اگر اپنے واسطے اس مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس یہ سُننا تھا لرز کے قدموں پر گر پڑا۔ کہا حضورؐ! اس نکتہ کی طرف تو میرا ذہن گیا ہی نہیں تھا، کہ اگر کوئی دوسرے کی ماں ہے تو کوئی میری ماں بھی ہے۔ اگر کوئی دوسرے کی بہن ہے تو کوئی میری بہن بھی ہے۔ اگر کوئی دوسرے کی بیٹی ہے تو کوئی میری بیٹی بھی ہے۔ اب سرکارؐ آپ پروردگار سے دُعا فرمائیں کہ پروردگار میرے نفس کو پاکیزہ بنادے کہ ایسے فاسد خیالات آنے ہی نہ پائیں۔

عزیزو! انسان توبہ کرے تو یوں توبہ کرے۔ راہ راست پر آئے تو یوں راہ راست پر آئے۔ سرکارِ دو عالمؐ نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ پروردگار! یہ تیرا بندہ بھٹک گیا تھا، اب راستہ پر آ رہا ہے۔ خدایا! اس کے نفس کو اتنا پاکیزہ بنادے کہ حرام کا خیال ہی اس کے نفس میں نہ آنے پائے۔ وہ کہتا ہے کہ میری ساری زندگی گذر گئی اور پوری زندگی میں کبھی حرام کا خیال بھی آنے نہیں پایا اس لئے کہ حضورؐ نے ایک حساس نکتہ سمجھا دیا۔

واقعہ تو پیغمبرؐ کے زمانے کا تھا مگر عزیزو! میں آج آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ سماج میں جو بھی بھٹکے ہوئے افراد ہیں، جو بھی غلط نگاہ ڈالنے والے ہیں اور بہکنے والے ہیں سب کو آپ یہ ایک نکتہ سمجھائیں کہ اگر آج تمہیں دوسری عورت پر نگاہ ڈالنے کا شوق ہے تو کل کوئی ایسا بھی پیدا ہو گا جو تمہارے یہاں کے گھر والوں پر غلط نگاہ ڈالے گا۔ جب اس بے حیائی کے لئے تیار ہو جانا تب اس جُرم کا ارادہ کرنا۔ لیکن اگر تم میں غیرت پائی جاتی ہے تو دوسرا بھی صاحب غیرت ہے۔ حضورؐ نے

ایک ایسا راستہ بتا دیا ہے کہ جہاں تک یہ راستہ بڑھتا جائے گا یہ پیغام انسانی نفس کی اصلاح کرتا چلا جائے گا۔ پیغمبرؐ نے بیہودہ کہہ کر محفل سے اٹھا دیا نہ بدتمیز کہہ کر ڈانٹ دیا۔ بلکہ ایسا نکتہ سمجھا دیا کہ جس کے بعد نہ اس کے ذہن میں بُرائی کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ کسی کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسے پیغمبرؐ کو پروردگار عالم نے حکم دیا ہے کہ پیغمبرؐ! تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دو بُرائیوں سے ڈراؤ، اور ایک قانون عام بنا دو، ایک طریقہ سمجھا دو تاکہ تمہاری اُمّت والے اسی راستہ پر چلیں اور اسی راستہ پر چل کے سماج کو نیکیوں کے راستہ پر چلائیں اور بُرائیوں کے راستہ سے بچائیں۔

بس ارباب کرم آج مجھے اتنی ہی زحمت آپ کو دینا تھی۔ اگر یہ میری باتیں آپ کے ذہن نشین ہو جائیں اور یہ پیغام یاد رہ جائے تو اب تک کے بیانات اور اس کے بعد کے بیانات کا واقعی کوئی نتیجہ سامنے آجائے اور ہماری زندگی میں انقلاب پیدا ہو جائے، ہمارے نفس میں سدھار پیدا ہو جائے، ہم میں سماج کی اصلاح کا ذوق پیدا ہو جائے، ہم اپنے فریضہ کو محسوس کریں کہ ہر مومن ہمارا بھائی ہے۔ اگر ڈوب رہا ہے تو ڈوبنے نہ پائے۔ اگر تباہ ہو رہا ہے تو تباہ نہ ہونے پائے۔ اگر بہک گیا ہے تو بہکا نہ رہ جائے۔ اگر راستہ پر ہے تو راستہ سے واپس نہ جانے پائے۔ یہی پیغمبرؐ کا کمال تھا اور یہی مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اور یہی وہ ذمہ داری تھی جس کے لئے فرزندِ رسولؐ نے قیام کیا تھا۔ ہم تو خالی لفظیں جانتے ہیں۔ امام حسینؑ نے انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ انقلاب کیسے پیدا کر دیا؟ خود امام حسینؑ نے کہا کہ اُمّت میں فساد پیدا ہو گیا ہے میں اصلاح چاہتا ہوں۔ اصلاح کے لئے اُٹھا ہوں۔ اصلاح کیا کروں "أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ" میں کچھ نہیں چاہتا۔ نہ کسی کا تخت الٹنا چاہتا ہوں۔ نہ کسی کا تاج چھیننا چاہتا ہوں۔ میں ایک بات چاہتا ہوں کہ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دوں اور برائیوں سے روکوں۔ میرے سارے قیام کا، سارے انقلاب کا ایک مقصد ہے کہ نیکیاں عام ہو جائیں اور بُرائیوں کے راستے بند ہو جائیں۔ اسی کام کے لئے اُٹھا ہوں۔ اگر گلا کٹتا ہے تو کٹ جائے۔ اگر گھر لُٹتا ہے تو لٹ جائے۔ مگر سماج میں نیکیاں رائج ہو جائیں اور بُرائیاں بند ہو جائیں۔

یہ میرا مقصد ہے اور اسی مقصد کی تکمیل مدینہ سے کربلا تک ہوئی ہے۔ لوگوں کو کیسے نیکیوں کے راستہ پر لایا جاتا ہے اور کیسے بُرائیوں سے روکا جاتا ہے یہ امام حسینؑ جانتے ہیں اور اسی مقصد کے لئے اُٹھے تھے۔

قافلہ چل رہا ہے۔ ابھی قافلہ کربلا تک نہیں پہونچا ہے۔ کربلا کے راستہ میں ہے کہ ایک مرتبہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جیسے سامنے کوئی نخلستان ہے۔ کوئی باغ دکھائی دے رہا ہے۔ مولاؑ! اب تو ہم صحراؤں سے گذر کر کسی نخلستان، کسی باغ تک پہونچ گئے ہیں۔ فرمایا غور سے دیکھو۔ اب جو غور سے دیکھا۔ کہا نہیں یہ درخت نہیں ہیں، یہ تو نیزے ہیں، یہ تلواریں ہیں، یہ لشکر ہے۔ فرمایا مجھے معلوم ہے کہ یہ لشکر میرا راستہ روکنے کے لئے آیا ہے۔ یہاں تک کہ لشکر سامنے آگیا۔ کہا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کا راستہ روکوں۔ فرزندِ رسولؐ نے فرمایا کیوں اپنی عاقبت خراب کرنا چاہتا ہے۔ نبیؐ کا نواسہ ہوں۔ دُخترِ پیغمبرؐ کا لال ہوں۔ سمجھایا اور فرزندِ رسولؐ کے سمجھانے کا اتنا اثر ہوا امام حسینؑ کی گفتگو کا اور گفتگو کے ساتھ امام حسینؑ کے طرزِ عمل کا کہ یہ راستہ روکنے آیا ہے مگر بھیّا اس کا لشکر پیاسا ہے۔ اس کے ساتھی پیاسے ہیں۔ اس کے سپاہی پیاسے ہیں۔ اس کے لشکر کے جانور پیاسے ہیں۔ پہلا کام یہ کرو کہ ان سب کو سیراب کرو۔ اگر یہ نہ معلوم ہوتا کہ کیوں آئے ہیں اور امام حسینؑ پانی پلا دیتے تو شائد کمال کردار سامنے نہ آتا۔ لیکن معلوم ہے یہ کیوں آئے ہیں۔ یہ راستہ روکنے کے لئے آئے ہیں، مگر فرمایا انھیں پانی پلاؤ۔

میں پھر ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر ایک جملہ آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی میرا راستہ روکنے کے لئے آئے اور وہ پیاسا ہو تو کیا میں یہی طریقہ اختیار کروں گا جو امام حسینؑ نے کیا ہے۔ میں تو یہی چاہوں گا کہ جب دشمن ہے تو پیاسا ہی مر جائے لیکن امام حسینؑ نے فرمایا کہ مجھے یہ گوارا نہیں ہے۔ بھیّا انھیں پانی پلاؤ اور اس کی پرواہ نہ کرو کہ ہمارے ساتھ پانی رہ جائے گا یا نہیں۔ سارے لشکرِ حُر کو سیراب کیا گیا۔

یہاں تک کہ حُر کے لشکر کا آخری سپاہی کہتا ہے کہ اصحابِ حسینؑ میرے ساتھیوں

کو پانی پلا رہے تھے۔ میں سب سے آخر میں تھا اور میں یہ سمجھ رہا تھا جب تک میری باری آئے گی میں مر چکا ہوں گا کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ نبیؐ کا لال اپنی جگہ سے اُٹھا، مشکیزہ سنبھال کے میرے قریب آیا۔ کہا بھائی میں دیکھ رہا ہوں کہ جب تک تمھاری نوبت آئے گی تمھاری حالت غیر ہو جائے گی۔ لو میں پانی پلانے کے لئے آگیا ہوں۔ پانی پی لو۔ امامؑ نے پانی پلایا۔ اس کے بعد ناقہ کو سیراب کیا۔ بس یہ وہ طرزِ عمل تھا جس نے حُر کے دل میں انقلاب برپا کر دیا۔ وہ حسینؑ کی گفتگو، یہ حسینؑ کا طرزِ عمل۔ اس طرح لوگ ہدایت کے راستہ پر لائے جاتے ہیں۔

اس طرزِ عمل کا پہلا اثر یہ ہوا کہ اس گفتگو کے دوران نماز کا وقت آگیا۔ جب نماز کا وقت آیا تو اصحاب حسینؑ نے اذان دی۔ امام حسینؑ نے فرمایا کہ حُر وقتِ نماز آگیا ہے۔ میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں تو بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ لے۔ حُر نے عجب بات کہی۔ فرزندِ رسولؐ آپ کے ہوتے ہوئے میں نماز پڑھاؤں گا؟ میں بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا۔ میرے لشکر والے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔

دیکھئے حسینؑ کیسے دھیرے دھیرے ایک بھٹکے ہوئے آدمی کو راستہ پر لا رہے ہیں۔ راستہ سے بھٹک گیا ہے حسینؑ اسے راستہ پر لا رہے ہیں۔ دو مرحلے تمام ہوئے اب جو قافلے کے چلنے کا وقت آیا۔ کہا مگر طے یہ ہوا تھا کہ آپ اپنے ارادہ سے نہ جائیں گے جہاں ابن زیاد چاہے گا وہاں جائیں گے۔ فرزندِ رسولؐ نے قافلہ کو آگے بڑھانا چاہا۔ حُر نے بڑھ کے لجامِ فرس پر ہاتھ ڈال دیا۔ بس یہ سُننا تھا کہ نبی زادہ کی زبان پر ایک لفظ آگیا۔ تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔ یہ ہدایت کا تیسرا طریقہ تھا اس لئے کہ اگر حُر کی ماں کا ذکر نہ آیا ہوتا تو شاید حُر راہ راست پر نہ آسکتا۔ مگر جیسے ہی حسینؑ نے یہ جملہ فرمایا ویسے ہی حُر نے کہا حسینؑ! اگر آپ کے علاوہ عرب میں کوئی یہ بات کہتا تو میں اس کو جواب دیتا، مگر کیا کروں آپ کی ماں فاطمہ زہراؑ ہیں میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ ہدایت کا تیسرا طریقہ تھا کہ حسینؑ نے حر کی ماں کا ذکر کر کے حُر کے ذہن کو شہزادی کائنات کی طرف موڑ دیا۔ اب جو دخترِ پیغمبرؐ کا خیال آیا تو حُر کے ذہن میں انقلاب

اب یہ انقلاب کربلا تک ساتھ چل رہا ہے، یہانتک کہ اب جو عاشور کی رات آئی تو حُر کبھی خیمہ کے اندر، کبھی خیمہ سے باہر۔ کسی نے کہا امیر کل تو جنگ کا دن ہے آپ ذرا آرام تو فرما لیں اس لیئے کہ کل لڑائی ہونے والی ہے۔ کہا کیسے آرام کروں، جب بستر پر سونا چاہتا ہوں تو کانوں میں آواز آتی ہے "العطش، العطش" ہائے پیاس! ہائے پیاس! یہ جس نے کل ہمارے لشکر کو سیراب کیا تھا، آج اس کے چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے جاں بلب ہیں، میں کیسے آرام کروں؟

سحر کا ہنگام آیا۔ حُر ابن سعد کے سامنے آئے۔ کہا ابن سعد کیا طے ہوا، کیا واقعاً جنگ ہوگی؟ کہا حُر جنگ ہوگی اور ایسی جنگ ہوگی کہ سر کٹ کٹ کے اُڑتے ہوے دکھائی دیں گے اور ہاتھ کٹ کے گرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ بس یہ سُننا تھا کہ حُر نے ایک آہ سرد کھینچی اور ابن سعد کے سامنے سے ہٹ آئے۔ دیکھا کسی نے کہ حُر لرز رہے ہیں۔ کہا حُر یہ تمہارا کیا عالم ہے، کیا بہتّر کی سپاہ کو دیکھ کے کانپ رہے ہو؟ کہا مسئلہ سپاہ کا نہیں، مسئلہ لشکر کا نہیں ہے۔ میں اپنے کو جنّت و جہنّم کے درمیان پا رہا ہوں۔ اگر لشکرِ یزید میں رہ گیا تو انجام جہنّم ہوگا۔ حسینؑ کے پاس چلا جاؤں تو جنّت مل جائے گی۔ مگر جاؤں گا کیسے؟ راستہ تو میں نے ہی روکا تھا۔ بلا کے بن میں تو گھیر کے میں ہی لایا ہوں۔

اب حُر کا دل بے چین ہے۔ حسینؑ کی بارگاہ میں کیسے چلا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد حُر نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے جانا ہے۔ دو قدم آگے بڑھے، آہٹ محسوس کی جیسے کوئی آرہا ہے۔ مُڑ کے دیکھا جوان بیٹا آرہا ہے۔ کہا بیٹا تم کیوں آئے؟ کہا بابا کہاں جا رہے ہیں؟ کہا میں تو مولاؑ کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ بڑی خطا ہو گئی ہے اب جا رہا ہوں اپنی خطا کو بخشوانے کے لیئے۔ کہا بابا کیا یہی وقت ہے مجھے ساتھ چھوڑ جانے کا۔ مجھے الگ کر دینے کا کیا یہی وقت ہے۔ اگر آپ جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ کہا بیٹا بڑے موقع سے تم آگئے۔ لو ذرا میرے ہاتھوں کو باندھ تو دو۔ بابا مجھ سے تو یہ نہ ہو سکے گا۔ کہا نہیں بیٹا ان

باندھ دو، اس لئے کہ یہی ہاتھ مولاؑ کے لجام فرس تک چلے گئے تھے۔

لو عزیزو! حُر احساس ندامت لے کر چلے۔ ایک مرتبہ حسینؑ نے آواز دی میرے چاہنے والو! استقبال کرو، میرا مہمان آرہا ہے۔ اصحاب نے بڑھ کے استقبال کیا۔ حُر نے آ کے سر مولاؑ کے قدموں پر رکھ دیا۔ حسینؑ نے کہا سر اٹھاؤ حُر یہ کیا کر رہے ہو؟ کہا مولاؑ جب تک خطا معاف نہ ہوگی یہ سر نہ اٹھے گا۔ فرمایا حُر تمھاری خطا کو میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔ اب تو سر اُٹھا لو۔ کہا مولاؑ سر اٹھاؤں گا مگر ایک شرط ہے۔ پہلے میں نے راستہ روکا تھا پہلے مجھے مرنے کی اجازت دیجئے۔ یوں آنے والے راہِ ہدایت پر آتے ہیں۔ اتنا بڑا انقلاب پیدا ہوگیا۔ پہلے مرنے کی اجازت مجھے دیجئے۔

سُن سکو گے عزیزو؟ حسینؑ نے فرمایا حُر یہ تم نے کیا کہہ دیا، کیسے تمھیں مرنے کی اجازت دوں۔ ابھی تم آئے ہو میرے مہمان ہو میں کیا کروں، تمھاری خاطر داری کیسے کی جائے؟ اب تو خیمہ میں ایک قطرۂ آب بھی نہیں ہے۔ حُر نے کہا مولاؑ تو کیا آپ مجھے مہمان سمجھتے ہیں۔ اگر مہمان کہتے ہیں تو مہمان کی کچھ تو خاطر کرنا پڑے گی؟ فرمایا حُر ہم کس خاطر کے قابل رہ گئے ہیں۔ کہا مولاؑ میں بتاؤں آپ کیا کر سکتے ہیں۔ فرمایا حُر بتاؤ کیا کر سکتا ہوں؟ کہا مولاؑ میرے جوان بیٹے کو مرنے کی اجازت دید یجئے۔ اب حسینؑ کیا جواب دیتے۔ سر جھکا لیا۔ کہا جاؤ حُر میں نے اجازت دے دی۔ حُر نے اپنے جوان بیٹے کو سجایا، گھوڑے پر بٹھایا، مقتل میں بھیجا۔ لشکر دشمن سے ٹوٹ کے آیا ہے۔ ابن سعد نے کہا حملہ کرو۔ چاروں طرف سے حُر کے جوان کو گھیر لیا گیا۔ تلواروں پر تلواریں۔ نیزوں پر نیزے۔ جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگا تو آواز دی 'بابا! اگر آخری دیدار کرنا ہے تو آؤ' حُر کے کانوں میں آواز آئی۔ اُٹھے، کمر کو کس کے باندھا۔ مقتل میں جانے کا ارادہ کیا۔ کسی نے کہا مولاؑ حُر میدان میں جارہے ہیں۔ حسینؑ آگے بڑھ کے آگئے۔ حُر کیا ارادہ ہے۔ کہا مولاؑ، جوان بیٹے نے بُلایا ہے۔ اپنے کڑیل جوان کے سرہانے جا رہا ہوں۔ کہا حُر تم نہ جاؤ گے۔ میں

جاؤں گا۔ تم کو نہ جانے دوں گا میں جاؤں گا۔ حُر کو روکا۔ حسینؑ مقتل میں آئے۔ حُر کے جوان کا سر اُٹھا کے اپنے زانو پر رکھا۔ جب حُر کا بیٹا کام آگیا تو احترام کے ساتھ جنازہ اُٹھایا۔ جی چاہتا ہے ہاتھ جوڑ کے گذارش کروں مولاؑ! تھوڑی دیر پہلے آنے والا جب اس کا جوان بیٹا گھوڑے سے گرا تو جنازہ آپ نے اٹھایا، مگر آقا اتنا فرما دیجئے کہ جب آپ کے کڑیل جوان کا جنازہ اُٹھے گا تو کون اُٹھائے گا؟

ہائے حسینؑ کی بیکسی آواز دی اے بنی ہاشم کے بچّو! آؤ ضعیف باپ سے کڑیل جوان کا جنازہ نہیں اُٹھ رہا ہے۔ خیمے کا پردہ اُٹھا۔ حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی بھیّا! گھبرائیے گا نہیں میں آگئی۔

لاشہ ہے برا.ر کا، بھیّا سے نہ اُٹھے گا
میں پالنے والی ہوں گودی میں اُٹھالوں گی

سَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ۔

مجلس ۵

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی
اَهْلِ بَیْتِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی
اَعْدَائِهِمْ اَجْمَعِیْنَ ٥
اَمَّا بَعْدُ!

صاحبانِ ایمان وہ ہیں جو اس رسول نبیؐ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے۔ بُرائیوں سے روکتا ہے۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے۔ خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت کو اس بوجھ اور ان زنجیروں سے آزادی دلاتا ہے۔ جس میں یہ عالم انسانیت جکڑا ہوا ہے۔ پس جو لوگ اس نبیؐ پر ایمان لائے۔ جنھوں نے اس کا احترام کیا۔ اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا، جو نبی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ درحقیقت کامیاب ہیں۔

آیۂ کریمہ کے ذیل میں رسالتِ الٰہیہ کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے پانچویں مرحلہ پر آج کچھ باتیں سرکار دو عالمؐ کی اس صفت سے متعلق گذارش کرنا ہیں "وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبَاتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبَائِثَ" پیغمبرؐ پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔

آج کا موضوع بھی شاید کل کے موضوع سے ہم رنگ ہوتے ہوئے قدرے دقیق بھی ہے اور بہت کچھ فکر و نظر کا محتاج ہے۔ مختصر سے وقت میں مَیں آپ کے

سامنے سرکارِ دو عالمؐ کی شریعت اور آپ کے قانون کا پورا خاکہ گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمام سُننے والوں کے ذہن میں شریعت مقدسہ اور اس کے امتیازات رہیں اور یہ اندازہ ہو کہ اسلام واقعاً کتنا جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے۔

دو باتیں تمہیدی طور پر چند منٹ میں گذارش کرنا ہیں، اس کے بعد اصل مسئلہ کی وضاحت کرنا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مالک کائنات نے پیغمبرؐ کی ذمہ داریوں میں اور پیغمبرؐ کے صفات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ پیغمبرؐ وہ ہے جو طیّبات کو حلال قرار دیتا ہے اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ پھر آپ توجہ دیں۔ یہ پیغمبر وہ ہے جو پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ یہ عالم اسلام کا بڑا اختلافی مسئلہ ہے، جس میں مَیں آپ کو نہیں اُلجھانا چاہتا۔ لیکن ایک اشارہ اس لئے کرنا ضروری ہے کہ بغیر اس کے مسئلہ کی وضاحت نہ ہو گی۔

عام طور سے مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ اسلامی قوانین کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اسلامی قوانین کی صرف ایک بنیاد ہے جس کا نام ہے حکمِ خدا۔ جو خدا نے کہہ دیا وہی قانون ہے۔ جو خدا نے فرما دیا وہی قانون ہے۔ لیکن خدا نے کیوں فرما دیا؟ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یعنی اگر خدا نے کسی چیز کا حکم دے دیا تو اس لئے حکم نہیں دیا کہ وہ چیز اچھی تھی، بلکہ جب خدا نے حکم دے دیا تو اچھی ہو گئی۔ اگر خدا نے کسی چیز سے روکا ہے تو اس لئے نہیں روکا کہ اس میں کوئی خرابی تھی بلکہ جب خدا نے روک دیا تب خرابی پیدا ہو گئی۔ یعنی قانون کسی بنیاد سے نہیں پیدا ہوا ہے، بنیاد قانون سے پیدا ہوئی ہے۔

اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسری منزل پہلے بنی، اور پہلی منزل بعد میں تیار ہوئی ہے۔ یا اور واضح لفظوں میں کہا جائے کہ عمارت پہلے بنی ہے اور سنگ بنیاد بعد میں رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ پروردگار کے قوانین کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ خدا اپنی حکومت ظاہر کرنے کے لئے کہتا ہے کہ یہ کام کرو، یہ نہ کرو۔ اب جو کہہ دیا

کہ یہ کرو تو بندہ کو کہنا ہی پڑے گا کہ اس میں کوئی اچھائی ہوگی۔ اچھائی تھی نہیں۔ خدا نے کہہ دیا تو اچھائی ہوگئی۔ اور جب خدا نے روک دیا تو کوئی برائی ہوگئی۔ ورنہ خدائی احکام کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ عام مسلمانوں کا مسلک ہے۔ میں اس میں بحث نہیں کرنا چاہتا میں تو فقط یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود پروردگار نے اپنے مذہب کے بارے میں کیا کہا ہے۔ اگر خدا نے یہ کہا ہوتا کہ پیغمبرؐ وہ ہے جو اپنے احکام سے چیزوں کو پاکیزہ بناتا ہے۔ اپنی پابندی سے چیزوں کو خبیث بناتا ہے تو یہ بات یقیناً صحیح ہوتی جو مسلمان کہہ رہے ہیں۔ لیکن خدا نے کیا کہا "یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ" پیغمبر پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے۔ خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ یعنی یہ چیز پاکیزہ ہے اس لیے پیغمبرؐ نے حلال قرار دیا ہے۔ خبیث ہے اس لیے حرام قرار دیا ہے۔

احکام شریعت بے بنیاد نہیں ہیں، بنیادیں پہلے سے موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم بے خبر تھے جب نبی نے حکم دے دیا تو تمھیں اطلاع ہوگئی یہ پاکیزہ ہے وہ خبیث ہے۔

احکام پیغمبرؐ کسی چیز کی اچھائی یا برائی سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔ احکام سے اچھائی یا برائی نہیں پیدا ہوتی ہے۔ جب حضورؐ کسی بات کا حکم دے دیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر کوئی خوبی تھی جو ہمیں نہیں معلوم تھی۔ جب حضورؐ منع کر دیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کوئی خرابی، کوئی خباثت تھی جو ہمیں نہیں معلوم تھی اور نبیؐ کے ذریعہ معلوم ہوگئی۔ یہ ایک پہلا بنیادی مسئلہ ہے۔

دوسری بات جس کی تمہید میں وضاحت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں دو لفظیں استعمال ہوتی ہیں جو ہم آپ برابر استعمال کرتے ہیں اور دعاؤں میں بھی وارد ہوئی ہیں "اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا رِزْقًا حَلَالًا طَیِّبًا" پروردگار ہمیں وہ روزی دے جو حلال اور طیّب ہو۔ حلال اور پاکیزہ ہم سمجھے کہ حلال اور پاکیزہ کے ایک ہی معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حلال کے معنی الگ ہیں۔ پاکیزہ کے معنی الگ ہیں۔ یہ پہلا مسئلہ جو میں نے عرض کیا تھا اسی سے اس کی بھی وضاحت ہوگئی اور یہ مسئلہ بھی اسی سے

متعلق ہے۔ حلال ہونا ایک الگ مسئلہ ہے اور پاکیزہ ہونا الگ ایک مسئلہ ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے فرمایا" کل شئ لک طاھر حتی تعلم انہ قذر" جب تک کسی چیز کی نجاست کے بارے میں نہ معلوم ہو یہ چیز تمھارے لئے پاک ہے (توجہ کرو عزیزو) مسائل شریعت بہت دقیق ہیں اور یہی ہماری زندگی کے مسائل ہیں حضورؐ نے کیا فرمایا۔ جب تک تمھیں کسی چیز کے نجس ہونے کا علم نہ ہو جائے یہ چیز تمھارے لئے پاک ہے۔ تمھاری لاعلمی نے اس کو پاک نہیں بنایا ہے، تمھاری لاعلمی کا فقط یہ اثر ہے کہ تمھارے لئے پاک ہے۔ ہم ایک راستہ سے گذر رہے تھے، ہم نے ایک مقام پر کسی بچے کو پیشاب کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ ہمارے بعد آئے، آپ کو نہیں معلوم ہے کہ یہ پیشاب ہے یا پانی۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ بچے کا پیشاب ہے۔ آپ کی ذمہ داری الگ ہے۔ ہماری ذمہ داری الگ ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم پرہیز کریں اس لئے کہ یہ پیشاب ہے۔ آپ پر پرہیز واجب نہیں ہے اس لئے کہ آپ کو نہیں معلوم ہے کہ پیشاب ہے۔ اگر پیشاب ہے تو نجس ہے اور اگر پانی ہے تو پاک ہے ـــــ قانونِ شریعت کیا ہے؟ جب تک آپ کو نہیں معلوم آپ کے لئے پاک ہے۔ تو لاعلمی میں یہی چیز آپ کے لیے پاک ہے اور علم کی وجہ سے یہی چیز ہمارے لیے نجس ہے۔ تو اگر قانون نے آپ کے لیے پاک بنا دیا تو آپ پرہیز نہ کریں گے۔ مگر پرہیز نہ کرنے کی بنا پر یہ پیشاب پانی نہیں بن جائے گا۔ آپ کی لاعلمی کی بنا پر آپ کے لیے یہ پاک تو بن جائے گا لیکن آپ کی لاعلمی کی بنا پر پیشاب پانی بن جائے یہ انقلاب نہیں پیدا ہونے والا ہے۔ پیشاب پیشاب رہے گا۔ آپ کے لیے اس لیے پاک ہے کہ آپ ناواقف ہیں اور یہ بھی یاد رکھئے گا کہ یہ قانون طہارت اور نجاست کا ہے۔ یہ قانون حلال و حرام کا نہیں ہے کہ کسی آدمی نے کہا ہم بازار میں گئے گوشت خریدنے کے لیے، ہم کو نہیں معلوم کہ یہ آسٹریلیا کا ہے یا ابوظبی کا ہے۔ اب حضورؐ نے تو پہلے کہہ دیا ہے کہ جو چیز تم کو نہ معلوم ہو۔ نہیں۔ حضور نے یہ کہا ہے کہ جو تمھیں نہ معلوم ہو وہ پاک ہے، یہ نہیں کہا جو نہ معلوم ہو وہ حلال ہے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ پاک

ہے کہ نجس ہے۔ یہاں مسئلہ یہ ہے کہ حلال ہے کہ حرام ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ذبیحہ کا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک آپ کے لیے حرام رہے گا۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان کے ہاتھ کا ذبیحہ ہے۔ اس کے بغیر آپ کے لیے جائز نہیں ہوگا۔ ہاں جب نجس پاک کا مسئلہ ہوگا تو جب تک آپ ناواقف رہیں گے آپ کے لیے پاک رہے گا۔ جب واقف ہو جائیں گے نجس ہو جائے گا۔

یہیں سے اس مسئلہ کی حقیقت کو آپ پہچانیں کہ حلال اور طیب، جائز اور پاکیزہ ان دونوں کا فرق کیا ہے۔ ایک آدمی نے ہمارے سامنے ایک گلاس میں ایک مشروب ایک پینے والی چیز لا کے پیش کی۔ ہم نے کہا یہ کیا ہے؟ کہنے لگے شربت روح افزا۔ ہم بھی گرمی سے پریشان تھے ہم نے فوراً لیا اور پی لیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے۔ ایک مرد مسلمان، ایک مرد مومن نے پیش کیا ہے یہ کہہ کر کہ شربت روح افزا ہے اور اسلام نے ہمارے لیے جائز قرار دیا ہے۔ اس کے بعد جب ہم نے پی لیا تو انھوں نے قہقہہ لگایا۔ آپ تو بہت متقی پرہیزگار بنتے تھے۔ آپ کہتے تھے کہ ہم نے زندگی میں کبھی شراب کی طرف مُڑ کے نہیں دیکھا۔ بالآخر پی گئے یا نہیں۔ میں نے کہا کیا یہ شراب ہے؟ کہنے لگے بے شک۔ خیر یہ ان کے ایمان و اسلام کی بات تھی کہ انھوں نے مذاق کی بنیاد پر مسلمان کو شراب پلا دی۔ حالانکہ یہ وہ جُرم ہے جس کا جواب روز قیامت انھیں دینا ہوگا ہمیں نہیں۔ تو چونکہ ہمیں نہیں معلوم ہے کہ یہ روح افزا ہے یا شراب ہے اس لیے لاعلمی کی بنا پر اسلام نے ہمارے لیے اس کو جائز تو کر دیا ہے لیکن جائز ہو جانے کی بنا پر شراب روح افزا بن جائے یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ شراب، شراب رہے گی۔ ناواقفیت کی بنا پر جائز ہو جائے گی۔ زہر زہر رہے گا ناواقفیت کی بنا پر جائز ہو جائے گا۔ اب آپ کو اندازہ ہوا کہ جائز ہو جانا الگ ہے نشہ ہونا الگ ہے۔ یہ شراب ہے۔ یہ ناپاک ہے۔ یہ خبیث چیز ہے اگرچہ ہمارے لیے جائز ہے۔ اب اسلام نے ہم سے کہا کہ دُعا کرو "خدایا وہ روزی دے جو حلال بھی ہو اور طیّب بھی ہو"۔ ہو سکتا ہے کہ ناواقفیت کی بنا پر حلال تو ہو جائے لیکن اگر واقعاً

ناپاک ہے تو زندگی میں کہیں نہ کہیں اس کا اثر ضرور ظاہر ہوگا۔ زندگی میں کہیں نہ کہیں اس کی خباثت ضرور ظاہر ہوگی۔ اگر کوئی آدمی ناواقفیت میں ساری زندگی حرام کھاتا رہے تو روزِ قیامت چاہے جہنّم میں نہ جائے مگر اس کی زندگی میں اس حرام کے اثرات بہر حال ظاہر ہوں گے۔ اگر ان اثرات کو آپ پہچاننا چاہتے ہیں تو ایک جملہ گذارش کروں گا۔ فرزندِ رسولؐ نے روزِ عاشور فوجِ دشمن کے سامنے صبح سے دوپہر تک مسلسل نصیحتیں کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ میرا فریضہ ہے اتمامِ حُجّت، میری ذمہ داری ہے حُجّت تمام کرنا۔ اس لیے صبح سے برابر سمجھا رہا ہوں ورنہ جانتا ہوں کہ میری بات کا تم پر اثر نہ ہوگا۔

فرزندِ رسولؐ اثر کیوں نہ ہوگا؟

فرمایا "قَدْ مُلِئَتْ بُطُوْنُکُمْ مِنَ الْحَرَامِ" اس لیے کہ تمھارے پیٹ مالِ حرام سے بھرے ہوئے ہیں۔ تو جس پیٹ میں مالِ حرام آگیا وہ کوئی نہ کوئی اثر کرے گا۔ کم سے کم اتنا اثر ہوگا کہ نصیحتیں سُنی جائیں گی اثر نہ ہوگا۔

عزیزانِ محترم! اب بات آگئی ہے تو اس جملہ کو بھی ذہن میں محفوظ رکھیے گا کہ مالِ حرام اگر شکم میں آگیا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی پر نصیحتوں کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ اگر ہمارا کوئی بزرگ، اگر ہمارا کوئی استاد، اگر ہمارا کوئی عالم، اگر ہمارا کوئی مرشد، اگر ہمارا کوئی سمجھانے والا ہادی و رہنما ہمیں کوئی نصیحت کرے اور ہم پر اس کی نصیحت کا اثر نہ ہو تو سب سے پہلے ہمیں اپنی غذا کا جائزہ لینا چاہیے ایسا تو نہیں ہے کہ یہ غذا حرام ہو۔ اس لیے کہ غذائے حرام شکم میں آئی نہیں کہ موعظہ کا اثر گیا نہیں۔ جیسا کہ فرزندِ رسولؐ کا بیان ہے۔ اگرچہ امام حسینؑ نے فوجِ دشمن سے خطاب کر کے فرمایا تھا مگر یہ ایک قانون عام ہے کہ جس شکم میں مالِ حرام آجائے گا اس پر نصیحتوں کا اثر نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہر دور میں رہا ہے اور آج بھی ہے اور نہ جانے کب تک رہے گا۔ یہ بہترین ذریعہ ہے فرزندِ رسولؐ کے کلام کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اور اپنی زندگی کو پہچاننے کے لیے۔ اپنی غذاؤں کے

اثرات کو محسوس کرنے کے لیے۔ اگر موعظہ کا اثر نہ ہو تو پہچانو کہ غذا میں کوئی عیب ہے۔

توجہ کی آپ نے؟ میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ چیز کا حلال ہونا الگ ہے، اس کا پاکیزہ ہونا الگ ہے۔ معصومینؑ نے کہا کہ خدا سے دعا کرو کہ خدا وہ روزی دے جو حلال بھی ہو قانون کے اعتبار سے اور پاکیزہ بھی ہو تاکہ نہ محشر میں پکڑے جائیں اور نہ دنیا میں غلط اثرات پیدا ہونے پائیں۔

بس یہ دو جملے مختصر مجھے تمہید میں گذارش کرنا تھے۔ اب آئیے ذرا قانون اسلام کا جائزہ لیں پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات کی روشنی میں۔

پیغمبر کا کام کیا ہے؟ پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دینا اور خبیث، ناپاک، بُری، گندی چیزوں کو حرام قرار دینا۔ شریعتِ پیغمبرؐ اتنی جامع شریعت ہے کہ حضورؐ نے کوئی طیب ایسا نہیں چھوڑا جس کے حلال ہونے کا اعلان نہ کیا ہو۔ اور کوئی خبیث، ناپاک، گندی شئے ایسی نہیں چھوڑی جس کے حرام ہونے کا اعلان نہ کیا ہو۔ ہم بلا وجہ نہیں کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی شریعت بہت جامع ہمہ گیر ہے۔ یہ خالی ہمارا عقیدہ نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس اور میرے پاس وقت ہوتا تو ایک دو دن میں نہیں شاید ایک آدھ مہینہ میں میں آپ کے سارے تفصیلات گذارش کرتا کہ سرکار دو عالمؐ نے جس چیز کو بھی حلال قرار دیا ہے اس میں پاکیزگی پائی جاتی ہے اور جس چیز کو حرام قرار دیا ہے اس میں کوئی نہ کوئی خباثت اور گندگی ضرور پائی جاتی ہے۔ اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جو دنیا کی ہر شے میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے کہ جس کو بھی آپ دیکھیں گے اس میں کوئی قسم طیّب دکھائی دے گی، کوئی قسم خبیث دکھائی دے گی۔ ابھی میں تفصیلات گذارش کروں گا۔ جہاں بھی آپ جائیں گے وہاں دو طرح کی مخلوقات دکھائی دے گی۔ یہ پاکیزہ و خبیث، یہ طیب و گندہ ہر جگہ ہے۔ حد یہ ہے کہ اللہ نے ایک آدم کو دو بیٹے دیئے، ایک ہابیل اور ایک قابیل تو وہاں بھی دو پیدا ہو گئے ایک پاکیزہ نفس اور ایک خبیث النفس۔ تو ہماری تاریخ بشریت میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ دو طرح کے انسان روز اوّل سے نظر آرہے ہیں۔ کوئی طیب، کوئی خبیث۔ کوئی پاکیزہ، کوئی

ناپاک۔ اس کے بعد ساری مخلوقات کو اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قانون پیغمبرؐ میں دو طرح کی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کا نام رکھا گیا ہے حلال و حرام اس لیے کہ اگر چیزیں دو حصّوں پر تقسیم نہ ہوتیں تو قانون دو طرح کے نہ ہوتے۔ اگر چیزیں طیّب اور خبیث دونوں طرح کی نہ ہوتیں تو قانونِ اسلام میں یا حلال ہی حلال ہوتا یا حرام ہی حرام ہوتا۔ مگر چیزیں دو طرح کی ہیں لہٰذا پیغمبرؐ بھی بعض کو حلال قرار دیتا ہے جو پاکیزہ ہیں، اور بعض کو حرام قرار دیتا ہے جو خبیث، گندی اور ناپاک ہیں۔

آئیے سلسلہ سے حساب کریں۔

پہلا مرحلہ جمادات کا ہے۔ یہی زمین، یہی خاک، یہی پتھر، ان میں بھی بعض وہ ہیں جو حلال ہیں، اور بعض وہ ہیں جو حرام ہیں۔ خبیث کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ دیکھیں تو گندہ دکھائی دے۔ نہیں۔ ہو سکتا ہے کسی میں خباثت پائی جاتی ہو دیکھنے میں وہ ہم سے، آپ سے اچھا دکھائی دے۔ آپ بُرا نہ مانئے گا یہ آپ سے متعلق بھی نہیں ہے آپ بُرا کیا مانیں گے۔ یہ ہمارے ملک کی بات ہے۔ ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ اگر آپ کو چائے پینا ہو اور یہ نہ معلوم ہو کہ یہ ہوٹل مسلمان کا ہے یا غیر مسلم کا ہے، تو ہوٹل کے سامنے دو منٹ جا کے کھڑے ہو جائیے۔ اگر وہاں آپ کو صفائی دکھائی دے۔ برتن صاف، پیالیاں صاف، تشتریاں صاف، تو سمجھیے کہ اُدھر والے کا ہے۔ اور اگر یہاں مکھیاں، وہاں کثافت، یہاں گندگی۔ تو سمجھ جائیے کہ کسی نہ کسی اللہ والے کا ہے۔ غور کیا آپ نے؟ یہ ایک عام جائزہ ہے۔ ہر جگہ ضروری نہیں ہے کہ ساری باتیں قانون کُلّی کے طور پر مان لی جائیں لیکن ایک عام طریقہ کار یہ ہے۔ مگر اس کے بعد بھی وہ جس کو ہم دیکھ رہے ہیں کہ برتن صاف، پیالیاں صاف، کپڑے صاف، ہر طرح کی صفائی اسلام اسی کو خبیث کہتا ہے۔ میں وجہ بعد میں گذارش کروں گا کہ کیوں کہتا ہے۔ مگر اسلام اسی کو خبیث کہتا ہے۔ وہ جہاں مکھّیاں اُڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں اسی کو حلال قرار دیتا ہے اس لیے کہ اس کے اسلام کے اندر جو پاکیزگی پائی جاتی ہے وہ پاکیزگی اس کے کفر میں نہیں پائی جاتی ہے۔ مسلمان کا ہاتھ کثیف ہو جانے کے بعد بھی، گندہ ہو جانے کے بعد بھی اتنا پاکیزہ ہوتا ہے کہ کفر کا ہاتھ صابن سے دھونے کے بعد بھی اتنا پاکیزہ

نہیں ہو سکتا ہے۔

ہم جس کو کثافت، گندگی یا صفائی کہتے ہیں یہ الگ ایک بات ہے اور واقعاً جس کا نام پاکیزگی اور نجاست ہے یہ الگ ایک دنیا ہے۔ یہ قانون پیغمبرؐ سے اندازہ ہوگا۔

تو یہ ہے پہلا مرحلہ۔ مٹی کی بعض قسموں کو حلال قرار دیا گیا ہے اور بعض قسموں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ عام قانون اسلام کا یہی ہے کہ مٹی کا کھانا کسی کے لیے جائز نہیں ہے مگر بعض قسمیں ایسی بھی ہیں کہ جن کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں کچھ اثرات الگ ہیں اُن کے اثرات الگ ہیں۔ جب مٹی سے آگے بڑھے نباتات تک آئے۔ زمین سے اُگنے والی چیزیں تو وہاں بھی دو قسمیں ملیں گی۔ جو زہریلی گھاس ہے اسلام نے اسے حرام کر دیا ہے۔ اور جس میں زہر نہیں پایا جاتا ہے اسلام نے اسے حلال قرار دے دیا ہے۔ یہ الگ ایک قسم ہے، وہ الگ ایک قسم ہے۔ نباتات سے آگے بڑھے حیوانات تک آئے۔ حیوانات بھی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض حیوانات ہیں جن کو حرام بنایا گیا ہے۔ بعض حیوانات ہیں جن کو حلال قرار دیا گیا ہے اور حیوانات بھی تین طرح کے ہیں۔ فضا میں اُڑنے والے جانور الگ، خشکی میں زمین پر چلنے والے جانور الگ، دریا اور پانی میں رہنے والے جانور الگ۔ تو جانور تین طرح کے ہو گئے۔ فضا والے، زمین والے، پانی والے۔ تینوں قسم کے جانور دو طرح کے ہیں۔ دریا میں رہنے والی مچھلیاں بعض حلال بعض حرام۔ انہی میں طیّب بھی ہیں ان ہی میں خبیث بھی ہیں۔ ان ہی مچھلیوں میں بعض قسموں کو جائز رکھا گیا ہے اور بعض کو حرام کر دیا گیا ہے۔ ہم اس کی وجہ جانیں یا نہ جانیں لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان میں بعض طیّب ہیں اور بعض خبیث ہیں۔ زمین پر چلنے والے جانور دو طرح کے ہیں۔ بعض کو حلال کیا گیا ہے بعض کو حرام۔ گائے کو جائز کر دیا گیا ہے۔ بکری بھیڑ کو جائز کر دیا گیا ہے۔ اونٹ کو جائز کر دیا گیا ہے۔ کُتّے کو حرام کر دیا گیا ہے۔ سور کو حرام کر دیا گیا ہے۔ جو جانور پرانے انسانوں سے مسخ شدہ جانور ہیں جب عذابِ الٰہی نازل ہوا پرانی قوموں پر تو اُنھیں خدا نے مسخ کر دیا جانوروں کی شکل میں۔ انھیں اسلام نے حرام قرار دیدیا۔

اور جن کو حرام قرار دیا گیا وہ خبیث تھے ۔ یہ دو قسمیں ہوگئیں ۔ اب آئیے فضا میں اُڑنے والے جانوروں کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کر دیں ۔

بعض جانور وہ ہیں جن کے اُڑنے کا انداز بتاتا ہے کہ یہ طیّب ہیں ۔ اب مسائل آپ جا کے کتابوں میں پڑھیں گے، میں انھیں نہیں گذارش کروں گا ۔ بعض جانوروں کے اُڑنے کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ طیّب ہیں لہذا حلال ہیں ۔ بعض کے اُڑنے کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ حرام ہیں، یہ خبیث ہیں ۔ ان میں وہ پاکیزگی نہیں پائی جاتی ہے جو حلال میں پائی جاتی ہے ۔ تو دریا کی مچھلیاں بھی دو طرح کی، زمین پر چلنے والے جانور بھی دو طرح کے، فضا میں اُڑنے والے طیور بھی دو طرح کے، بعض حلال اور بعض حرام ۔ یعنی بعض طیّب اور بعض خبیث ۔ یہ تو ایک عام تقسیم ہو گئی ۔ اب خود جانور کے اندر جتنے اعضاء پائے جاتے ہیں اگر آپ کی نگاہ میں سارے مسائل ہیں تو آپ کو زیادہ لُطف آئے گا لیکن بہرحال مسائل اگر نگاہ میں آجائیں گے تو آئندہ جب کبھی آپ سُنیں گے یا سوچیں گے تو آپ کو اپنی شریعت کا لُطف آئے گا ۔ خود جانور کے اندر جتنے اعضاء پائے جاتے ہیں سر سے پیر تک ان میں چودہ چیزیں وہ ہیں جن کو اسلام نے حرام بنا دیا ہے ۔ جانور تو ایک جانور تھا اسی جانور کے جسم کے ٹکڑے ہیں مگر چودہ ٹکڑے وہ ہیں جن کو حرام بنا دیا گیا ہے یا بعض روایات میں پندرہ ۔ اور باقی جتنے اجزاء ہیں ان کو حلال بنا دیا گیا ہے ۔ یہ گوشت جائز، یہاں کا گوشت جائز وہاں کا گوشت ناجائز ۔ یہ مغز جائز وہ جگہ جائز، یہ جگہ ناجائز ۔ وہ جگہ حرام، یہ جُز ناجائز، وہ عضو حرام ۔ اس کے معنی کیا ہوئے کہ جانور ایک جانور تھا مگر اسی جانور کے اندر کچھ حصّہ طیّب ہے کچھ خبیث ۔ عزیزو! اگر آپ کے ذہن آخر تک میرے ساتھ نہ چلے تو جہاں میں آپ کو لے جا رہا ہوں میری محنت ضائع ہو جائے گی، متوجہ رہیں گے ۔ اسی ایک جانور کے اندر ایک حصہ طیّبات کا ہے، ایک حصہ خبائث کا ہے ۔ جو طیّبات کا حصّہ ہے اسے حلال بنا دیا، جو خبیث حصّے ہیں انھیں حرام بنا دیا ۔

تو یہی بات ہم نے دیکھی جمادات میں ۔ یہی بات ہم نے دیکھی نباتات میں ۔ درختوں میں گھاس پھوس میں ۔ یہی بات دیکھی ہم نے جانوروں میں ۔ یہی بات دیکھی دریائی جانوروں میں ۔ یہی بات دیکھی خشکی کے جانوروں میں ۔ یہی بات دیکھی فضا میں اُڑنے والے جانوروں

میں ۔ یہی بات دیکھی پورے جانور میں، اور یہی بات دیکھی جانور کے اندر ۔

اس ساری تقسیم سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ نبی کا کام کیا ہے ۔ جو طیب ہے اُسے حلال کہے ۔ جو خبیث ہے اُس کو حرام کہے ۔ اب میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اسے آپ نوٹ کریں ۔ دنیا کے کسی بھی لیڈر کو دیکھیں جو علم حیوانات کے جاننے والے ہیں وہ جانوروں کی خصوصیات تو جانتے ہیں درختوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ۔ جو علم نباتات کے ماہرین ہیں وہ درختوں کے بارے میں خوب جانتے ہیں جانوروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ۔ جو پتھروں کے پہچاننے والے ہیں وہ جواہرات کو خوب جانتے ہیں گھاس کو نہیں جانتے ہیں ۔ حد یہ ہے کہ جو قصاب صبح سے شام تک جانور کاٹتے رہتے ہیں انھیں نہیں معلوم ہے کہ اس حصہ کا اثر کیا ہے، اُس حصہ کا اثر کیا ہے ۔ جو دریاؤں میں کام کرنے کے اتھارٹی ہیں وہ مچھلیوں کے بارے میں خوب جانتے ہیں ۔ مگر زمین پر چلنے والے جانوروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں ۔ Fisheries کا محکمہ الگ ہے یہ جانوروں کے ماہر ہیں، مگر کون سے جانور، جو دریائی ہیں، یہ خشکی والے جانور کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں ۔ حضور حد ہو گئی ہم کو عالم کہا جاتا ہے ہم ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں ۔ آپ کی شان میں گستاخی نہیں کروں گا میں اپنے بارے میں کہتا ہوں ۔ ہم کو تو عالم دین کہا جاتا ہے، ہم ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ۔ نہ مچھلیوں کے خصوصیات جانتے ہیں نہ پرندوں کے خصوصیات جانتے ہیں، نہ زمین پر چلنے والوں کے خصوصیات جانتے ہیں، نہ جسموں کے اندر کے خصوصیات جانتے ہیں، نہ درختوں کے خصوصیات جانتے ہیں، نہ پتھروں اور زمینوں کے اثرات جانتے ہیں ۔ ہم خالی احکام جانتے ہیں باقی کچھ نہیں جانتے ہیں حالانکہ ہم اس دَور میں پیدا ہوئے ہیں جب پتھروں پر کتابیں آ چکی ہیں ۔ ہم اس دَور میں پیدا ہوئے ہیں جب طبقات الارض پر ریسرچ ہو چکی ہے ۔ لٹریچر آ چکا ہے ۔ جب مچھلیوں کے بارے میں لٹریچر چھپ چکا ہے ۔ جب جانوروں کے بارے میں کتابیں آ چکی ہیں ۔ پرندوں کے بارے میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ہم پڑھے لکھے ہیں سب لکھا موجود ہے اور ہم پڑھے لکھے ہیں اس کے بعد بھی نہ اُس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ اس کے بارے میں ۔ مجھے حیرت ہوتی ہے خود کو

برس پہلے جب نہ جمادات پر کوئی کتاب لکھی گئی تھی نہ نباتات کے بارے میں ریسرچ ہوئی تھی۔ نہ جانوروں کے بارے میں تحقیق ہوئی تھی نہ پرندوں کے بارے میں ریسرچ ہوئی تھی جب کوئی لٹریچر نہ تھا اور اگر لٹریچر چھپ بھی گیا ہوتا تو جو ذمہ دار تھا وہ اُمّی۔ نہ کتاب پڑھتا تھا نہ مدرسہ میں جاتا تھا، آخر یہ کیسے سمجھا کہ اتنی مخلوقات میں طیّبات کتنے ہیں اور خبائث کتنے ہیں۔

ہم ابھی فقط اسی بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ حضورؐ علم غیب رکھتے تھے یا نہیں حضورؐ غیب کی باتیں جانتے تھے یا نہیں۔ ارے غیب کی باتیں چھوڑیئے جتنا جانتے تھے پہلے اس کا حساب لگائیے۔ وہ جو غیب ہے وہ غیب ہے۔ یہ جو حاضر ہے اس کے بارے میں سوچیے۔

جب حضورؐ نے مچھلیوں کے بارے میں کہا کہ یہ مچھلی حلال ہے وہ مچھلی حرام، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مچھلیوں کی قسمیں جانتے ہیں۔ اگر نہ جانتے ہوتے تو کیوں یہ کہا کہ یہ حلال ہے وہ حرام۔ اور خالی یہ حلال وہ حرام نہیں کہا۔ "اس لیے کہ ہمارا وہ مذہب نہیں ہے کہ کہہ دیا تو کہہ دیا"۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ طیّب ہے لہٰذا کہا حلال۔ خبیث ہے لہٰذا کہا حرام۔ تو پہلے جانتے تھے کہ یہ طیّب ہے، یہ خبیث ہے اس لیے کہا کہ یہ حلال ہے وہ حرام۔

وہ چرندوں کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ پرندوں کے بارے میں جانتے تھے وہ جسم کے اندر کے اجزاء کے بارے میں جانتے تھے۔ وہ سارے خصوصیات کے بارے میں جانتے تھے۔ اتنا ہی بڑا کوئی عالم پیدا ہو جائے علم غیب ہو یا نہ ہو۔ علم غیب تو بعد میں طے ہوگا جتنی مخلوقات ہمارے سامنے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایک آدمی ڈھونڈھ کے لاؤ جو اس ساری مخلوقات کے بارے میں جانتا ہو۔ اب تو شعبے اتنے تقسیم ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھے کہ شعبوں کی تقسیم سے تحقیق زیادہ ہو گئی اور ہوئی بھی مگر جہالت بھی آشکار ہو گئی۔ کل ایک حکیم صاحب تھے جو سَر سے پیر تک علاج کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب سر میں درد ہے انھوں نے کہا یہ دوا۔ حضور سینہ میں درد ہے کہا یہ دوا۔ حضور پیروں میں درد ہے کہا یہ دوا۔ دل میں درد ہے کہا یہ دوا۔ جگر میں درد ہے کہا یہ دوا۔ آنکھوں میں درد ہے کہا یہ دوا۔ کان میں درد ہے کہا یہ دوا۔ ایک آدمی سر سے پیر تک کا علاج کرتا تھا۔ اب دنیا تحقیق کر کے آگے بڑھ گئی۔ ان کے پاس گئے سر میں درد ہو رہا ہے۔

بھول نہ جائیے گا۔ جب کان میں تکلیف ہوئی ان کے پاس گئے انھوں نے فوراً دوا بتا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پلٹ کے آئے ہم نے کہا اب دل میں درد ہو رہا ہے۔ کہا، کہیں اور جائیے تحقیقات کے بڑھنے کا ماحصل کیا ہوا، ترقی کرنے کا ماحصل کیا ہوا جتنی ترقی آگے بڑھتی رہی اتنی ہی جہالت واضح ہوتی رہی، اتنا ہی انسان کو احساس پیدا ہوتا رہا کہ ہم کان کے بارے میں جانتے ہیں آنکھ کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔ آنکھ کے بارے میں جانتے ہیں دل کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔ ایک آدمی، آدمی کے بارے میں جاننے والا نہ پیدا ہوا۔ غور فرما رہے ہیں آپ؟۔ آج کی تحقیقی دنیا میں ایک آدمی کوئی ڈھونڈ کے لائیے جو ویسا ہی کان کا علاج کر سکے جیسا آنکھ کا کرتا ہے۔ ویسے ہی آنکھ کا علاج کر سکے جیسے کہ دل کا کرتا ہے۔ ویسے ہی دل کا علاج کرے جیسے جگر کا علاج کرتا ہے۔ ویسے ہی سارے جسم کا علاج کرے جیسے کسی ایک حصّہ کا علاج کرتا ہے۔ اب نہیں پیدا ہوگا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اب معلوم ہو گیا کہ یہ دنیا اتنی وسیع ہے کہ چھوٹا سا انسان اتنا بڑا عالم اکبر ہے کہ ایک آدمی کا علم اس پورے انسان کے وجود کا احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔ جب سامنے بیٹھے ہوئے انسان کو سمجھنے سے دنیا عاجز ہو گئی۔ اتنی بڑی تحقیقی دنیا ایک انسان کو پہچاننے سے عاجز ہو گئی تو ہمیں سوچنا پڑا کہ اس صحرا میں رہنے والا، اس بدّوں ماحول میں رہنے والا، اس غیر ترقی یافتہ دنیا میں رہنے والا ایک انسان اپنے گھر میں بیٹھ کے بغیر اسکول، مدرسہ، کالج، یونیورسٹی دیکھے ہوئے اتنا بڑا صاحب کمال کیسے ہو گیا کہ ساری دنیا کے حالات سے باخبر بھی ہے اور جب معالجہ کی منزل میں آجائے تو وہ سر کا مریض آئے یا دل کا مریض آئے۔ جسم کا مریض آئے یا روح کا مریض آئے۔ دنیا کا بیمار آئے یا آخرت کا بیمار آئے۔ جو بھی آجائے گا اس کا علاج بہر حال کر دے گا۔ ایک نسخہ پیش کر دیا ہے '' وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ''۔

سرکار دو عالمؐ کا حلال قرار دینا یہ علامت ہے کہ یہ شئی طیّب اور پاکیزہ ہے اور حضورؐ کا حرام کہہ دینا یہ علامت ہے کہ یہ شئی خبیث ہے، ناپاک ہے۔ اس میں کیا خباثت پائی جاتی ہے یہ فی الحال موضوع نہیں ہے۔

اب ایک آخری بات اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے، اس کے بعد وہ نتیجہ عرض کروں گا جس کے لیے اتنی دیر تمہید کی زحمت دی ہے۔ اگرچہ یہ زحمت نہیں ہے اس لیے کہ اس سے انشاء اللہ میرے بچّوں کی معلومات میں بہت اضافہ ہوگا اور وہ اپنے قانون کو، اپنی شریعت کو، اپنے مذہب کو پہچانیں گے۔

اسلام نے جب کسی چیز کو حرام قرار دیا تو اس کی کم سے کم تین بنیادیں تھیں کبھی حرام کیا اس لیے کہ اس کا نقصان جسمانی ہے، جسم کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسلام نے کہا زہر حرام ہے تو اسلام کو زہر سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اسلام کو زہر کے ذائقہ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اسلام کو زہر کے رنگ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اسلام زہر کا اس لیے دشمن ہے کہ زہر زندگی کا دشمن ہے۔ نہیں اتنی آسانی سے نہیں، جو لفظ کہہ رہا ہوں اس کے معنی کو پہچانیں۔ میں نے کیا کہا اسلام زہر کا اس لیے دشمن ہے کہ زہر زندگی کا دشمن ہے۔ اسلام کے مزاج کو یاد رکھیے گا کہ جو زندگی کا سہارا دینے والا ہوتا ہے اسلام اسے پسند کرتا ہے، اور جو زندگی برباد کرنے والا ہوتا ہے اسلام اس کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ کسی کے رنگ و روغن کو نہیں دیکھتا، وہ اس کے اثرات کو دیکھتا ہے۔ اثرات میں حیات شامل ہو تو اسلام کی نگاہ میں محبوب ہے۔ اور اثرات میں ہلاکت شامل ہو تو اسلام کی نگاہ میں حرام، مکروہ، ناجائز اور قابلِ نفرت ہے۔ اب آپ نے محسوس کیا کہ ایک وہ زہر کا ٹکڑا جو ایک انسان کو ہلاک کر دے، ایک انسان کو برباد کر دے اسلام اُسے برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ اسلام اس زہر کے ٹکڑے کا دشمن ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انسان کی زندگی کا دشمن ہے۔ تو جب ایک انسان کو ہلاک کر دینے والے زہر کو اسلام اس لیے برداشت نہیں کرتا کہ یہ ایک انسان کا ہلاک کرنے والا ہے، تو اسلام انھیں کیسے برداشت کرے گا جو قوموں کو ہلاک کرنے والے ہیں، جو اُمتوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، جو عالمِ انسانیت کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ اگر اسلام اس ٹکڑے کو برداشت نہیں کر سکتا ہے تو ایسے انسان کو بھی اسلام برداشت

تو اسلام نے زہر کو اس لیے حرام قرار دیا کہ اس کا نقصان جسم کے لیے ہے اور کچھ چیزوں کو اس لیے حرام قرار دیا کہ ان کا نقصان جسم کے لیے نہیں ہے ان کا نقصان روح کے لیے ہے۔ عقل کے لیے ہے۔ جیسے شراب کہ شراب پی کر گر گئے، ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ شراب عقل کی دشمن ہے لہٰذا اسلام شراب کا دشمن ہے۔ ہر چیز کی بنیاد اپنی جگہ پر ہے۔ زندگی کا دشمن تھا زہر۔ اسلام زہر کا دشمن ہو گیا۔ عقل کی دشمن ہے شراب۔ اسلام شراب کا دشمن ہے۔ اسلام نے قتل کو کیوں حرام کیا۔ اس لیے کہ قتل زندگی کا دشمن ہے۔ کہا اگر قتل کو زندگی پسند نہیں ہے تو ہمیں قتل پسند نہیں ہے۔ وجہیں سمجھ رہے ہیں آپ؟ اسلام نے بدکاری کو کیوں حرام قرار دیا اس لیے کہ بدکاری عزّت کی دشمن ہے۔ میں زیادہ وضاحت نہیں کروں گا آپ اہلِ نظر ہیں خود پہچانیں۔ ہمارے یہاں محاورہ ہے اگر نعوذ باللہ کوئی آدمی بدکاری کرے تو کہتے ہیں فلاں نے فلاں کی عزّت لوٹ لی۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بدکاری ایک ایسا عمل ہے جو انسان کی عزّت کا دشمن ہے، اسلام نے اسے حرام بنا دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ تم سے لوگوں کی عزّت برداشت نہیں ہے تو ہم سے تم برداشت نہیں ہو۔ اسلام کا کوئی قانون بلا وجہ نہیں ہے۔ تو جس سے زندگی برداشت نہیں ہے وہ اسلام کو برداشت نہیں ہے۔ جس کو عزّت برداشت نہیں ہے وہ اسلام کو برداشت نہیں ہے۔ جس کو عقل برداشت نہیں ہے وہ اسلام کو برداشت نہیں ہے۔ اسلام نے قانون بنا دیا کہ جو زندگی کا دشمن ہو گا، جو عقل کا دشمن ہو گا، جو عزّتوں کا دشمن ہو گا اُسے ہم برداشت نہ کریں گے۔

اسلام نے کفر کو کیوں حرام قرار دیا۔ اس لیے کہ کفر مذہب کا دشمن ہے دین کا دشمن ہے۔ شرک خدائی کا دشمن ہے۔ تو اگر یہ خدائی کا دشمن ہے تو ہم اس کے دشمن ہیں، ہم اسے خباثت قرار دیں گے۔ ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔ تو اسلام کا ایک قانون ہے جس کی ایک بنیاد ہے مادّی، اور ایک بنیاد ہے معنوی و روحانی۔ کچھ چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے تو شاید اس کا مادّی یا روحانی اثر نہ دکھائی دے لیکن اس کے سیاسی اثرات ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام نے ۹ھ میں سورۂ برائت کے ذریعہ یہ اعلان

کر دیا کہ مشرکین مسجد الحرام کے علاقہ داخل نہ ہونے پائیں۔ اگرچہ علماء نے اس سے یہ بھی دلیل قائم کی ہے کہ مشرکین نجس ہیں کہ ان کا ہاتھ لگ گیا تو بدن نجس ہو جائے گا اور کوئی چیز چھو گئی تو وہ چیز نجس ہو جائے گی۔ لیکن یہ الگ مسئلہ ہے۔ ان کا داخلہ مسجد الحرام میں اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس کی ایک بنیاد سیاسی بھی ہے۔ اسلام یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے پاس کوئی ایسی جگہ بھی ہو کہ جہاں مسلمان آپس میں بیٹھ کر اپنے پرائیویٹ مسائل طے کر سکیں۔ دیکھئے آج ہماری مجبوری کیا ہے۔ ہمارے جتنے اجتماعات ہوتے ہیں ہم کسی اجتماع میں کسی کافر کو روک نہیں سکتے ہیں۔ ہم کسی اجتماع میں کسی مشرک کو روک نہیں سکتے ہیں۔ ہم کسی اجتماع میں کسی یہودی، عیسائی کو منع نہیں کر سکتے ہیں یعنی کہیں بیٹھ کر اپنی بات نہیں کر سکتے ہیں۔ اُتنا ہی کہہ سکتے ہیں جو اُن کو سُنانا چاہتے ہیں۔ اپنا جو راز نہیں بتانا چاہتے ہیں، اپنے جو مسائل نہیں بتانا چاہتے ہیں ان کے لیے کوئی ایک پرائیویٹ جگہ چاہیئے۔ ہر انسان کی زندگی میں کھُلے مسائل بھی ہوتے ہیں اور پرائیویٹ مسائل بھی ہوتے ہیں۔ تو دو طرح کی جگہیں چاہئیں۔ کھُلے مسائل کے لیے الگ میدان چاہیئے۔ پرائیویٹ مسائل کے لیے الگ میدان چاہیئے۔ اسلام نے ایک عام قانون بنا دیا کہ کافر کا داخلہ مسجد الحرام میں حرام ہے۔ ہماری اصل مسجد تو وہ تھی جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے بنائی تھی۔ اس کے بعد جہاں جہاں ہمارے نام پر گھر بنتے رہے ہم نے سب کا نام مسجد رکھ دیا۔ یہ مسجد جو آپ کے سامنے ہے یہ نہ جناب ابراہیمؑ نے بنائی ہے نہ جناب اسمٰعیلؑ نے۔ اللہ کا گھر تو وہ تھا جو ذبیح و خلیل بنا رہے تھے۔ مگر اس کا نام کیا ہے؟ اس کا نام خانۂ خدا ہے یا نہیں؟ اس کا نام رکھا گیا "اللہ کا گھر"۔ اللہ نے کہا تم نے ہمارے نام پر بنایا۔ چلو یہ بھی ہمارا گھر ہے۔ تو اصلی اللہ کا گھر تھا خانۂ کعبہ۔ اب جتنے گھر نامِ خدا پر بنتے رہے سب کو خدا نے اپنا گھر بنا لیا، اور اتنا پاکیزہ بنا دیا کہ جن کا داخلہ کل وہاں حرام تھا ان کا داخلہ یہاں بھی حرام ہو گیا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے سارے مسائل ۹ھ کے تو نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے مسائل تو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی جگہ ایسی چاہیئے کہ جہاں مسلمان اطمینان سے بیٹھ کے اپنے سیاسی مسائل طے کر سکیں۔ یہی وہ خانۂ خدا ہوتا ہے جہاں کافر کا داخلہ ممنوع

ہوتا ہے تو اس حرام کے پیچھے ایک سیاسی مصلحت کام کر رہی ہے کہ یہ مسلمانوں کی اپنی جگہ ہے جہاں غیر نہ آنے پائے۔ اگر آپ کے اوپر یہ بات واضح نہیں ہوئی ہے تو میں ایک لفظ اور کہنا چاہتا ہوں شاید بات واضح ہو جائے۔ جب تک اسلام کے اس قانون پر عمل ہوتا رہا مسلمان زحمتوں سے بچے رہے۔ جب تک کافروں کا داخلہ مسجد میں بند رہا مسلمان ہر زحمت سے بچے رہے۔ اس لیے کہ جو مسجد میں نہیں آسکتا وہ قبضہ بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن جب مسلمانوں کی دنیا میں مروّتوں کا دخل شروع ہوا قانون پیچھے ہٹا۔ مروّت آگے آئی قانون پیچھے ہٹا۔ تعلّقات آگے آئے تو نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے قریب سے یہودی نہ گذر سکتے تھے اب اس کے قریب سے مسلمان نہیں گذر سکتا۔ یہ قانونِ خدا کو چھوڑنے کا انجام تھا اور یہ تجربہ کل ہم نے کیا کہ اگر مسلمانوں نے ان کے داخلہ کو جائز نہ کیا ہوتا تو آج بابری مسجد کی شہادت کا یہ منظر دیکھنے میں نہ آتا۔ جب مسلمانوں نے قانونِ اسلام کو ٹھکرا دیا تو کوئی نہ کوئی بلا بہر حال سامنے آئی اور بلائیں دلیل بنیں کہ اسلام کا کوئی قانون بے مصلحت نہیں تھا۔

بس عزیزانِ محترم! ایک جملہ آپ اور سُن لیں اس کے بعد میں اتنی دیر کی تقریر کا نتیجہ اور خلاصہ آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔ اس وقت آپ کو اندازہ ہوگا کہ اتنی دیر میں نے آپ کو بلا سبب زحمت نہیں دی ہے اور میں آپ کے ذہن کو کہاں لے جانا چاہتا تھا تاکہ وہ لوگ جو قانون اسلام جاننے والے ہیں، پڑھنے والے ہیں، وہ قانونِ اسلام ہی سے مذہب کے حقائق کو پہچانیں۔ الگ سے ہمیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنی باتیں میں نے گذارش کیں اُن میں ایک لفظ کا اور اضافہ کر لیں۔ اسلام جس کی قربت کو برداشت کرتا تھا اسے حرام نہیں کیا، اور جس سے مسلمان کو الگ رکھنا چاہتا تھا اس کو حرام کر دیا۔ اسلام نے ہم سے کہا فلاں چیز حرام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم چاہتے ہیں تم الگ رہو یہ الگ رہے۔ مسلمانو! چوری تمھارے لیے حرام ہے، ہم تم کو چوری سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ زنا تمھارے لیے حرام ہے، ہم تم کو بدکاری سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ غصب کرنا تمھارے لیے حرام ہے، ہم تم کو اس سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ فلاں گوشت تمھارے لیے حرام ہے، ہم اس سے تم کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ فلاں مچھلی تمھارے لیے

حرام ہے ہم تم کو اس سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ اب تو آپ سمجھ گئے کہ حرام کرنے کے معنی کیا ہیں؟ جس کی قربت گوارا نہیں ہے۔ نہیں۔ پھر ایک لفظ کہوں گا تاکہ آپ اس محسوس کرلیں تو بعد میں نتیجہ آپ کے سامنے گذارش کروں۔ جس کو اسلام مسلمان سے الگ رکھنا چاہتا ہے اسے حرام کر دیا۔ جس کی قربت گوارا ہے اسے حلال کر دیا۔ بکری کا گوشت حلال ہے۔ ہاتھ میں رہے تو حلال ہے۔ منھ میں رہے تو حلال ہے۔ شکم میں رہے تو حلال ہے۔ اسلام نہیں روکتا ہے۔ اتنا قریب ہو جائے کہ آپ کے شکم کو اس کا ظرف بنا دیا جائے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم اس کی قربت کو گوارا کرتے ہیں۔ ہم نے نکاح کیوں رکھا ہے اس لیے کہ ہم تم کو عورت سے الگ نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم تم کو بدکاری سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ اگر عورت سے مرد کو الگ رکھنا چاہتے تو نکاح کو بھی حرام کر دیا ہوتا۔ تو جس کی قربت گوارا ہے اسے حلال بنا دیا اور جس کو الگ رکھنا چاہا اس کو حرام بنا دیا۔

اس نکتہ کو یاد رکھیے گا جس کی قربت اسلام کو گوارا ہے وہ ہے حلال، اور جس کی قربت اسلام کو گوارا نہیں ہے وہ ہے حرام۔ اور حلال و حرام کی بنیاد کیا ہے جو پاکیزہ ہے وہ حلال۔ جو خبیث ہے وہ حرام۔ اب نتیجہ نکلا کہ اسلام پاکیزہ چیزوں کی قربت چاہتا ہے اور خبیثوں کی قربت نہیں چاہتا ہے ان کو الگ رکھنا چاہتا ہے۔

بس عزیزو! اتنی دیر کی تقریر ذہن میں رکھیں گے۔ اب میرا ایک سوال ہے وہ پیغمبرؐ جو اتنا باخبر ہے کہ جن مچھلیوں کو نہیں دیکھا دریا میں ان کی حقیقت بھی جانتا ہے۔ طیّب کون ہے خبیث کون ہے۔

وہ پیغمبرؐ جس نے فضا میں جاکے پرندوں کو نہیں دیکھا مگر ان کو بھی پہچانتا ہے کہ اس میں طیّب کون ہے اور خبیث کون ہے۔

وہ پیغمبرؐ جو جانوروں کے درمیان نہیں رہا مگر ان کو پہچانتا ہے کہ ان میں پاکیزہ کون ہے اور ناپاک کون ہے۔

اندر طیّب کیا ہے اور خبیث کیا ہے۔

مسلمانو! ایک بات مجھے بتاؤ جو اتنا باخبر پیغمبرؐ ہے کہ جن مچھلیوں کو نہیں دیکھا ان کے پاک اور ناپاک کو پہچانتا ہے۔ جن پرندوں کو نہیں دیکھا ان کے طیّب و خبیث کو پہچانتا ہے۔ تو کیا جن کو چوبیس گھنٹے دیکھتا رہا انھیں نہیں پہچانتا کہ پاکیزہ کون ہے اور ناپاک کون ہے۔

اب میری لفظوں پر آپ توجہ دیں۔ اتنی بلند نگاہ رکھنے والا جو فضا کے جانوروں کے طیّب و خبیث کو پہچانتا ہے۔ اتنی گہری نگاہ رکھنے والا جو دریاؤں کے طیّب و خبیث کو پہچانتا ہے۔ اتنی وسیع نگاہ رکھنے والا جو دنیا بھر کے طیّب و خبیث کو پہچانتا ہے کیسے ممکن ہے کہ جو اس کی نگاہ کے سامنے آجائیں وہ نہ پہچان سکے ان میں طیّب کون ہے اور خبیث کون ہے۔ اور جب پہچانتا ہے تو پھر طیّب اور خبیث کے پہچاننے کا طریقہ کیا ہے۔ حلال، حرام۔ یہی کام تو پیغمبر کرتا تھا کہ کچھ کو حلال قرار دیا جو طیّب ہیں کچھ کو حرام بنا دیا جو خبیث ہیں۔ اور حلال و حرام کے معنی یہ ہیں کہ اِن کی قربت گوارا ہے اُن کی قربت گوارا نہیں ہے۔ فرق پہچان لیا کہ جو نبیؐ کی نگاہ میں طیّب ہے اُس کو نبیؐ قریب کرنا چاہتا ہے۔ اُن کی قربت حضور کو گوارا ہے اور جو نبیؐ کی نگاہ میں خبیث ہے انھیں دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہم نے دونوں منظر دیکھے۔ فارس کے رہنے والے کو طیّب دیکھ کے اہلبیتؑ میں شامل کرلیا۔ محفل میں بیٹھنے والے کو اُٹھا دیا۔

اگر کوئی انسان شریعتِ پیغمبرؐ کو پہچانتا ہے۔ اگر کوئی انسان قانونِ پیغمبرؐ کو پہچانتا ہے۔ اگر کوئی انسان شریعتِ پیغمبرؐ کی بنیادوں کو پہچانتا ہے تو اسے علمِ پیغمبرؐ پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔ اُسے یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ سرکار کے قانون کا مزاج یہ ہے کہ اس قانون کو طیّب برداشت ہیں، خبیث برداشت نہیں ہیں۔ اس قانون کو پاکیزہ برداشت ہیں ناپاک برداشت نہیں ہیں۔ یہ پانی ناپاک ہوگیا۔ اچھا خاصا پانی تھا لوٹے میں ایک قطرہ خون پڑ گیا ناپاک ہوگیا۔ کہا اب یہ برداشت نہیں ہے۔ ابھی تک یہ پاک تھا برداشت تھا۔ اب نجس ہوگیا۔ ارے حضور شروع سے نجس نہیں تھا خالی ایک قطرہ خون پڑ گیا۔ اب نجس ہوگیا۔

اب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ ہم کو اس سے کیا مطلب کہ اس لوٹے میں سال بھر سے رکھا تھا کہ دو سال سے رکھا تھا کہ چار سال سے رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے بائیس تیئس سال سے رکھا رہا ہو، مگر جب تک نجاست نہیں پڑی تھی قابلِ برداشت تھا۔ جب نجاست پڑ گئی اب پرانا حساب کرنے سے کیا فائدہ۔ اس لیے کہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ طیّب ہے تو برداشت ہے۔ خبیث ہے تو برداشت نہیں ہے۔ کل کا خبیث ہو تو برداشت نہیں ہے، آج کا خبیث ہو تو برداشت نہیں ہے۔ نیا خبیث ہو تو برداشت نہیں ہے، پرانا خبیث ہو تو برداشت نہیں ہے۔

اور یہیں سے آخری جملہ۔ آپ تصویر کے دوسرے رُخ کو پہچان لیں۔ جو خبیث ہے اسلام چاہتا ہے ہمارے ماننے والے اس سے الگ رہیں۔ جو طیّب ہے اس سے قریب رہیں۔ جو پاکیزہ ہے اس سے قریب تر رہیں۔ تو ظاہر ہے یہ چیزیں جو پاکیزہ ہیں ہمارے سامنے ہیں اُن سے ہم قریب رہ سکتے ہیں۔ جو نجس ہیں، خبیث ہیں، ناپاک ہیں اُن سے ہم کو الگ رکھا گیا ہے۔ اب سوچئے آپ۔ یہ چیزیں جو فطرتاً پاکیزہ ہیں، جن کو خدا نے پاکیزہ کہہ دیا ہے یہ سب ہم سے قریب ہیں۔ جو نجس، ناپاک ہیں وہ ہم سے الگ ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو فطرتاً پاکیزہ بنائی گئی ہیں، جو فطرتاً طیّب و طاہر بنائی گئی ہیں لہٰذا یہ ہم سے قریب تر ہیں۔ اب جو جتنا پاک ہوگا اسلام اس کی اتنی قربت چاہے گا تاکہ تمھارے مزاج میں طہارت پیدا ہو جائے۔ ہم نے خبیث و نجس و ناپاک کو تم سے اسی لیے الگ رکھا ہے کہ کہیں تمھارے مزاج میں خباثت نہ پیدا ہو جائے۔ تو جو جتنا پاک ہو اپنے کو اس سے اتنا ہی قریب رکھو تاکہ اس کی طہارت تم میں طہارت پیدا کرے، اس کی پاکیزگی تم میں پاکیزگی پیدا کرے۔ اور اگر کوئی اتنا طیّب و طاہر ہو کہ خدا کہے کہ ہم اتنا پاک و پاکیزہ رکھنا چاہتے ہیں جو حقِ طہارت ہے تو اسلام مسلمان کو اتنے پاکیزہ افراد سے اتنا ہی قریب کرنا چاہے گا۔ بس میں ایک آخری لفظ کہہ رہا ہوں پہچانئے گا۔ جتنا وہ پاکیزہ ہیں اسلام اتنی ہی قربت چاہتا ہے۔ ظاہری قربت کی آخری حد یہ تھی کہ محفل میں آکے بیٹھ گئے لیکن ابھی قربت کی ایک منزل اور بھی ہے محفل میں بیٹھنا الگ ہے دل میں بیٹھنا الگ ہے۔ غور کریں آپ۔ جو ظاہری پاک تھے ان کی قُربت نے محفل تک پہنچایا، اور جو باطنی پاک تھے اُن کی قُربت نے دل تک

پہنچایا۔ محفل میں بیٹھنے کا نام ہے ہم نشینی۔ دل میں بیٹھنے کا نام ہے مودت۔

رسالت کی زحمتوں کی اُجرت محفل آلِ محمدؐ میں بیٹھنا نہیں ہے۔ اس کی قیمت، اس کی اُجرت، اس کا معاوضہ مودت ہے، محبّت ہے۔ انھیں اپنے دل میں جگہ دو اور خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اس قانونِ الٰہی پر عمل کیا اور ہم نے بہرحال اپنی حیثیت کے مُطابق اپنے پاکیزہ نفس ہونے کا ثبوت دیا اور ہم نے اپنے دل میں انھیں جگہ دی جن سے زیادہ طیّب وطاہر کوئی نہیں ہے۔ ہم نے کسی خبیث کو اس دل کے قریب سے گذرنے بھی نہیں دیا، اور جو طیّب وطاہر تھے انھیں باہر رہنے نہیں دیا۔ طیّب ایک ہوگا وہ بھی اسی دل میں رہے گا۔ پانچ ہوں گے وہ بھی اسی دل میں رہیں گے۔ بارہ[۱۲] ہوں گے وہ بھی یہیں رہیں گے۔ چودہ[۱۴] ہوں گے وہ بھی یہیں رہیں گے۔ ان سے وابستہ ہو کر بہتر[۷۲] ہوں گے تو وہ بھی یہیں رہیں گے۔

بس عزیزانِ محترم! گفتگو تمام ہو رہی ہے۔ لہٰذا جو پاکیزہ تھے انھیں ہم نے اپنے دل میں جگہ دی۔ آج شبِ جمعہ ہے۔ شبِ جمعہ زیارت امام حسینؑ مستحبات میں ہے۔ روز جمعہ زیارت امام حسینؑ مستحبات میں ہے۔ جب امام حسینؑ کی زیارت پڑھتے ہیں تو اسی کے ساتھ امام حسینؑ کے چاہنے والے، ان کے ساتھ راہِ خدا میں قربان ہونے والے انصار، اصحاب، جاں نثاروں کی زیارت پڑھی جاتی ہے تو آپ کیا کہتے ہیں "طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْاَرْضُ الَّتِیْ فِیْهَا دُفِنْتُمْ" کربلا والو! تم طیّب ہو۔ کربلا والو! تم پاکیزہ ہو، اور جس زمین میں دفن ہو گئے وہ زمین بھی پاکیزہ ہو گئی۔ اب آپ نے محسوس کیا کہ پاکیزہ افراد کے جسم جس زمین میں دفن ہو جائیں وہ زمین بھی پاکیزہ ہے تو پاکیزہ افراد کی محبّت جس دل میں سما جائے وہ دل کیوں نہ پاکیزہ ہوگا۔ یہ صاحبانِ ایمان کا مقدّر ہے، یہ صاحبانِ ایمان کی خوش قسمتی ہے کہ مالک کائنات نے ایسے پاکیزہ افراد کی محبّت انھیں عنایت کی ہے۔ جس نے آ کے ان کے دلوں کو طیّب وطاہر بنا دیا ہے۔ اُن کے دلوں کو پاک وپاکیزہ بنا دیا ہے۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ سال بھر ممکن ہے ہمارے اعمال میں کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہوں لیکن جہاں پاکیزہ افراد کے دل میں آنے کا وقت آیا، جہاں کربلا والوں کی یاد ان کے خیال کے دل میں آنے کا وقت آیا زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ یہ کام نہ کرو محرم آگیا ہے۔ یہ غلطی

نہ کرو محرم آگیا ہے۔ یہ بُرائی نہ کرو محرم آگیا ہے۔ پاکیزہ لوگوں کی یاد کیا آئی کہ دلوں کو پاکیزہ بنا دیا۔ بس یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ عاشورِ محرم تمام ہونے کے بعد بھی یہ یاد دل میں رہ جائے تاکہ پاکیزگی برقرار رہے۔ کیا کہنا ان کا جو حسینؑ کے ساتھ رہنے والے حسینؑ کے ساتھ قربان ہو جانے والے، حسینؑ کے خاندان سے باہر والے۔ جب وہ ایسے طیّب و طاہر ہیں تو جو حسینؑ کے گھرانے والے ہیں، جو حسینؑ کے خاندان والے ہیں، جو حسینؑ کی گود کے پالے ہیں، جو حسینؑ کے دل کے ٹکڑے ہیں وہ کیسے طیّب و طاہر افراد ہوں گے۔ آج میں اسی تذکرہ کو چند لمحہ میں آپ کے سامنے گذارش کر کے بیان کو تمام کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے انصارِ حسینؑ کا ایک اجمالی خاکہ کل آپ کے سامنے عرض کیا تھا۔ ایک بات جو کبھی اس سے پہلے کہنے کا موقع نہ ملا اور اکثر لوگوں نے تقاضا کیا کہ کیا وجہ ہے کہ خانوادۂ بنی ہاشم کے شہدا ر میں عون و محمد کا ذکر آتا ہے، قاسم و علی اکبر کا ذکر آتا ہے، علی اصغر و حضرت عباسؑ کا ذکر آتا ہے، اور بھی تو بنی ہاشم میں قربانی دینے والے تھے ان کا تذکرہ کیوں نہیں آتا۔ اس لیے آج کی تاریخ میں مَیں نے یہ چاہا کہ بنی ہاشم کے ان شہدار کا تذکرہ کیا جائے جن کا ذکر عام طور سے نہیں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعداد زیادہ ہے۔ میں سارے تذکرے تو گذارش نہیں کروں گا فقط ایک لفظ اس سلسلہ میں عرض کرنا ہے۔ اگر آپ متوجہ ہو گئے تو آپ کے رونے اور مثاب ہونے کے لیے یہ ایک لفظ کافی ہے۔ وہ ہاشمی شہدار جنھیں بنی ہاشم کہا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ کربلا میں اس گھرانے کے قربان ہونے والے افراد کو بنی ہاشم صرف شجرہ کی بنیاد پر کہا جاتا ہے ورنہ اس حقیقت سے دنیا میں کوئی نہیں انکار کر سکتا ہے کہ کربلا میں دینِ خدا کے لیے جتنے افراد کام آئے سب اولادِ ابوطالبؑ تھے۔ بنی ہاشم تو اس کے اوپر کا شجرہ ہے۔ اگر بنی ہاشم کربلا میں قربان ہوئے ہوتے جو جناب ہاشم کی نسل میں تھے تو کوئی عباسؑ کے گھرانے کا دکھائی دیتا، کوئی ابولہب کے گھرانے کا ہوتا، کوئی حارث کے گھرانے کا ہوتا، کوئی اور کسی کے گھرانے کا ہوتا۔ کوئی نظر نہیں آتا۔ جتنے ہیں سب ابوطالبؑ کے گھرانے کے ہیں۔ اگر اولادِ جعفرِ طیارؑ ہے تو وہ ابوطالبؑ کی اولاد ہے۔ اگر اولادِ عقیلؑ

ہے تو وہ ابو طالبؑ کی اولاد ہے۔ اگر اولادِ علیؑ ہے تو وہ ابو طالبؑ کی اولاد ہے۔ اگر اولادِ حسنؑ ہے تو ابو طالبؑ کی اولاد ہے۔ اگر اولادِ حسینؑ ہے تو ابو طالبؑ کی اولاد ہے۔ محاذ تحفظ دین پر کوئی نہیں ہے سوائے اولاد ابو طالبؑ کے۔ کل بھی دین کو بچایا ابو طالبؑ نے بچایا اور آج بھی اگر کربلا میں کسی نے دین کو بچایا تو اولادِ ابو طالبؑ نے بچایا۔

بس اس کے بعد وہ آخری بات کہنا چاہتا ہوں۔ کاش میری بات آپ کے دلوں تک پہنچ جائے اور اب نہیں تو جب گھر جا کے سوچیں گے تو سوچئے گا کہ ان مظلوموں کی مظلومیت کے بارے میں۔ جتنے اولاد ابو طالبؑ کربلا میں آئے، ان میں اکثر افراد وہ ہیں کہ جن کے ساتھ وہ خواتین بھی ہیں جنھوں نے انھیں اپنی گود میں پالا ہے۔ یا جو ان کے ساتھ کسی گود میں پلی ہیں۔ سب سے پہلے کربلا میں جو بنی ہاشم کی قربانی پیش ہوئی وہ اولاد عقیلؑ کی ہے۔ سب سے پہلے انصار کے بعد، اصحاب کے بعد جو قربانی سامنے آئی وہ اولاد عقیلؑ کی قربانی ہے مسلم اور مسلم کے گھر والے۔ سوچئے جب مسلم کے لال قربانی کے لیے جا رہے تھے تو کیا گھر میں وہ ماں نہیں تھی جو کل فرزندِ رسولؐ کے ساتھ آرہی تھی۔ اگر میرے بچوں کو نہیں معلوم ہے تو معلوم ہونا چاہیئے کہ جناب مسلم کی زوجہ جناب عباسؑ کی بہن تھیں۔ اسی لیے جب راستہ میں قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اور کسی نے آ کے مسلم کی شہادت کی خبر سنائی اور خیمہ کے اندر یہ خبر پہونچی تو ظاہر ہے کہ جس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا گھر اُجڑ گیا، جس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا سہاگ اُجڑ گیا، جس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری زندگی کا سہارا ختم ہو گیا اُس کا کیا عالم ہونا چاہیئے۔ مگر جیسے ہی بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ عباسؑ آ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ بہن! ابھی یہ بھائی زندہ موجود ہے۔ بہادروں کی بہنیں مصیبتوں پر صبر کیا کرتی ہیں، مصیبتوں میں پریشان نہیں ہوا کرتی ہیں۔ مگر کل وارث کے مرنے کی خبر سُنی، آج کربلا میں بیٹوں کی قربانی سامنے آئی ہے۔ یہ پہلا مرحلہ صبر تھا اس کے بعد جب اولاد جعفر طیارؑ جانے لگی تو جہاں عون و محمد جا رہے ہیں وہاں وہ خاتون بھی تو خیمہ کے اندر موجود ہے۔ جس نے ان بچوں کو پالا ہے۔ وہ پالنے والی بھی اسی خیمہ میں

ہے جو اپنے بچوں کا داغ اُٹھانے والی ہے۔ یہاں بھی وہ ماں موجود ہے اگر قاسمؑ میدان میں جارہے ہیں تو خیمہ میں اُمّ فروہ بھی تو موجود ہیں۔ یہ نہ دیکھو حسینؑ کے دل پر کیا گذر رہی ہے یہ سوچو جب بیٹا قربان ہورہا ہے تو ماں کا کیا عالم ہے۔

سُنتے چلو عزیزو! جب علی اکبرؑ میدان میں جارہے ہیں تو بعض روایات کی بنا پر وہ ماں بھی تو وہیں موجود ہے جس کی مجبوری کا یہ عالم ہے کہ بیٹا مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے مگر دُعا کے لیے ہاتھ نہیں اُٹھا سکتی۔ یہ ہیں اولادِ ابو طالبؑ کی قربانیاں اور ان پردیسانیوں کی یہ مجبوریاں۔ فقط ایک خاتون تھی جس کی اولاد کربلا میں قربان ہوئی مگر ماں کربلا میں نہیں تھی۔ سوچیے گھر جا کے۔ اگر قاسمؑ قربان ہوئے تو اُمّ فروہ نے یہ منظر دیکھا۔ اگر اکبرؑ گئے تو لیلیٰ نے یہ منظر دیکھا۔ عون و محمد گئے تو ثانیٔ زہراؑ نے یہ منظر دیکھا۔ اولادِ مسلم گئی تو ماں نے یہ منظر دیکھا۔ ایک ماں ایسی تھی جس کے چار بیٹے قربان ہو گئے اور ماں نے یہ منظر نہ دیکھا۔

جب مدینہ میں یہ خبر پھیلی کہ قافلہ واپس آیا ہے۔ بشیر نے کہا کہ خبر قبرِ پیغمبرؐ کے پاس سُناؤں گا۔ تو کہا جاتا ہے کہ ایک ضعیف خاتون دھیرے دھیرے مسجدِ پیغمبرؐ میں آئیں کہ ذرا میں بھی تو سُنوں بشیر کیا خبر لے کے آیا ہے۔

جیسے ہی بشیر نے کہا مدینہ والو! کیا بیٹھے ہو حسینؑ مارے گئے۔ بس اس خاتون کو جلال آگیا۔ کہا بشیر! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کہا قافلہ تو پلٹ کے آیا مگر حسینؑ مارے گئے۔ میں یہ خبر سُنانے کے لیے آیا ہوں۔ ایک مرتبہ خاتون جو یہ سوچ رہی تھی کہ بشیر یہ کیا کہہ رہا ہے واقعاً حسینؑ مارے گئے؟ کہا ہاں صحیح سُنا رہا ہوں حسینؑ مارے گئے۔ میرے پاس مستند خبر ہے۔ بس یہ سُننا تھا کہ خاتون کو جلال آگیا۔ اگر حسینؑ مارے گئے تو جو غلامی کا دم بھرتا تھا وہ کہاں تھا، جو اپنے کو غلام کہتا تھا وہ کہاں تھا؟ جو اپنے کو فدیہ کہتا تھا وہ کہاں تھا؟۔ ہائے یہ کیا ہو گیا، کیا مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا شہزادی فاطمہ زہراؑ کے سامنے۔ کہ ان کا لال مارا گیا۔ بشیر نے کہا بی بی یہ نہ کہیے گا۔ جب تک آپ کے لال زندہ تھے مولاؑ پر آنچ نہ آسکی۔ مگر جب کوئی نہ رہ گیا۔

اب جو خبر پھیلی تو عورتوں نے آ کے کہا اُمّ البنین! پُرسہ قبول کیجئے۔ فرمایا مجھے اُمّ البنین نہ کہو۔ میں اُمّ البنین تھی جب میری اولاد تھی۔ اب تو میرے بچے میرے مولاؑ پر قربان ہو گئے۔ بیبیوں نے کہا ارے پُرسہ تو قبول کیجئے۔ فرمایا ایک بات بتادو کیا یہ خبر صحیح ہے کہ جب میرا لال گھوڑے سے گرا تو اس کے ہاتھ نہیں تھے۔ سوچا عزیزو! اُمّ البنین نے کیا کہا۔ اے بھائیو! بتاؤ کیا یہ صحیح ہے کہ جب میرا لال گھوڑے سے گرا تو اس کے ہاتھ قطع ہو گئے تھے؟ ماں یہ سوچ رہی ہے کہ گرنے والا ہاتھوں کا سہارا لیتا ہے ہائے میرا لال۔ سر زخمی۔ جب گھوڑے سے گرا ہو گا تو میرے شیر کا کیا عالم ہوا ہو گا...... وا محمّداہ وا علیّاہ۔

سَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ۔

مجلس ۔ ۶

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ
الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مَوْلَانَا اَبِى الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ
وَعَلٰى اَهْلِ بَيْتِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ
عَلٰى اَعْدَائِهِمْ اَجْمَعِيْنَ۔
اَمَّا بَعْدُ!

صاحبانِ ایمان وہ ہیں جو اس رسولؐ نبیِ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے۔ طیّبات کو حلال قرار دیتا ہے، خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت کے سر سے اس بوجھ کو اُٹھا لیتا ہے جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی ہوئی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ دیتا ہے جن میں انسانیت جکڑی ہوئی ہے۔ جو لوگ ایسے پیغمبرؐ پر ایمان لائے، اس کا احترام کیا، اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو پیغمبرؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہی لوگ زندگانیِ دنیا میں کامیاب ہیں۔

آیۂ کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا رسالتِ الٰہیہ کے عنوان سے، آج اس کے چھٹے مرحلہ پر پیغمبرِ اسلامؐ کی اس صفت کے بارے میں کچھ باتیں گذارش کرنا ہیں جس کا تذکرہ قرآن مجید نے ان لفظوں میں کیا ہے کہ پیغمبرؐ عالمِ انسانیت کو اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس بوجھ کے نیچے عالمِ انسانیت دبا ہوا ہے اور پیغمبرؐ ان زنجیروں کو توڑ دیتا ہے جن زنجیروں میں عالمِ انسانیت جکڑا ہوا ہے۔

درحقیقت یہ پیغمبرِ اسلامؐ کے خدمات، پیغمبرؐ کی تبلیغ اور پیغمبرؐ کے کارہائے نمایاں کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ نے عالمِ انسانیت کی اصلاح کا کام کس دور میں اور کن حالات میں شروع کیا ہے۔

آج میرے موضوع کا بیشتر حصّہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن تاریخ کے بارے میں آپ نے یہ فقرہ بارہا سُنا ہوگا کہ تاریخ اپنے کو دوہراتی رہتی ہے۔ واقعات، پیغمبرِ اسلامؐ کے آنے کے پہلے کے ہیں لیکن اگر آپ حالاتِ دنیا کا جائزہ لیں گے تو اندازہ ہوگا کہ جو صورت حال پیغمبرؐ کے آنے سے پہلے تھی وہ صورت حال پیغمبرؐ کے جانے کے بعد بھی دنیا میں باقی ہے۔

عالمِ انسانیت سرکارِ دو عالمؐ کے آنے سے پہلے دوؔ طرح کی پریشانیوں میں مبتلا تھا:

انسانیت کے سر پر ایک بوجھ تھا جس کے نیچے انسانیت دبی ہوئی تھی اور انسانیت کے سامنے کچھ زنجیریں تھیں جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔

پیغمبرؐ کی دوؔ ذمہ داریاں تھیں۔ اس بوجھ کو اُٹھالیں تاکہ آدمی سر اُٹھانے کے قابل ہوجائے اور ان زنجیروں کو توڑ دیں تاکہ انسان میں احساسِ حریت اور احساسِ آزادی پیدا ہوسکے۔

وہ بوجھ کیا تھا جس کے نیچے انسان دبا ہوا تھا۔ وہ زنجیریں کون سی تھیں جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔ یہ موضوع بہت طویل ہے لیکن میں مختصر لفظوں میں جو باتیں گذارش کرنا چاہتا ہوں وہی باتیں ہیں۔ جو ہماری آج کی زندگی سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور ان تذکروں کی روشنی میں آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ سرکارِ دو عالمؐ نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور سرکارِ دو عالمؐ کے کارناموں کو آج دوہرانے کی ضرورت کیوں ہے؟ ان تذکروں کا لزوم کیا ہے کہ پیغمبرؐ کے آنے سے پہلے کی تاریخ آج دُوہرائی جائے؟

اس لیے کہ اگر تاریخ اپنے کو دُوہرا رہی ہے تو تذکرہ کا دوہرانا بھی ضروری ہے۔ اگر تاریخ اپنے واقعات کو پھر دوبارہ سامنے لارہی ہے تو ان تذکروں کو بھی سامنے لانا چاہیے جن تذکروں میں اس جہاد کا ذکر پایا جاتا ہے جس جہاد کی بنیاد پر عالمِ انسانیت کو

وہ آزادی نصیب ہوئی تھی جو دورِ جاہلیت میں حاصل نہیں تھی۔

عزیزانِ محترم! آپ بہتر جانتے ہیں کہ دنیا میں بوجھ کی بھی ۲ دو قسمیں ہوتی ہیں:
ایک بوجھ مادی ہوتا ہے جو کسی کے کاندھے پر یا کسی کے کاندھے پر یا کسی کے سر پر لاد دیا جاتا ہے۔ آپ کوئی لوہا کسی کے سر پر رکھ دیں یہ بوجھ ہے۔ لکڑی لا کے سر پر رکھ دیں یہ ایک بوجھ ہے۔ کوئی چیز اور اٹھا کے کسی کاندھے پر رکھ دیں یہ ایک بوجھ ہے۔ لیکن یہ بوجھ مادی ہے۔ ظاہر ہے جو غریب آدمی ہے کمزور آدمی ہے، وہ اس بوجھ کے اُٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ جب اس کے کاندھے پر بوجھ رکھ دیا جائے گا تو خود ہی غریب نہ اُٹھ سکے گا بوجھ کیا اُٹھائے گا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ایک بار گراں ہوتا ہے انسان کے لیے جو مادی نہیں ہوتا ہے وہ خیالات کا بوجھ ہوتا ہے اور خیالات کا بوجھ مادی بوجھ سے کہیں زیادہ سنگین ہوتا ہے اس لیے کہ اگر بوجھ لوہے، لکڑی کا ہو تو کم سے کم آدمی کے خیال میں اتنا دم رہتا ہے کہ اسے اٹھا لیا جائے لیکن اگر بوجھ خیالات ہی کا ہے تو اس کا ہٹانے والا کون ہوگا۔ یعنی اگر خیالات خود ہی آدمی کے سر پر بوجھ بن گئے ہیں تو ان خیالات کو کون ہٹائے گا۔ جتنا آدمی کوشش کرے گا خیال اور مستحکم ہوتا جائے گا۔

واقعہ آپ کو معلوم ہوگا۔ یقیناً آپ نے سُنا ہوگا۔ ایک بیچارہ طالب علم (student) جب مدرسہ جاتا تھا سبق یاد نہیں ہوتا تھا اور روز مار کھاتا تھا۔ ایک دن کسی مرشد کے پاس گیا اور کہا کہ حضور مار کھاتے کھاتے تھک گیا۔ اب کوئی ترکیب بتائیے کہ اسکول جاؤں اور مار نہ کھاؤں۔ کہا ہاں ترکیب بہت آسان ہے۔ جب کبھی گھر سے باہر نکلو تو کسی کوّے کا خیال تمہارے ذہن میں نہ آنے پائے کبھی اسکول میں مار نہیں کھاؤ گے۔ اسے نسخہ معلوم ہو گیا۔ نسخہ اس نے ذہن میں محفوظ کر لیا اگر کوّے کا خیال نہیں آئے گا تو مار نہیں کھائیں گے اس سے پہلے جب بھی اسکول کے واسطے نکلتا تھا کہیں دور دور اس کے ذہن میں کوّے کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب آج کے نسخہ کے بعد جیسے ہی گھر سے باہر قدم نکالا اسکول کا منظر نظر کے سامنے آیا، جانا ہے مار کھانا ہے۔ مار کھانے کا خیال آیا تو بچنے کا خیال آیا۔ بچنے کا خیال آیا تو مرشد کا خیال آیا۔ مرشد کا خیال آیا تو ان کے بتائے ہوئے نسخہ کا خیال

آیا۔ نسخہ یاد آیا تو کوا یاد آیا۔ یعنی یہ غریب جس چیز سے اپنے کو بچانا چاہتا تھا اسی میں مبتلا ہو گیا۔ یہ تھی خیال کی پریشانی۔ اگر انھوں نے یہ کہہ دیا ہوتا کہ جب گھر سے نکلنا تو جیب میں پیسہ لے کر نہ جانا تو بہت آسان تھا۔ اگر جیب میں پیسہ ہوتا تو نکال کے پھینک دیتا چاہے کوئی فقیر اُٹھا لے جائے مار تو نہ کھائے گا۔ اگر یہ کہہ دیا ہوتا گھر سے جانا تو فلاں طرح کا لباس پہن کے نہ جانا تو کپڑے بدل کے جاتا۔ چاہے لوگ مذاق اڑاتے مار تو نہ کھاتا۔ اس لیے کہ مسئلہ جب مادی ہوتا ہے تو اس کا علاج کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسئلہ ہی فکری ہو جائے، جب مسئلہ ہی خیالی ہو جائے تو اس بوجھ کو کون اُتارے گا۔ اس خیال کو کون ہٹائے گا۔ اسلام یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ آئے تھے تو معاشرہ ایسے خیالی بوجھ کے نیچے دبا ہوا تھا جو بظاہر تو کوئی بوجھ نہیں تھا مگر خیال نے اتنا بڑا بوجھ بنا رکھا تھا کہ کسی میں سر اُٹھانے کی ہمّت نہیں تھی۔

عزیزو! اگر میری بات واضح نہیں ہوئی ہے تو میں ایک جملہ اور گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ خیالی بوجھ ایسا قیامت خیز ہوتا ہے کہ اس کے آگے سر اُٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میدان میں جا کے دشمن کے سامنے کھڑے ہو کے تلوار کی زد پہ آ کے اگر کسی میں خوف پیدا ہو جائے تو ایک بات سمجھ میں آتی ہے یہ سپاہی کا خوف ہے، یہ تلوار کا خوف ہے، یہ زخموں کا خوف ہے، یہ میدان کا خوف ہے۔ لیکن محفل میں آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ اپنوں کے درمیان بیٹھا ہے اپنی محفل میں ہے حضورؐ کے زیر سایہ اور اس کے بعد فقط سُن لیا ہے کہ کوئی کہتا ہے "هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ" ہے کوئی جو مقابلہ پر آئے اور سر نہیں اُٹھ رہا ہے۔ یہ لوہے کا بوجھ نہیں ہے جو سر کو جھکائے ہوئے ہے۔ یہ لکڑی کا بوجھ نہیں ہے یہ وہم کا بوجھ ہے کہ اس سے بڑا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ یہ خیال کا بوجھ ہے۔ سوچئے خیال کا بوجھ کتنا سنگین ہوتا ہے کہ نبی اٹھانا چاہ رہے ہیں۔ حضورؐ شوق دلا رہے ہیں۔ کون جائے گا، اس کی اوقات کیا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے، یہ کچھ نہیں ہے مگر اس کے بعد بھی خیالی بوجھ ذہن پر ہے اور وہ بوجھ سر اُٹھانے نہیں دیتا ہے۔ جس کو تاریخ نے پرندہ کہا ہے حالانکہ پرندہ تو بہت ہلکا ہوتا ہے۔

پرندہ اگر کسی کے سر پر آ کے بیٹھ جائے تو انسان سر اٹھانے کے لائق رہ جاتا ہے۔ یہ پرندہ کیا ہے یہ تو ایسا لوہے کا بوجھ معلوم ہو رہا ہے کہ جس کے بعد کسی آدمی میں سر اُٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔ اب آپ نے محسوس کیا کہ خیالی بوجھ کتنا سنگین ہوتا ہے۔ اب میرا ایک لفظ کہنے کو جی چاہتا ہے خدا نہ کرے کہ کسی کی شان میں گستاخی ہو جائے۔ اللہ نے کہا یہ میرا پیغمبرؐ وہ ہے کہ جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی ہوئی تھی اس بوجھ کو ہٹا لیا ہے، انسانیت کو سر اُٹھانے کے قابل بنا دیا ہے۔ جس پیغمبرؐ کا کل یہ کارنامہ تھا کہ کفار کا خیالی بوجھ اُتار لیا، مشرکین کا خیالی بوجھ ہٹا دیا، منحرفوں گمراہوں کا بوجھ ہٹا دیا انھیں سر اُٹھانے کے قابل بنا دیا۔ خدا جانے یہ کیسے مسلمان ہیں کہ وہ پیغمبرؐ بھی ان کے سروں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ سمجھانے جا رہے ہیں مگر کوئی سر اُٹھانے کے قابل نہیں ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔

عزیزو! یہ خیالی بوجھ ہے کہ جو انسان کے سر کو اُٹھنے نہیں دیتا ہے۔ اگر آپ نے اس منظر کو پہچان لیا ہے جب کہ نبیؐ کی تبلیغ کو اٹھارہ سال گذر چکے ہیں۔ میں یہ منظر نہیں عرض کرنا چاہتا یہ میرا موضوع نہیں ہے لیکن بہرحال چونکہ آپ حضرات ان موضوعات سے زیادہ مانوس ہیں اور بات جلدی محسوس کر لیتے ہیں اس لیے بھائیں تیرہ سال مکّہ میں اور پانچ سال مدینہ میں اٹھارہ سال کی تبلیغ کے بعد ہم نے یہ منظر دیکھا ہے کہ جنھوں نے کلمہ پڑھ لیا تھا، جو باہر والے نہیں قریب والے تھے ان کا خیالی بوجھ اتنا سنگین تھا کہ سر اُٹھانے کی ہمّت نہیں کر رہے تھے۔ تو اٹھارہ سال پہلے نبیؐ جن کے سروں سے بوجھ اُتار رہا تھا اٹھارہ سال پہلے جنھیں پیغمبرؐ آزادی دلا رہا تھا ان کا کیا حال رہا ہوگا۔

یہ پیغمبرؐ کا کتنا بڑا کارنامہ تھا۔ اب دو ہی باتیں ہیں یا یہ کہا جائے نبیؐ کا کارنامہ اتنا عظیم تھا کہ اتنے دبے ہوئے انسان کو سر اٹھانے کے قابل بنانا یا یہ کہیں کہ ان میں صلاحیت تھی تو سر اُٹھ گیا۔ ورنہ جن میں سر اُٹھانے کی صلاحیت نہ تھی نبی لاکھ سمجھاتے رہے مگر سر نہ اُٹھ سکا۔ کتنا فرق ہے اس مجمع میں جو سب مل کے سر نہ اٹھا سکے اور اس اکیلے میں جو تن تنہا خود کھڑا ہو جائے۔

عزیزو! زنجیروں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ کبھی آدمی رسیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے یا لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے تو یہ مادی زنجیریں ہوتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی اگر آپ اپنے بچہ پر ناراض ہوگئے اور آپ نے بچہ کا ہاتھ باندھ دیا تو ہاتھ بندھے ہوئے ہیں لیکن ذہن کھلا ہوا ہے اسی لیے بچہ ترکیبیں سوچ رہا ہے کہ اسے کیسے کھول لیا جائے، اس سے کیسے نجات حاصل کرلی جائے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جب ذہن آزاد ہوتا ہے اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوتے ہیں تو ایک ذہن ہوتا ہے ہاتھ پاؤں کھولنے والا۔ کبھی انسان رسی کو توڑ دیتا ہے، کبھی رسّی کو دانت سے کاٹ دیتا ہے، کبھی کوئی اور ترکیب کرتا ہے، کوئی کھینچ کے ہاتھ نکالنا چاہتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب تک ذہن آزاد ہے، جب تک ذہن جکڑا ہوا نہیں ہے یہ مادّی رسّیاں، یہ لوہے کی زنجیریں کچھ نہیں کرسکتی ہیں، اس لیے کہ کھولنے والا ذہن آزاد ہے۔ لیکن اگر ذہن زنجیروں میں جکڑ جائے تو یہ زنجیریں ہیں جو نہ ہاتھ سے کھولی جاسکتی ہیں نہ پیروں سے کھولی جاسکتی ہیں نہ کسی آلہ سے کھولی جاسکتی ہیں۔ اس کے کھولنے کے لیے تو کوئی ذہنی آلہ ہی چاہیئے تو جیسے بوجھ دو طرح کے تھے ویسے ہی زنجیریں بھی دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسے افراد ہوتے ہیں جو مادی زنجیروں میں جکڑ جاتے ہیں اور کچھ ایسے افراد ہوتے ہیں جو خیالی زنجیروں میں جکڑ جاتے ہیں۔ اگر میرے بچوں کو، نوجوانوں کو نہیں معلوم ہے تو میں ان کے معلومات میں اضافہ کے لیے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ پرانی طب میں ایک مرض تھا جس کا نام تھا "مالیخولیا" یہ ایک وہمی بیماری ہے خدا نہ کرے کسی آدمی کو ہو جائے۔ اچھے خاصے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے بعد آواز دیتے ہیں مجھے بچاؤ۔ خیریت تو ہے؟ دیکھئے لوگ مجھ پر حملہ کر رہے ہیں۔ بھئی آپ کے پاس کون سی نگاہ ہے کہ آپ اس مجمع کو دیکھ رہے ہیں جو حملہ آور ہو رہا ہے۔ ہمیں نہیں دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خیال کی بیماری ہے۔ قصّہ مشہور ہے کہ ایک آدمی اسی بیماری کا بیمار تھا۔ وہ چلا گیا حمام میں نہانے کے لیے۔ ظاہر ہے کہ حمام میں جتنے نہانے والے ہوتے ہیں سب کا لباس ایک جیسا ہوتا ہے۔ جیسے لباس احرام

ویسے ہی لباسِ حمام۔ اب حمام جانے کے بعد جب کپڑے اُتار کے اس نے لنگی پہنی تو دیکھا جتنے آئے ہیں سب ایک ہی جیسی لنگی پہنے ہوئے ہیں۔ اب خیال پیدا ہوا کہ اگر میں واپس آنے کے بعد گم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اب تو لباس بھی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے پہلے اگر گم ہو جاتا تو مجھے معلوم تھا کہ میں کرتا شلوار پہنے ہوئے ہوں یہ پینٹ پہنے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے کو ڈھونڈھ لینے میں کوئی زحمت نہیں تھی لیکن اب اگر گم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ تو اس نے اپنے گلے میں ایک دھاگہ ڈال لیا کہ اب جو میں پلٹ کے آؤں گا تو میں دیکھ لوں گا کسی کے گلے میں یہ دھاگہ نہیں ہے۔ جس گلے میں دھاگہ ہو گا وہ میں ہوں۔ اب مجھے اپنے کو ڈھونڈھنے میں کوئی زحمت نہیں ہو گی۔ یہ لطیفہ نہیں ہے اگر آپ سوچ سکیں تو سوچیے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود اپنی نگاہ میں گم ہو جاتا ہے اس کو کون ڈھونڈھے گا اسے کون تلاش کرے۔ چلا گیا اب جو واپس آیا نہا دھو کے اس گرم پانی میں تو ظاہر ہے کہ اتنا تھک گیا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ بیٹھ گیا تو لیٹ گیا، لیٹ گیا تو آنکھ بند ہو گئی۔ کسی آدمی نے یہ منظر دیکھ لیا تھا کہ وہ دھاگہ باندھ کے جا رہے ہیں اپنے کو تلاش کرنے کے لیے۔ اس کو کچھ مذاق کا خیال پیدا ہوا اس نے وہ دھاگہ گلے سے کھول لیا۔ اب تھوڑی دیر کے بعد جو آنکھ کھُلی تو سب سے پہلے ہاتھ گردن پر گیا اور جب دیکھا وہ دھاگہ نہیں ہے تو اسی حمام میں باآواز بلند شور مچانا شروع کر دیا۔ میں کہاں ہوں۔ ہائے میں کہاں چلا گیا، میں کہاں گم ہو گیا۔ بھائیو بتاؤ میں کہاں آ گیا۔ اب ہر آدمی پریشان ہے۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ یہ ہے وہمی بیماری۔ ہے کچھ نہیں لیکن سوچ رہا ہے کہ میں گم ہو گیا۔ اب جو اپنے بارے میں سوچ رہا ہے کہ میں گم ہو گیا اسے اس کا پتہ کون بتائے گا غور کیا آپ نے؟ مسئلہ دھاگے کے کھُل جانے کا نہیں ہے۔ دھاگہ کھُل جائے یا رہے آدمی اپنے کو پہچان لے گا۔ مگر جس نے اپنے بارے میں سوچ لیا کہ میری پہچان یہی دھاگہ ہے جب وہ دھاگہ گم ہو جائے گا تو گویا وہ خود گم ہو گیا۔ اب یہ اپنے کو تلاش کر رہا ہے مگر اپنا پتہ نہیں مل رہا ہے۔ آپ نے محسوس کیا کہ مادی بوجھ یا مادی زنجیر کا اٹھا لینا، توڑ دینا بہت آسان ہے مگر خیالی بوجھ، وہمی زنجیریں ان کا توڑنا بہت مشکل ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات تو

ناممکن ہو جاتا ہے۔ میں ابھی آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا ورنہ میں ایک درجن مثالیں آپ کی زندگی سے گذارش کرتا کہ جہاں نہ کوئی پابندی ہے نہ کوئی زنجیر ہے مگر ہر آدمی اپنے کو جکڑا ہوا سمجھ رہا ہے۔ اگر ایسا کریں گے تو کیا ہوگا؟۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ مگر سوچ رہے ہیں کہ کیا ہوگا۔ ہمارے سماج کا یہ طریقہ ہے اگر نہ کریں گے تو کیا ہوگا۔ ہم یہ سب حالات دیکھ چکے ہیں۔ ایک گاؤں میں مثلاً شادیوں میں ناچ گانے کا رواج ہے اب یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر ہم نے نہ کیا تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ مسلمان سمجھے جائیں گے مگر اس غریب کو یہی خیال ہے کہ اگر ہم نے نہ کیا تو عزّت چلی جائے گی۔ ارے عزّت خدا دیتا ہے یا یہ دیتے ہیں۔ عزّت کیسے چلی جائے گی۔

اگر یہ نہ ہوگا تو ہمارا کوئی وقار نہ رہ جائے گا۔ وقار یہ دینے والے ہیں۔ اگر ان کا دیا ہوا وقار مل جاتا تو۔ یزید خلیفہ ہو چکا ہوتا۔ نہ ان کی دی ہوئی عزّت کوئی چیز ہے نہ ان کا دیا ہوا وقار کوئی چیز ہے۔ عزّت اللہ کے لیے ہے اگر اللہ آپ کو عزّت دینے والا ہے تو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا مگر آدمی سمجھ رہا ہے کہ ہم بندھے ہوئے ہیں۔ کتنے سماجی بندھن ہیں جن میں سارے مسلمان بندھے ہوئے ہیں۔ نہ یہ کوئی زنجیر ہے نہ کوئی رسّی ہے نہ کوئی پریشانی ہے۔ مگر خیالی طور پر ہر آدمی اپنے کو مجبور سمجھ رہا ہے۔ کوئی مجبوری نہیں جب تک آپ سوچتے رہیں گے آپ مجبور رہیں۔ جس دن توڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے زنجیروں کی کوئی اوقات نہیں رہے گی۔ تو اگر چودہ صدیوں کی تربیت کے بعد مسلمان خیالی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے تو سوچیں کہ نبی کے آنے سے پہلے ماحول کا کیا حال رہا ہوگا۔ یہ پیغمبرؐ کا کارنامہ نہیں یہ پیغمبرؐ کا معجزہ ہے کہ اوہام و خیالات میں جکڑے ہوئے ماحول کو ایسا آزاد کر دیا اور اتنا بلند نگاہ بنا دیا کہ اب کسی کی نگاہ میں نہ رسموں کی کوئی حقیقت رہ گئی، نہ رواج کی کوئی حقیقت رہ گئی۔ جو مسلمان ہوا وہ حقیقی مسلمان ہوا۔ جو نہ ہوا وہ نہ ہو سکا۔

بس عزیزو! اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ آئیے میں آپ کے سامنے وہ تذکرہ گذارش کروں کہ انسان خیالات میں کیسے جکڑ جاتا ہے، کیسے اسیر ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے بعد آزاد نہیں ہو سکتا۔ عرب میں ایک قبیلہ تھا جس کا نام تھا بنی تمیم۔ اس قبیلہ پر حاکم عراق،

نعمان بن منذر نے ٹیکس ادا نہ کرنے کے جُرم میں حملہ کیا اور جب بنی تمیم کو شکست ہو گئی اور حملہ آور لشکر کامیاب ہو گیا تو اس نے سارا مالِ غنیمت اپنے قبضہ میں لے لیا اور جو اُن کی عورتیں تھیں ان کو بھی گرفتار کر کے لے گئے اس لیے کہ اب وہ فاتح ہیں اور یہ شکست خوردہ ہیں۔ اب ان کی کوئی اوقات نہیں ہے جب وہ لے کر چلے گئے تب انھیں خیال پیدا ہوا کہ مال لے گئے تو لے گئے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن عورت کے لیجانے کے معنی یہ ہیں کہ آبرو لے گئے۔ عزّت لے گئے۔ لہٰذا اب طے ہوا کہ جاکے اس حاکم سے یہ گذارش کریں کہ ہم نے اپنی ہار مان لی۔ ہم نے شکست تسلیم کر لی۔ آپ کم سے کم ہمارے اوپر اتنی مہربانی کریں کہ مال لے گئے لے جائیے۔ جو سامان لوٹ کے لے گئے لے جائیے۔ ہمیں نہیں چاہیے۔ ہماری عورتوں کو واپس کر دیجئے اس لیے کہ یہ ہماری عزّت کا مسئلہ ہے۔ حاکم بھی کچھ مہربان تھا اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ ہم جبراً لے آئے ہیں اور جبراً واپس کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں۔ ہم جبراً نہیں لے آئے ہیں۔ یہ آپ کی عورتیں خود ہمارے ساتھ آئی ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر یہ جانا چاہیں تو ہم نہ روکیں گے۔ قبیلہ والے خوش ہو گئے کہ جو ان کو قیدی بنا کے لے گیا ہے اگر وہ چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا ہے تو ہمارے گھر کی لڑکیاں، ہماری بہنیں، ہماری مائیں فوراً بھاگ کے آجائیں گی۔ دوڑ کے آجائیں گی۔ لہٰذا خوش ہو گئے اس کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ اب یہ مسئلہ عورتوں کے سامنے رکھا گیا تم جانا چاہو تو جا سکتی ہو ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ تمام عورتیں واپس جانے کے لیے تیار ہو گئیں لیکن قیس بن عاصم کی بیٹی تیار نہ ہوئی۔ اُس نے کہا کہ اب ہم آ گئے تو آ گئے۔ اب پلٹ کے نہیں جائیں گے۔ جس کی بنا پر اس قبیلہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ عورت ایسی منحوس شے ہے کہ اس کی وجہ سے عزّت ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ اگر جنگ میں ہار گئے تو کوئی بات نہیں۔ کوئی ہارتا ہے کوئی جیتتا ہے۔ اگر یہ قیدی بن گئے تو کوئی حرج نہیں یہ تو مظلومیت ہے۔ لیکن آزادی پانے کے بعد بھی یہ نالائق آنے کے لیے تیار نہ ہوئیں تو ہماری آبرو خطرہ میں پڑ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے یہ وجود ہی ایسا ہے جس کی وجہ سے آبرو ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ لہٰذا اس دن سے یہ

طے کر لیا کہ اب جو عورت یعنی بیٹی پیدا ہوگی اس کو زندہ دفن کر دیں گے۔ یہ ہے تاریخ بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کی۔ یہ سارے عرب کا کام نہیں تھا۔

عرب میں ایک قبیلہ تھا بنی تمیم جس نے یہ کاروبار شروع کیا تھا اس حادثہ کے زیر اثر کہ عزّت خطرہ میں پڑ جاتی ہے عورت کی وجہ سے۔ لہٰذا عورت کا وجود دنیا میں ہونے نہ پائے اور وجود جب ہوتا ہے تو وجود نہ بیوی کا ہوتا ہے، نہ ماں کا ہوتا ہے۔ وجود تو بیٹی کا ہوتا ہے۔ پیدا ہونے والی عورت جب پیدا ہوتی ہے تو یہ کوئی بیوی ہوتی ہے نہ ماں ہوتی ہے یہ تو بیٹی ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے کے بعد چاہے بیوی ہو جائے، چاہے ماں ہو جائے، کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن جس دن آتی ہے دنیا میں اُس دن تو بیٹی ہی بن کے آتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری نحوست کی بنیاد یہی بیٹی ہے بس اسی کو ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ پیدا ہو اور فوراً اس کو ختم کر دیا جائے تاکہ آگے بے عزّتی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو۔ اسی بنی تمیم کے قبیلہ میں ایک آدمی تھا قیس بن عاصم جو سب سے بڑا غیرت دار تھا اپنے خیال میں۔ دیکھئے خیالی زنجیریں، دیکھئے اس کا وجود ہمارے لیے بے عزّتی کا باعث ہے۔ لہٰذا اب یہ فیصلہ کر لیا کہ جو بیٹی پیدا ہوگی اس کو ہم قتل کر دیں گے۔ قدرت کا بھی انتظام دیکھئے کہ ایسے منحوس کو بیٹی دی ہی نہ ہوتی۔ اگر یہ ایسا نالائق ہے تو یا تو محروم اولاد ہی رکھا ہوتا کہ کمبخت کا دماغ صحیح رہتا یا پھر بیٹے ہی بیٹے دیدیئے ہوتے۔ کم سے کم وہ صنف تو محفوظ رہتی۔ وہ کہیں اور پیدا ہوتیں۔ مگر خدا کا بھی انتظام دیکھئے اب نعمتوں کی بارش شروع ہو گئی۔ پہلی اولاد بیٹی قتل کر دیا۔ دوسری اولاد بیٹی قتل کر دیا۔ تیسری اولاد بیٹی قتل کر دیا۔ چوتھی اولاد بیٹی قتل کر دیا۔ پانچویں اولاد بیٹی قتل کر دیا۔ خدا کی رحمتوں کا سلسلہ ہی تمام نہیں ہوتا۔ مسلسل گیارہ بیٹیاں پیدا ہو چکیں اور سب کو اپنے ہاتھ سے قتل کر چکا۔ جو بھی اس کا طریقہ تھا اس لیے کہ یہ وجود ہمیں برداشت نہیں ہے۔ اس وجود کی بنیاد پر مستقبل میں عزّت خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ جب بیوی نے یہ دیکھا کہ ایسا جلّاد بے رحم ہے کہ خدا کی مہربانی یہ ہے کہ ہمیں بیٹی ہی دیتا ہے اور اس کی جلّادیت یہ ہے کہ جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اسے قتل کر دیتا ہے یا زندہ دفن کر دیتا ہے۔ لہٰذا

اب جو آخری مرتبہ اس عورت کے شکم میں پروردگار عالم نے کوئی امانت رکھی تو اس نے شوہر سے اظہار نہیں کیا کہ میرے شکم میں تمھاری کوئی امانت ہے اور کچھ ضرورت پڑ گئی شوہر چلا گیا کہیں سفر میں۔ یہاں تک کہ وقتِ ولادت بھی آ گیا یہ بچہ بھی پیدا ہوا اتفاق سے یہ بھی بیٹی۔ ایک عرصہ کے بعد جب شوہر واپس آیا تو اس عورت نے شوہر کے خوف سے یہ انتظام کیا کہ اس بیٹی کو اپنے محلہ کی کسی عورت کے حوالہ کر دیا تاکہ اس کی پرورش وہاں ہو ورنہ یہ ایسا بے رحم ہے کہ یہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی تربیت ہوتی رہی۔ بچی دو سال کی ہو گئی۔ ماں کو پہچانتی ہے۔ باپ کو تو پہچانتی نہیں۔ ایک دن اتفاقاً وہ بچی کھیلتی ہوئی اس گھر میں آ گئی۔ دن بھر کھیلتی رہی جب شام کا وقت آیا تو شوہر نے پوچھا کہ یہ کس کی بچی ہے؟ کہا یہ ہمارے ہمسائے کی بچی ہے۔ کہا شام ہو گئی شام کے وقت سارے بچے پلٹ کے اپنے گھر جاتے ہیں یہ کیوں نہیں جا رہی ہے؟ کہا یہ ہم سے اتنی مانوس ہو گئی ہے کہ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے کہا کہ نہیں بس رات ہو گئی۔ اسے اپنے گھر بھیجو۔ اب ماں کا دل ہے۔ بچی ماں سے مانوس ہے۔ وہ لاکھ سمجھا رہی ہے بیٹی چلی جاؤ مگر کہاں چلی جائے۔ ماں کو چھوڑ کر بچی کہاں چلی جائے۔ جب جانے کے لیے تیار نہ ہوئی تو اسے شبہ پیدا ہوا کہ مسئلہ کچھ اور ہے۔ کہا سچ بتاؤ یہ کس کی اولاد ہے؟ یہ بچی تمھیں چھوڑ کر کیوں نہیں جاتی ہے۔ اگر تم نے نہ بتایا تو اس کے بجائے تم ہی کو قتل کر دیا جائے گا۔ گھبرا کے اس نے کہا کہ یہ آپ ہی کی بیٹی ہے۔ جب آپ سفر میں چلے گئے تھے تب یہ پیدا ہوئی تھی۔ آپ کے خوف سے ہم نے اس کو محلہ میں رکھا، وہیں تربیت ہوئی ہے آپ کو نہیں پہچانتی مگر مجھے تو پہچانتی ہے۔ رات کا وقت آیا ہمیشہ میرے پاس رہی ہے اب چھوڑ کر جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

کہا اچھا یعنی اتنی محنت کرنے کے بعد گیارہ بچیوں کو زندہ دفن کرنے کے بعد پھر یہ نحوست میرے ہی گھر میں آ گئی یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی ہے۔ رات کس صورت سے گذری خدا جانتا ہے۔ صبح کے وقت بچی کا ہاتھ پکڑا، گھر سے باہر باغ میں لے گیا۔ باغ میں لے جانے کے بعد ایک گڑھا کھودا جیسے قبر، اور بچی کو اس گڑھے میں لٹایا۔ اس دوران بچی کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ میری ماں تھی اور یہ میرا باپ ہے۔ اس نے بچی کو لٹایا ظاہر

ہے کہ جس کو زندہ لٹا کے اس پر مٹّی ڈالی جائے گی اگر وہ اسی وقت پیدا ہوا ہے تو غریب کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ہمارا کیا حشر ہوگا۔ لیکن جس کے اندر شعور ہے وہ اپنے کو آزاد کرنا چاہے گا۔ لہٰذا یہ اپنے کو آزاد کرنا چاہتی ہے مگر ظاہر ہے کہ کہاں اتنا بڑا باپ، کہاں دو تین سال کی بچّی۔ کیسے مقابلہ کرے گی۔ اس نے ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مٹّی گرانا شروع کی۔ جب بچّی نے دیکھا کہ اب مقابلہ کرنا مادی طور سے ممکن نہیں ہے، ہاتھ پاؤں میں اتنی طاقت نہیں ہے تو اس نے فریاد کرنا شروع کی۔ بابا میں آپ کی بیٹی ہوں۔ میں آپ کی لختِ جگر ہوں۔ آپ کے دل کا ٹکڑا ہوں۔ آپ ہی کی اولاد ہوں، آپ مجھے اپنے ہاتھ سے دفن کر رہے ہیں، میں نے کیا خطا کی ہے۔ اگر مجھ سے کوئی خطا ہوگئی ہو تو میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ میری کیا خطا ہے مجھے آپ کیوں دفن کر رہے ہیں؟۔ مگر اس نے ایک نہ سُنی۔ بالآخر اس نے دفن کر دیا۔ وہ فریاد کرتی رہی اسے مٹّی کے نیچے دبا دیا اور یہ ادا اُس وقت کے عالمِ عربیت کو اتنی پسند آئی کہ سارے معاشرہ کو یہ طریقہ پسند آگیا۔ بدعت ایجاد کی ایک آدمی نے اور سب نے کہا بے شک حفظ آبرو کا۔ عزّت بچانے کا بہترین طریقہ اس نے ایجاد کیا ہے۔ لہٰذا اس دن سے سارے عرب میں یہ رسم عام ہوگئی۔ ایک قبیلہ کی بات تھی، قبیلہ میں ایک آدمی کا مسئلہ تھا مگر ایک آدمی اور ایک قبیلہ کی رسم اتنی پسند آئی کہ سارے عرب میں یہ طریقہ عام ہوگیا۔

میں نے یہ سارا قصّہ آپ کو اس لیے سنایا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ اگر ذہنوں میں اختلاف ہوتا تو طریقہ عام نہ ہو سکتا۔ سب کہتے یہ نالائق ہے، یہ جلّاد ہے، بے رحم ہے۔ اس کی بات سُننے کے قابل نہیں ہے، اس کی شکل دیکھنے کے قابل نہیں ہے مگر سارے سماج کا اس طریقہ کو اپنا لینا یہ اس بات کی علامت ہے کہ بے رحمی سب کے اندر تھی، طریقہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ جلّاد سب تھے انداز کسی کو نہیں معلوم تھا ایک نے بنا دیا سب نے اسی طریقہ کو اپنا لیا۔ یہ تو ہوگئی صورت حال اور پیغمبرؐ آئے ہیں عالمِ انسانیت کو آزادی دلانے کے لیے۔ پیغمبرؐ نے کیسے اس بندش سے، اس گرفتاری سے سماج کو آزادی دلوائی ہے اس کے بھی دو جُملے سُن لیجئے۔ جب حضورؐ کا اسلام

پھیلنے لگا۔ جب حضورؐ کا مذہب آگے بڑھنے لگا اور لوگ کلمہ پڑھ کے مسلمان ہونے لگے تو کسی نے اس کو بھی سمجھایا بھائی اب سب مسلمان ہو رہے ہیں۔ اب حالات بدل رہے ہیں۔ اب اسلام ترقی کر رہا ہے۔ اب ہم لوگوں کے جینے کا کوئی سہارا نہیں ہے بہتر یہ ہے کہ چلو مسلمان ہو جاؤ۔ اتنی شرارت کے بعد، اتنی خباثت کے بعد پھر بھی خیال اسلام آگیا اور آیا پیغمبرؐ کی خدمت میں کلمہ پڑھنے کے لیے۔ حضورؐ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں؟ فرمایا ٹھیک ہے کلمہ پڑھ لو گے مسلمان ہو جاؤ گے۔ کہا آپ مجھ کو اتنا معمولی مسلمان سمجھ رہے ہیں۔ یہ فقراء و مساکین جو آپ نے اکٹھا کر رکھے ہیں ان پر آپ میرا قیاس کر رہے ہیں۔ میں اپنی قوم کا بڑا اونچا آدمی ہوں اگر آپ اسلام میں کوئی اونچی جگہ دے سکتے ہیں تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ اور اگر آپ ان ہی کے درمیان میں مجھے رکھنا چاہتے ہیں جو فقیر مسکین آپ نے اکٹھا کر رکھے ہیں تو مجھے آپ کا اسلام نہیں چاہیے۔ حضورؐ کو تو اللہ نے اتنا علم دیا ہے کہ سب کی شرافت، طبیعت، خباثت سب جانتے ہیں مگر حضورؐ نے یوں ہی سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ فرمایا، اچھا اگر آپ اپنی قوم کے بڑے آدمی ہیں تو ہماری تعلیم بھی یہی ہے کہ ہر قوم کے بزرگ کا احترام کیا جائے مگر آپ کی بڑائی کیا ہے، آپ اپنی قوم کے بڑے ہیں تو آپ کی بڑائی کیا ہے تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو جائے اور ویسی ہی جگہ آپ کو دی جائے۔ اس نے کہا میں وہ غیرت دار ہوں جس نے اپنی بارہ بچّیوں کو اپنے ہاتھ سے دفن کیا ہے اور اس کے بعد بھی دیکھا کہ پیغمبرؐ پر اس بیان کا کوئی اثر خاص نہیں ہو رہا ہے تو یہ آخری واقعہ بھی سُنا دیا کہ آپ سمجھے شاید ایک ایک دن کی بچّیوں کو میں نے دفن کر دیا ہے وہ تو بہت آسان کام ہے یہ کارِ خیر تو بیسویں صدی کی عورتیں بھی کر لیں گی۔ ہاں ناجائز اولاد کا آخری انجام یہی ہوتا ہے لیکن اتنا آسان کام نہیں ہے۔ میں نے اُس بچّی کو بھی دفن کیا ہے جو فریاد کر رہی تھی مگر اس کے بعد بھی میں نے اس کو زندہ دبا دیا مٹّی میں۔ اب آپ نے میرے کارنامہ کو پہچانا۔ سرکارؐ نے فرمایا "اِنَّ ھٰذِہٖ ...... یہ ہے قساوتِ قلب، یہ ہے سنگ دلی، یہ ہے بے رحمی، یہ ہے جلّادیت اسی بنیاد پر مرتبہ چاہتا ہے؟۔ نہیں۔ ابھی میری بات واضح نہیں ہوئی ہے بس یہ آخری فقرہ سرکار کا سُنیں، اس کے بعد پہچانیں کہ

ایسی نالائق انسانیت کو، ایسے جاہل، جلاد، بے رحم انسان کو سرکار نے کیسے آزاد کیا ہے اور ذہن میں کیسے انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ فقط ایک جملہ پیغمبرؐ نے کہا تم بہت بے رحم ہو، تم جلاد ہو، تم نامہربان ہو، تم سنگ دل ہو، قسی القلب ہو، ایک یاد رکھو " مَنْ لَا یَرْحَمُ وَلَا یُرْحَمُ" یہ یاد رکھنا کہ جو رحم نہیں کرتا ہے اس پر رحم نہیں کیا جاتا ہے۔ اب ذرا اپنی زندگی کا جائزہ لے۔ دنیا سے لے کر آخرت تک تو پروردگار کے رحم و کرم کا محتاج ہے اور ہمارے خدا نے ایک قانون بنالیا ہے کہ جو رحم نہ کرے گا اس پر رحم نہ کیا جائے گا۔ تو جیسے ہی اپنے بارے میں رحمتِ خدا کا خیال پیدا ہوا اب ہر لمحہ رحمتِ خدا کی احتیاج کا خیال پیدا ہو رہا ہے۔ ہر لمحہ مزاج میں مہربانی پیدا ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ اب تو ایک قانون بن گیا ہے کہ اگر یہاں رحم نہ کرو گے تو وہاں رحم نہ کیا جائے گا۔ اس ایک خیال نے سماج کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اگر یہ بات ہمارے ذہنوں میں بھی راسخ ہو جائے تو آج ہماری زندگیوں میں بھی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ ہمارے بچہ نے کوئی خطا کی ہم معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارے نوکر سے کوئی غلطی ہو گئی ہم بخشنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارے بھائی نے کوئی غلطی کی ہم معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارے دوست سے کوئی غلطی ہو گئی ہم معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حالانکہ اسلام نے کہا کہ ایک بات یاد رکھنا۔ جس نے تمھاری غلطی کی ہے اگر تم اسے معاف کرنا نہیں جانتے تو کوئی ایسا بھی ہے جس کی خطا تم نے کی ہے۔ جس کا گناہ تم نے کیا ہے۔ جس کی معصیت تم نے کی ہے۔ اگر اس نے بھی یہی طے کر لیا کہ اپنے گنہ گار کو تم نہ بخشو گے اپنے گنہ گاروں کو میں نہ بخشوں گا تو تمھارا کیا انجام ہو گا۔ تو جیسے جیسے مغفرت خدا کا خیال پیدا ہوتا جائے گا ویسے ہی دل میں مہربانی کا جذبہ پیدا ہوتا جائے گا۔

ایک لفظ ہے فقط ایک لفظ ہے مگر اس لفظ کے معنی پر جہاں تک آپ غور کرتے جائیں گے انسان کے کردار میں انقلاب پیدا ہوتا جائے گا۔ دنیا میں جتنی بھی بے رحمیاں ہیں، جتنی نامہربانیاں ہیں سب میں انقلاب آسکتا ہے۔ فقط انسان یہ سوچ لے کہ ہم بھی کسی کے رحم و کرم کے محتاج ہیں۔ یہ سرکارِ دو عالمؐ کا بتایا ہوا نسخہ ہے جس کو میں نے بارہا

آزمایا ہے اور مجھے بھی ہمیشہ یہ نسخہ کامیاب دکھائی دیا ہے۔ جب دو آدمی آپس میں کسی بات میں جھگڑا کرتے ہوئے آئے آپ فیصلہ کر دیجئے۔ میں نے کہا بھائی ٹھیک ہے ان سے غلطی ہو گئی ہے۔ یہ کہہ رہے ہیں معاف کر دیجئے آپ معاف کر دیجئے۔ کہنے لگے جناب کوئی معمولی غلطی ہے۔ ہرگز معاف نہیں کریں گے۔ تو میں نے کہا کہ آپ تو ان کے پروردگار بھی نہیں ہیں۔ آپ تو ان کے خالق و مالک بھی نہیں ہیں۔ آپ ناراض بھی رہیں گے تو یہ زندہ رہ جائیں گے۔ آپ روٹی بند کر دیں گے کوئی اور کھلا دے گا۔ آپ نوکری سے نکال دیں گے کوئی اور رکھ لے گا۔ اگر بیوی ہے آپ طلاق دے دیں گے کوئی دوسرا نکاح کر لے گا۔ ان کی زندگی کے سہارے تو مل سکتے ہیں لیکن جو تیور آپ کے ہیں اگر یہی تیور کہیں جلال پروردگار کے پیدا ہو گئے اور پروردگار نے کہا اگر تم بندے ہو کر بندے کو معاف کرنا نہیں جانتے تو میں تو خدا ہوں۔ تمھارے بغیر تو وہ زندہ رہ سکتا ہے میرے بغیر تو تم زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ میرے بغیر تمھاری کوئی اوقات، کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بتاؤ اس وقت کیا ہو گا۔ اگر خدا تمھارے ساتھ یہی برتاؤ کرے جو تم بندگانِ خدا کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو۔ جب بھی میں نے یہ جملہ کسی کے سامنے کہا انسان لرز گیا۔ انسان کانپ گیا کہ اگر واقعاً خدا نے ایسا ہی معاملہ کیا جیسا معاملہ ہم کرتے ہیں تو ہمارا حشر کیا ہو گا۔ یہ سرکارِ دو عالمؐ کا فکری انقلاب تھا۔ فقط ایک لفظ ہی تو فرمایا تھا۔ نہ حضورؐ نے کوئی تنبیہ کی، نہ حضورؐ نے ڈانٹا، نہ حضورؐ نے مارا، نہ حضورؐ نے نکالا۔ ایک ہی جملہ فرما دیا بس یہ ایک قانون ہے "جو رحم نہ کرے گا اس پر رحم نہ کیا جائے گا"۔ سرکارِ دو عالمؐ کا ایک ایک لفظ انسان کے فکری انقلاب کے لیے کافی ہے اور بات بہت واضح ہے کہ اگر جاہلیت افکار کو قیدی بنا سکتی ہے تو اسلام فکروں کو آزاد بھی بنا سکتا ہے۔

عزیزانِ محترم! یہ داستان بہت طویل ہے اور میں بہت سی باتیں آپ کے سامنے گذارش کرنا چاہتا تھا مگر شاید سب کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ بہر حال جتنا موقع ہو گا ایک ہلکا سا خاکہ گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

اُس دور میں جن خیالات میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور جو بوجھ عالمِ انسانیت

کے سر پر لدا ہوا تھا قرآن مجید نے اس کا تذکرہ اٹھارہ مقامات پر کیا ہے۔ اٹھارہ قسم کی خیالی زنجیریں تھیں جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔ میں سب نہ گذارش کروں گا۔ دو تین چار شاید عرض کرسکوں۔

پہلی زنجیر جس میں سارا عالم انسانیت جکڑا ہوا تھا اس کا نام تھا شرک۔ غیر خدا کو بھی خدا سمجھ لینا یہ ایک زنجیر ہے آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ ہمارے ملک میں تو کچھ نہ پوچھئے۔ اگر اللہ والے دس بیس کروڑ پائے جاتے ہیں تو پتھر والے جن کی عقلوں پر بھی پتھر پڑے ہوئے ہیں وہ تو ساٹھ ستر کروڑ ہیں۔ میں نے خود یہ منظر دیکھا ہے کہ مندر میں پتھر رکھے ہوئے ہیں جن کا نام ہے بت اور یہ سامنے کھڑے لرز رہے ہیں۔ اگر بھگوان ناراض ہو گئے تو کیا ہوگا۔ یہچانئے آپ خیالی زنجیر کسے کہتے ہیں۔ یہ بے چارہ انسان، طاقت ور انسان جس کے پاس زور بازو ہے، جس کے ہاتھوں نے ان کو تراشا ہے، جس کے ہاتھوں نے ان کو لا کر رکھا ہے، جس کے ہاتھ یہاں سے کہیں اور اٹھا کے لے جا کے رکھیں گے، جب چاہیں تو اٹھا کے پھینک دیں گے۔ مگر خیالی زنجیر بھی کیا زنجیر ہوتی ہے کہ یہی انسان ان کے سامنے کھڑا ہو کر لرز رہا ہے۔ کچھ ملے گا تو انہی سے ملے گا۔ ارے ان کو اگر ایک قطرہ پانی ملا ہے تو تم سے ملا ہے۔ تم ہی نے جا کے ان کے سر پر پانی ڈالا ہے۔ ان کو اگر دو پھول ملے ہیں تو تم سے ملے ہیں۔ انھیں اگر بیٹھنے کی جگہ ملی ہے تو تم سے ملی ہے۔ ان کو رہنے کا مندر ملا ہے تو تم سے ملا ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کو خدائی ملی ہے تو تم سے ملی ہے۔ اب تک تو ہم نے یہی دیکھا ہے کہ انھیں جو کچھ ملا ہے وہ تم سے ملا ہے۔ مگر ہائے رے عقیدے کی زنجیر کہ یہ بیچارہ یہی سوچ رہا ہے کہ جو کچھ ملے گا وہ ان ہی سے ملے گا۔ روٹی ملے گی تو ان ہی سے۔ نوکری ملے گی تو ان ہی سے۔ جو کچھ ملے گا وہ ان ہی سے ملے گا اور اگر کہیں یہ ناراض ہو گئے تو کیا ہوگا؟ ان غریبوں میں تو یہ سوچنے کی طاقت بھی نہیں ہے۔

خدا سوچ رہے ہیں بندے ناراض ہو گئے تو کیا ہوگا۔ بندے سوچ رہے ہیں اگر یہ خدا ناراض ہو گئے تو کیا ہوگا۔ یہ کیا ہے اس کی کوئی حقیقت ہے؟ نہیں مسلمان

ہونے کی حیثیت سے نہیں۔ ایک عام انسان جو صاحبِ عقل ہے اس کے لیے اس بات کی کوئی حقیقت ہے۔ یہ کسی کو کچھ دے سکتے ہیں۔ یہ کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں؟

خلیل اللہ نے پہلے دن جب بُت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی تو چونکہ آذر کے گھر میں رہتے تھے اور آذر بُت بنایا کرتا تھا اس لیے اُس نے بہت سے بُت تیار کیے اور ابراہیمؑ سے کہا کہ لے جاؤ انھیں بازار میں بیچو۔ خدا کی اوقات پہچانئے۔ پہلی اوقات خدا کی یہ ہے کہ بکنے جا رہے ہیں، فروخت ہونے جا رہے ہیں۔ جناب ابراہیمؑ نے کہا تم نے اتنے بہت سے خدا بنا دیئے ہیں کہ ان کا بوجھ کون اُٹھائے گا میں لاد کے نہیں لے جا سکتا۔ کہا نہیں تم کو لے جانا پڑے گا بازار میں بیچنے کے لیے۔ میرے گھر میں رہتے ہو جو کہوں گا وہ کرنا پڑے گا۔ جناب ابراہیمؑ نے کہا اچھا اتنی اجازت دیجیے کہ سر پر تو یہ نہ اُٹھ سکیں گے۔ آپ لے جانے کے لیے کہتے ہیں میں لے جاؤں گا۔ کیسے لے جاؤ گے؟ کہا ایک رسّی میں سب کو باندھ لوں گا اور لے جاؤں گا بازار میں بیچنے کے لیے۔ جناب ابراہیمؑ نے ایک رسّی میں سارے خدا باندھ لیے اور لے کر چلے۔ جب بازار میں پہنچے تو لوگ اکٹّھا ہو گئے۔ دیکھا نئے نئے خدا، اچھے اچھے خدا، بہترین خوبصورت تراشے ہوئے خدا۔ جناب ابراہیمؑ نے کہا دیکھو آیا تو ہوں تجارت کے لیے۔ کاروبار کے لیے اور کاروباری آدمی فائدہ چاہتا ہے مگر میں بددیانت کاروباری نہیں ہوں۔ میں بے ایمانی نہیں کروں گا۔ سچّی بات پہلے بتا دوں جس کا جی چاہے خریدے، جس کا جی چاہے نہ خریدے یہ مال جو میں لے کر آیا ہوں یہ خدا تو ہیں مگر نہ ان کا کوئی فائدہ ہے نہ کوئی نقصان۔ جو خریدنا چاہے وہ خرید لے میں ایمان داری سے سچّی بات بتائے دیتا ہوں۔ یہ نہ کوئی فائدہ پہونچا سکتے ہیں نہ کوئی نقصان۔ اس کے بعد بھی کوئی خریدنا چاہے تو خرید لے پھر بھی خریدار پیدا ہو گئے۔

کیوں؟ اس لیے کہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہ خدا ہیں۔ رسّیوں میں کھنچے جا رہے ہیں مگر خدا ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے مگر خدا ہیں۔ کوئی نقصان نہیں ہے مگر خدا ہیں۔ حد یہ ہے کہ بک رہے ہیں مگر خدا ہیں۔ ہمارے قبضہ میں ہیں مگر خدا ہیں۔ تو یہ ایک

ایسی خیالی زنجیر ہے جس میں سارا عالمِ شرک جکڑا ہوا ہے۔ عزیزو! سوائے خیال کے یہ کچھ نہیں ہے۔ خدا کیا یہ بندے بھی نہیں ہیں۔ یہ تو بندگی کرنا بھی نہیں جانتے ہیں خدائی کیا کریں گے۔ مگر جس کے ذہن پر قبضہ ہو گیا وہ یہی سوچتا ہے کہ یہ خدا ہیں۔ کتنا بڑا بوجھ ہے کہ اس بیسویں صدی میں ستر کروڑ آدمی سر اُٹھانے کی ہمت نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی خدائی کے آگے جب کہ بیس کروڑ یہ سمجھانے والے بھی ہیں کہ یہ خدا نہیں ہیں۔ کاش میری بات واضح ہو جائے یہ تو میں ایک جگہ کا نقشہ بتا رہا ہوں بیس کروڑ یہ سمجھانے والے موجود ہیں کہ یہ خدا نہیں ہیں اور ستر کروڑ کی عقل میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ یہ بیکس و مجبور خدا نہیں ہو سکتے ہیں۔ تو جہاں کوئی سمجھانے والا نہ ہو وہاں بدبختوں کی سمجھ میں کیسے آئے گا یہ خدا نہیں ہیں۔ اتنے بڑے مجمع میں ایک اٹھا ہے یہ کہنے کے لیے کہ یہ خدا نہیں ہیں۔ ایک آدمی اتنے سروں کا بوجھ کیسے اُتارے۔ اب یہاں پر ایک جملہ کہوں گا انشاء اللہ آپ کو وجد آجائے گا۔ اگر میری بات کو آپ نے محسوس کر لیا ایک آدمی اتنے سروں کا بوجھ کیسے اُتارے۔ ایک آدمی اتنے ذہنوں کی زنجیریں کیسے توڑے۔ حضورؐ نے کام شروع کیا۔ فرمایا قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہو سوائے خدا کے کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ حضورؐ کی لفظیں تھیں۔ یہ خدا نہیں ہیں۔ یہ خدا نہیں ہیں۔ حضورؐ اعلان کر رہے ہیں شاید اعلان سے بات سمجھ میں آجائے مگر جو جکڑا ہوا ہے وہ سُن تو رہا ہے مگر یہ سوچ رہا ہے کہ یہ تو کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم کیسے مانیں کہ یہ خدا نہیں ہیں۔ مجھے ایک جملہ یاد آگیا۔

میں اس دور کا بھی تذکرہ کرتا چلوں تاکہ دیکھیں ہم کہاں کہاں پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ہندوؤں میں ایک رسم ہے مہینہ کی بعض تاریخیں ہوتی ہیں کہ ان تاریخوں میں اگر کوئی آدمی مر جائے تو اس کے معنی ہیں کہ اس گھر میں پانچ آدمی مریں گے۔ یعنی ایک تو یہ گیا ہے چار پیچھے پیچھے اور آرہے ہیں۔ بعض مسلمان معاشروں میں بھی ان کے ساتھ رہنے کی بنیاد پر یہ خیال آگیا ہے عقیدہ تو نہیں کہہ سکتا مگر خیال بہرحال آگیا ہے اور خیال وہ زنجیر ہے کہ جس کا توڑنا آسان کام نہیں ہے۔ ایک مردِ مومن کے یہاں ایک کسی عزیز کا انتقال ہو گیا، جب مُردہ کو کفن دیا جانے لگا تو اس خطرے سے بچنے کے واسطے مردِ مومن نے

کپڑے کی چار گڑیاں بنائیں اور کفن میں رکھ دیں۔ یعنی جیسے ہم دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ نہ خدا جانے نہ بندہ جانے۔ نہ پتھر جانے نہ خدا جانیں۔ ویسے ہی ملک الموت کو بھی چار اور چاہئیں۔ جب وہ آئیں گے تو گڑیاں دے کر انھیں بھی بہلا دیں گے۔ یہ چار ہیں ان کو لے جاؤ اور گڑیاں دے کر چار آدمی بچا لیں گے۔

کسی آدمی نے نیا نیا یہ منظر دیکھ لیا۔ اتفاق سے وہ آیا دوڑ کے میرے پاس کہنے لگا مولانا! ایک عجیب منظر دیکھا۔ مردِ مسلمان کے کفن میں کپڑے کی بنائی ہوئی گڑیاں رکھی جا رہی ہیں۔ کیا یہ بھی کوئی قانون اسلام ہے جیسے لکڑیاں رکھی جاتی ہیں یا کافور کا حنوط کیا جاتا ہے شاید یہ بھی کوئی قانون ہوگا میں نے بھی پہلی مرتبہ سُنا تھا۔ میں نے کہا گڑیاں؟ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔ کسی رسالۂ عملیہ میں نہیں دیکھا۔ کسی حدیث میں نہیں دیکھا۔ کہیں تاریخ میں نہیں سُنا۔ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے ہمیں نہیں معلوم۔ ہم نے دیکھا آپ کو بتا دیا۔ ہم نے ایک ذمہ دار آدمی کو بُلایا۔ کہا یہ واقعہ سُنا ہے کیا یہ صحیح ہے؟ کہنے لگے مولانا بات یہ ہے کہ ان کا انتقال اس تاریخ میں ہوا ہے اور اس تاریخ میں جب کوئی مرتا ہے تو چار اور لے جاتا ہے۔ تو میں نے کہا کیوں لے جاتا ہے؟ اتنے چلے گئے دنیا سے۔ لاکھوں کروڑوں چار اور چلے جائیں گے۔ کہا نہیں ایک ترکیب ہے اگر ملک الموت کو فدیہ میں چار اور دیدیئے جائیں تو کام چل جائے گا۔ خدا بخشے شاد مرحوم نے کیا اچھی بات کہی ہے

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

یہ تو آدمیوں کا حال تھا اب معلوم ہوا ملک الموت کا بھی یہی حال ہے کہ انھیں کھلونے دے کے بہلایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اصل میں قصہ یہ ہے۔ میں نے کہا آپ کو حیا نہیں آتی ہے، آپ کو شرم نہیں آتی ہے۔ آپ مسلمان ہیں۔ کلمہ پڑھنے والے ہیں۔ نہ خدا پر بھروسہ ہے نہ ملک الموت پر اعتبار ہے۔ نہ موت پر اعتبار ہے کیسے مسلمان ہیں۔ مَلَک کے بارے میں یہی ایمان ہے کہ گڑیاں اور آدمی کا فرق نہیں سمجھتا۔ خدا کے بارے میں آپ کا یہی عقیدہ ہے کہ ملک الموت گڑیاں وہاں پہونچا دیں گے تو خدا بھول

جائے گا کہ ہم نے آدمی کے لیے بھیجا تھا تم مسلمان ہو۔ تمھیں حیا نہیں آتی ہے۔ کہنے لگے حضور کیا کیا جائے۔ میں نے کہا جاؤ کفن کھولو پہلے گڑیاں نکال کر باہر پھینکو اس کے بغیر میں نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا اس لیے کہ میں گڑیوں کی نماز پڑھنے نہیں آیا ہوں۔ میں آدمی کی نماز جنازہ کے لیے آیا ہوں۔ اب ان میں بے چارہ میں ہمت نہیں ہے اس لیے کہ سب جکڑے ہوئے ہیں۔ ان میں میرا پیغام پہونچانے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ بالآخر جب میں نے کافی زور دیا اور انھوں نے جا کے صاحب خانہ سے جو مرد مسلمان اصلی مسلمان، نمازی مسلمان، روزہ دار مسلمان تھے ان سے جا کے کہا کہ مولانا فرما رہے ہیں کہ پہلے آپ ان سب کو نکالیے ورنہ میں نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔ اسلام نے گڑیوں کی کوئی نماز نہیں رکھی ہے۔ مُردہ کی نماز ہوتی ہے۔ کیا پاکباز راست گو مومن تھے۔ کہنے لگے مولانا سے جا کے کہہ دیجیے کہ نماز پڑھیں چاہے نہ پڑھیں۔ مریں گے تو چار ہمارے مریں گے ان کے تو مریں گے نہیں۔ لہٰذا ہم کو ان کی نماز جنازہ عزیز نہیں ہے، اپنے چار عزیزوں کی زندگی عزیز ہے۔

عزیزو! میں نے یہ واقعہ آپ کو صرف اس لیے سُنایا ہے کہ آپ سوچیں کہ اس بیسویں صدی میں چودہ سو سال اسلام کو کام کرتے ہوئے گذر گئے۔ مسلمان معاشرہ، مسلمان ماحول، مومن ماحول، کلمہ پڑھنے والے، اللہ، رسولؐ، امامؑ کے ماننے والے، اگر یہ ماحول سے متاثر ہو کے ایسے ہو سکتے ہیں کہ انھیں یہ خیال ہے کہ مریں گے تو ہمارے مریں گے آپ کا کیا نقصان ہوگا۔ تو سرکار دو عالمؐ کا یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ یہ خدا نہیں ہیں۔ مگر یہ سب کہیں گے کہ یہ تو آپ کہہ رہے ہیں اگر نقصان پہونچا دیا تو کیا ہوگا۔ یعنی اب عالم عربیت سوچ رہا ہے کہ یہ خیال نیا تو آ گیا کہ یہ خدا ہیں یا نہیں ہیں مگر دل کا وہم ڈرا رہا ہے کہ یہ تو خالی یہ کہہ کر چلے جائیں گے کہ یہ خدا نہیں ہیں لیکن اگر یہ ناراض ہو گئے تو کیا ہوگا نقصان تو ہمارا ہوگا ان کا تو ہوگا نہیں۔ اگر انھوں نے ہمارے بھائی بہن کو مار دیا، ہمارے ماں باپ کو مار دیا تو ان کا کیا نقصان ہوگا۔ اگر ہمارے کھیت کو جلا دیا زراعت ہماری جائے گی ان کا کیا نقصان ہوگا۔ اگر یہ ناراض ہو گئے کوئی نقصان پہونچا دیں گے

تو یہ کیا کریں گے نقصان تو ہمارا ہوگا۔ تو حضورؐ نے ایک کلمہ دے کر ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا مگر شیطان نے ایک نیا رُخ نکال لیا کہ آپ تو خالی کہہ رہے ہیں اگر یہ کچھ کر گذرے تو کیا ہوگا۔ اگر انھوں نے نقصان پہونچا دیا تو کیا ہوگا۔ ضرورت تھی کہ نبیؐ کے ساتھ کوئی ایسا بھی ہوتا جو یہ ثابت کر سکتا کہ یہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ ڈرو نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ اعلان کرنا پیغمبرؐ کا کام ہے کہ بُت خدا نہیں ہیں لیکن اگر شیطان کوئی وہم پیدا کراتا ہے تو ایک ایسا بھی انسان موجود ہے جو نبیؐ کے کاندھوں پر چڑھ کر طاقوں سے بُتوں کو اُٹھا کے پھینک سکتا ہے۔ تاکہ تم دیکھ کے پہچان لو کہ یہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

ضرورت تھی نبیؐ کے ساتھ ایسے افراد کی۔

عقیدے کا پہونچانا نبیؐ کا کام تھا اور عقیدہ پہنچوانا علیؑ کا کام تھا۔ اب تو تم نے یہ منظر دیکھ لیا اگر یہ کچھ کر سکتے ہیں تو پہلے اپنے کو بچاتے۔ اگر یہ کچھ کر سکتے ہیں تو مجھے نقصان پہونچاتے کہ میں انھیں توڑ رہا ہوں۔ میں انھیں گرا رہا ہوں۔ میں ان کو ان کی جگہ سے ہٹا رہا ہوں۔ دیکھیں ان میں کتنا دم پایا جاتا ہے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اب تو یقین کر لو کہ یہ کسی قابل نہیں ہیں۔ جو کام کل میرے جد نے کیا تھا۔ کل پہلی مرتبہ ان کی اوقات کو خلیل اللہ نے ظاہر کیا تھا، آج ان کی اوقات کو میں نے ظاہر کیا ہے۔ کل پہلی مرتبہ وہ بُت کدے میں آئے تھے توڑنے کے لیے آج میں آیا ہوں انھیں توڑنے کے واسطے۔ فرق یہ ہے کہ جب وہ آئے تھے تو اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر توڑ رہے تھے اور یہ شرف خدا نے مجھے دیا ہے کہ جب میں توڑنے کے لیے آیا تو نبوت کے کاندھوں پر جگہ دی گئی۔ جتنا کام اونچا تھا خدا نے کام والے کو بھی اتنا ہی اونچا کر دیا۔

بس عزیزانِ محترم! اس سے زیادہ گذارش کرنے کا آج موقع نہیں ہے شاید میں کل کچھ اور باتوں کی وضاحت کر سکوں۔ یہ تو پہلی زنجیر ہے جس کا نام ہے شرک، متعدد خداؤں کا عقیدہ جس میں عالم انسانیت جکڑا ہوا تھا۔

ایک وہ رسم تھی زندہ دفن کرنے والی جس میں عالم عربیت جکڑا ہوا تھا اور نہ جانے کتنی بلائیں ہیں جن کا تذکرہ کسی نہ کسی مقدار میں میں کل پھر کروں گا تاکہ ان حالات کا

بھی جائزہ لیا جا سکے۔ جن زنجیروں میں ہم نے اور آپ نے اپنے کو جکڑ لیا ہے۔ جن کی کوئی حقیقت، کوئی واقعیت نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض اوقات بعض ایمانی معاشروں میں، اسلامی معاشروں میں ایسی مہمل باتیں پائی جاتی ہیں کہ یہی اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ ان کے پاس اسلام اور ایمان ہے یا نہیں۔

ایک مرد مومن کا انتقال ہو گیا ان کے گھر والوں نے کہا کہ ہم مرنے والے کی چہلم کی مجلس کرنا چاہتے ہیں۔ آپ پڑھ دیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں چھٹی جمعہ کے دن ہوتی ہے اور ہندوستان میں اتوار کے دن ہوتی ہے۔ تو عام طور سے پاکستان کے سارے پروگرام یا امارت میں جمعہ کو ہوتے ہیں اور ہمارے یہاں کے سارے پروگرام اتوار کو ہوتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ کب مجلس کرنا ہے۔ کہا اتوار کو۔ میں نے کہا اتوار کو میں دوسری جگہ وعدہ کر چکا ہوں۔ اتوار کو نہیں آسکتا اگر آپ کہیں تو ایک دن پہلے ہفتہ کو میں پڑھ سکتا ہوں۔ کہنے لگے مولانا آپ پڑھے لکھے ہو کے ایسی بات کرتے ہیں۔ وہ پڑھے لکھے، ہم پڑھے لکھے کو سمجھا رہے ہیں۔ آپ پڑھے لکھے ہو کے ایسی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا بھائی مجھ سے کیا جہالت ہو گئی۔ کہنے لگے کہ آپ جانتے ہیں کہ ہفتہ کے دن کوئی پتّھر بھی اپنی جگہ سے ہٹتا ہے تو پلٹ کے آجاتا ہے۔ جس کو اردو میں کہتے ہیں کہ ہفتہ دوہراتا ہے۔ یعنی ہم ایک مرنے والے کے چہلم کی مجلس ہفتہ کے دن کر دیں اور اگلے چالیس دن کے بعد ایک نئی مجلس کا انتظار کریں کہ آج ہی کوئی جائے گا اور پھر چالیس دن کے بعد ایک نئی مجلس ہونے والی ہے۔

سوچئے ذہنی زنجیریں کیا ہوتی ہیں، خیالی زنجیریں کیا ہوتی ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مجلس ہوئی نہیں کہ آدمی مرا نہیں۔ میں نے کہا میں آپ کے قوانین پر کوئی بحث نہیں کروں گا۔ فقط ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک تو ہم سمجھتے تھے کہ ذکر اہلبیتؑ زندگی کا ذریعہ ہے۔ ہم یہی کہتے رہے، یہی سنتے رہے، یہی سمجھاتے رہے کہ ذکر اہلبیت زندگی کا ذریعہ ہے۔ اب یہ معلوم ہوا کہ مجلس موت کا بھی کوئی ذریعہ ہے کہ ملک الموت کا کام اب مجلسوں سے لیا جائے گا۔ آپ کو شرم نہیں آتی ہے آپ نے ذکر آل محمدؐ کی یہی قدر کی ہے۔ ذکر اہلبیتؑ کا یہی احترام کیا ہے؟

اور اگر ایسا ہو جائے تو شکر خدا کرو کہ تمہارے گھر میں مرنے والے کا چہلم ہو گا ورنہ ہو سکتا ہے کہ کہیں صحرا بیابان میں جا کے مر جائے اور چالیس دن مرنے کی اطلاع بھی نہ آئے تو اگر گھر میں چالیسواں ہو جائے، چہلم دوہرایا جائے تو شرف کی بات ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔ مگر اس دور میں ایسے مہمل خیالات لوگوں کے ذہن میں پلے جاتے ہیں تو سوچئے کہ اُس دَور کا حال کیا رہا ہو گا۔ ابھی تو میں نے آپ کے سامنے ایک بیماری کا ذکر کیا ہے ابھی سترہ اور باقی رہ گئی ہیں جن میں سے کچھ کا تذکرہ کل کروں گا جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ تاریخوں کے بیانات تو بہت ہیں اب بات آگئی ہے تو ایک آخری جملہ سُن لیں اور یہیں سے تذکرۂ مصائب۔

سرکار دو عالمؐ کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ حضورؐ کو بچپنے ہی میں جناب حلیمہ کے حوالے کر دیا گیا اور جناب حلیمہ پیغمبرؐ کو لے گئیں۔ جناب حلیمہ کے واقعات۔ پیغمبرؐ کو لے جانا۔ پیغمبرؐ کو دودھ پلانا اگر آپ ان واقعات کو دیکھیں گے تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ جناب حلیمہ کا شمار کافروں میں نہیں ہے۔ یہ غلط خیال پیدا ہو گیا ہے کہ نبیؐ کو اللہ نے کسی کافرہ کے حوالے کر دیا کافرہ کا دودھ پینے کے لیے۔ جناب حلیمہ اپنے یہاں لے گئیں۔ جب پیغمبرؐ تین سال کے ہو گئے تو تاریخ میں ایک جملہ پایا جاتا ہے کہ ایک دن حضورؐ نے جناب حلیمہ سے یہ کہا کہ سارے بچّے تو گھر سے باہر بھی نکلتے ہیں آپ مجھ کو باہر نہیں جانے دیتیں۔ اب جناب حلیمہ کا عالم یہ ہے کہ چونکہ ایک تو امانت ہے۔ دوسرے کا بچّہ ہے۔ اپنا بچہ نہیں ہے اور یہ پھر اتنے کرامات دیکھ چکی ہیں۔ اتنے حالات کا لوگوں کو اندازہ ہے کہ حلیمہ سوچ رہی ہیں اگر بچہ کو باہر جانے دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی پکڑ لے جائے، کوئی قتل کر دے تو میرے اوپر بڑی ذمہ داری ہو گی۔ اب جناب حلیمہ پریشان ہیں اور حضورؐ کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ دیکھئے تبلیغ کے کتنے راستے ہوتے ہیں، اللہ کو ماننا بہت آسان ہے مگر سماجی زنجیروں سے آزاد ہو جانا بہت مشکل ہے۔ جب اصرار بڑھا تو حلیمہ نے کہا ٹھیک ہے بیٹا اگر تم جانا چاہتے ہو تو میں روکتی نہیں جاؤ بچّوں کے ساتھ باہر جانا چاہتے ہو جاؤ۔ مگر ٹھہر جاؤ۔ پیغمبرؐ تیار ہوئے۔ تین برس کا بچہ۔ تین برس کی عمر۔ باہر جانا چاہتے ہیں۔

جناب حلیمہ نے اس دَور کے رسم و رواج کے مطابق ایک دھاگہ لیا، اس میں کچھ گرہیں بنائیں جیسے آج بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ خیر الحمدللہ آجکل اگر گرہ بنائی جاتی ہے تو کوئی آیت پڑھی جاتی ہے کہ اگر گرہ کا اثر نہیں ہے تو آیت کا اثر تو ہے۔ اُس دَور میں تو کوئی آیت بھی نہیں تھی کسی کو کسی آیت کی اطلاع بھی نہیں تھی۔ لہٰذا کچھ گرہیں بنائیں جو اُس دَور کا طریقہ تھا اور پیغمبرؐ کے گلے میں ڈال دیا۔ پیغمبرؐ نے پوچھا جناب حلیمہ سے۔ یہ کیا ہے؟ کہا بیٹا چونکہ تم باہر جانا چاہتے ہو یہ تمہاری حفاظت کا ذریعہ ہے۔ ہمارے سماج میں جب ایسی گرہیں ڈال کے گلے میں دھاگہ ڈال دیا جاتا ہے تو گویا ہر بلا سے محفوظ ہوگیا۔ قدرت کا انتظام دیکھئے اور تبلیغ نبوت کی راہیں دیکھئے۔ جیسے ہی جناب حلیمہ نے یہ کہا پیغمبرؐ نے ہاتھ ڈالا اور اُس دھاگہ کو لے کر توڑ دیا۔ توڑ دینا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دیکھئے زنجیر ٹوٹ رہی ہے۔ مگر جو لفظ حضورؐ نے کہا تھا ایک لفظ میں نے یاد دلایا تھا "جو رحم نہ کرے اس پر رحم نہیں ہوتا ہے"۔ اب دوسرا لفظ پہچانئے۔ حلیمہ نے کہا بیٹا یہ کیا غضب کیا باہر خطرات بہت ہیں۔ کہا اماں گھبرائیے نہیں" اِنَّ مَعِیَ مَنْ یَّحْفَظُنِیْ" میرے ساتھ وہ ہے جو مجھے بچائے گا۔ میرے ساتھ وہ ہے جو میرا بچانے والا ہے۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ یہ دھاگے رہیں یا نہ رہیں۔ یہ گرہیں رہیں یا نہ رہیں جس کے پاس خدا ہے وہ کسی دھاگے کا محتاج نہیں ہے۔ کاش میرے اس جملہ کو آپ محسوس کریں یہ پیغمبرؐ نے تین برس کی عمر میں کہا اور اس حلیمہ سے کہا جس نے نہ ابھی اعلان اسلام دیکھا نہ اسلام کی تعلیمات۔ مگر حلیمہ کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جس کا بچانے والا خدا ہے اسے خطرات کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے عرب کے دیہاتی ماحول میں رہنے والی عورت وہ تین برس کے بچّے کے سمجھانے سے سمجھ گئی کہ جس کے ساتھ خدا ہے اسے خطرہ کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ مگر چالیس چالیس، پچاس پچاس برس کے لوگ دس دس، بارہ بارہ سال کا پُرانا اسلام۔ سمجھانے والا پیغمبرؐ اور ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر خدا کا ساتھ ہے تو خطرہ کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔

بس عزیزو! جن کا عقیدہ مستحکم ہوتا ہے کہ میرے ساتھ خدا ہے وہ خطرات کی پرواہ

نہیں کرتے ہیں۔ چھوٹے بچّے ہیں، کم سن بچے ہیں۔ تیس ہزار کا لشکر نظر کے سامنے ہے مگر اطمینان قلب کے لیے عقیدہ ہے کہ میرے ساتھ خدا ہے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے جس کے ساتھ خدا ہے اس کے دل میں کسی کا خوف نہیں ہے۔ ایک خوفِ خدا دل میں آجائے تو دنیا کے ہر خوف سے انسان آزاد ہو جائے۔ یہی کربلا کی تاریخ ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں مگر اس عقیدے کی بنیاد پر کہ جس کے ساتھ خدا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا ہے۔ نہ لشکروں کی پرواہ ہے نہ اسلحوں کی پرواہ ہے۔ نہ تلواروں کی پرواہ ہے نہ تیروں کی پرواہ ہے۔ سب کے سامنے تن تنہا کھڑے ہیں۔

بس اسی موقع کے لیے یہ ساری تمہید میں نے آپ کے سامنے گذارش کی اب آپ متوجہ ہیں۔ ایک پانچ سات منٹ کے اندر بیان تمام ہو رہا ہے ابھی ان کا تذکرہ نہیں کر رہا ہوں جو خانوادۂ عصمت کے ہیں جو شہزادیوں کی گود کے پلے ہیں۔ یہ عقیدہ وہ تھا جس نے سب کو بے خطر بنا رکھا تھا جس نے سب کو مطمئن بنا رکھا تھا۔ ورنہ سوچئے ابھی حسینؑ اپنے ایک چاہنے والے کے سرہانے سے آرہے ہیں۔ چاہنے والے کے سرہانے سے اُٹھ کے مولاؑ خیمہ گاہ کی طرف جارہے ہیں کہ دیکھا خیمہ کا پردہ اُٹھا۔ ایک بچہ خیمہ سے دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ حبیب ساتھ ہیں۔ فرمایا حبیب اس بچہ کو روکو یہ ہمارے خیمہ سے آرہا ہے۔ یہ کون بچہ ہے۔ کہاں جارہا ہے۔ حبیب آگے بڑھے۔ بچہ کا بازو پکڑا بیٹا کہاں جارہے ہو؟ کہا میدان میں جارہا ہوں۔ بیٹا یہاں تلواریں ہیں۔ یہاں نیزے ہیں۔ یہاں تیر انداز ہیں۔ یہاں لشکر ہیں۔ یہاں فوجیں ہیں۔ یہاں کہاں جارہے ہو۔ کہا یہ سر مولاؑ کے قدموں پر قربان کرنے جارہا ہوں۔ تیرہ برس کا بچہ دیکھیں آپ اور یہ حوصلہ دیکھیں۔ یہ عقیدہ۔ حبیب بچّہ کو لیے ہوئے مولاؑ کے پاس آئے۔ کہا بیٹا یہ تم نے کیا ارادہ کرلیا ہے۔ کہا مولاؑ! آپ کے قدموں پر یہ سر قربان کرنے جارہا ہوں۔ کہا میرے لال شاید تمھیں خبر نہیں کہ میں تمھارے باپ کے سرہانے سے آرہا ہوں۔ میں مقتل میں تمھارے باپ کو رو کے آرہا ہوں۔ اے بیٹا تیری ماں کے لیے تیرے باپ کا غم بہت کافی ہے، اب اپنی جان دے کر ماں کو کیوں نیا غم دینا دینا چاہتا ہے۔ بچّے نے دستِ ادب جوڑے۔ کہا مولاؑ! یہ آپ کیا فرمارہے ہیں، نہ تلوار کم

سے کس نے لگائی ہے؟ یہ میدان میں جانے کے لیے مجھے کس نے سجایا ہے؟ یہ مجھے تیار کر کے کس نے بھیجا ہے؟ کہا شاید تیری ماں کو یہ خبر نہیں ہے کہ اب دنیا میں تیرا باپ نہیں رہ گیا ہے اس کے واسطے وہی ایک صدمہ کافی ہے۔ ابھی مولاؑ نے یہ فقرہ کہا تھا کہ پس پردہ سے آواز آئی مولاؑ! ایک بیوہ کا ہدیہ ہے رد نہ کیجیے گا۔

اے اربابِ عزا! جب اصحاب کے گھر کی خواتین کا یہ جذبہ ہو کہ چھوٹے چھوٹے بچے قربان ہو جائیں تو وہ بہن جو مدینہ سے حضرت عبداللہ سے یہ کہہ کر چلی ہے کہ میرے والی! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے بھیّا کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا اب میرا ماں جایا جا رہا ہے۔ میں نے ماں جائے سے کہا کہ بھیّا مجھے ساتھ لے کر چلو۔ فرماتے ہیں کہ تم پر عبداللہ کا حق ہے، عبداللہ سے اجازت لے کر آؤ۔ بتائیے والی! آپ کا کیا خیال ہے؟ کہا اگر مولاؑ لیجانے کے لیے تیار ہیں تو میں کون روکنے والا۔

بس عزیزو! آپ رونے کے لیے تیار ہو گئے۔ اگر مولا لیجانے کے لیے تیار ہیں تو میں کون روکنے والا؟ جاؤ بنتِ علیؑ جاؤ، شوق سے جاؤ۔ اگر تم نے کبھی حسینؑ کا ساتھ نہیں چھوڑا تو جاؤ بھائی کے ساتھ رہو۔ مگر ایک گذارش میری بھی ہے کہ مجھے مولاؑ نے بتا دیا ہے کہ یہ رُخ میدانِ کربلا کی طرف ہے۔ یہ رُخ میدانِ کربلا کی طرف ہے۔ اس کے بعد مصائب ہی مصائب ہیں۔ اگر میرا مولا مصیبتوں میں گھر گیا تو مجھے تو نہیں لے جا رہے ہیں مصلحت امامت یہ ہے کہ میں مدینہ میں رہوں مگر کم سے کم ان بچّوں کو ساتھ لیتی جاؤ کہ اگر کبھی کوئی وقت آ جائے تو میری طرف سے یہ بچّے قربان ہو جائیں۔

لو عزیزو قافلہ چلا۔ بچے ساتھ چلے۔ اب جو عاشور کی رات کربلا میں آئی تو ثانیٔ زہراؑ نے بچّوں کو سمجھانا شروع کیا۔ اے بیٹا کل آلِ محمدؐ کی قربانی کا دن ہے۔ دیکھو اس کا خیال رکھنا کہ بہن بھائی سے سرمندہ نہ ہونے پائے۔ میرے لال میدان میں جا کے ماموں پر قربان ہو جانا اور بیٹا جہاد کرنا تو اس شان سے جہاد کرنا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حیدرِ کرارؑ کے نواسے ہیں اور جعفرِ طیارؑ کے پوتے ہیں۔ رات بھر ماں جوشِ شجاعت دلاتی رہی صبح کے وقت قربانی کا ہنگام آیا تو بچّوں نے کہا مادرِ گرامی! اب چل کے آقا سے اجازت بھی دلوا دیجیے۔ ثانیٔ زہراؑ بچوں کو لے کر بھائی کی خدمت میں آئیں سر جھکا کے کھڑی ہو گئیں۔ زینبؑ کے تیور کو حسینؑ سے بہتر کون پہچانے گا۔ کہا بہن اس وقت تو تمھارے آنے کا انداز کچھ عجیب ہے۔

خیر تو ہے۔ کہا بھیّا ایک بات کہنا چاہتی ہوں، مجھے یقین ہے کہ آج تک آپ نے میری کسی بات کو ٹالا نہیں ہے تو میری اس بات کو ٹالیں گے نہیں۔ کہا بہن بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟ کہا بھیّا ان میرے گود کے پالوں کو مرنے کی اجازت دیدیجئے۔ میں چاہتی ہوں میرے سامنے یہ میرے لال آپ پر قربان ہو جائیں۔ حسینؑ نے بچّوں کو سر سے پیر تک دیکھا۔ کبھی بہن کو دیکھتے ہیں کبھی بچّوں کو دیکھتے ہیں۔ بہن یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ مگر آج قربانی کا دن ہے۔ جاؤ میں نے اجازت دے دی۔ ماں نے ننھے ننھے بچّوں کو سجایا، تیار کیا۔ میدان میں روانہ کیا۔ خیمہ گاہ سے باہر آئے۔ حسینؑ نے بازو تھام کے بچّوں کو گھوڑے پر بٹھایا۔ چلتے چلتے ماں نے کہا بیٹا اس کا خیال رکھنا کہ میدان میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر دریا کا رُخ نہ کرنا۔ اصغر پیاسا ہے۔ خیمہ میں بچے پیاسے ہیں۔ میدان میں شہزادے آئے اُدھر عون کی جنگ ہو رہی ہے اِدھر محمد کا جہاد ہو رہا ہے۔ بھائی دونوں مصروفِ جہاد ہیں۔ یہاں تک کہ ہر طرف سے حملے شروع ہوئے۔ زخموں سے چور ہو کر گرنے لگے آواز دی مولا! اب جو حسین کے کانوں میں آواز آئی۔ کہا بھیّا عباس چلو۔ اِدھر سے مولا چلے عباس کو ساتھ لیا مقتل میں آئے۔ دیکھا بچّے دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ ایک لاشہ کو حسینؑ نے اٹھایا، ایک کا جنازہ عباس نے اُٹھایا۔ خیمہ میں لے کر آئے۔ بچّوں کے لاشے رکھ دیے۔ فضّہ نے آ کے کہا بی بی چلئے آپ کے لال آئے ہیں۔ ثانی زہراؑ نے کہا میں نہ جاؤں گی، کیا میں نے انھیں واپس آنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ میدان سے کیوں آئے۔ کہا چل کے اپنے شیروں کو دیکھ تو لیجئے۔ اب جو پلٹ کے آئیں دیکھا صحنِ خیمہ میں بچّوں کے جنازے۔ زینبؑ نے سجدے میں سر رکھ دیا، پروردگار! تیرا شکر کہ میرے بچّے میرے بھیّا کے کام آ گئے۔ لاشوں کو کلیجہ سے لگا لیا۔ شاباش میرے شیرو! شاباش میرے بچّو! تم نے ماں کو بھائی کے سامنے سرخرو کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۷

اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاۗءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی
اَھْلِ بَیْتِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَةُ اللهِ
عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ۔
اَمَّا بَعْدُ!

صاحبانِ ایمان وتقویٰ وہ ہیں جو اس رسول نبیؐ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی۔ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے، بُرائیوں سے روکتا ہے۔ طیّبات کو حلال قرار دیتا ہے، خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت سے اس بوجھ اور ان زنجیروں کو ہٹا لیتا ہے جس میں انسانیت جکڑی ہوئی ہے۔ پس جو لوگ اس پیغمبرؐ پر ایمان لائے۔ انھوں نے پیغمبرؐ کا احترام کیا، اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو نبی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی زندگانی دنیا میں کامیاب ہیں۔

آیۂ کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ کلام "رسالتِ الٰہیہ" کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے ساتویں مرحلہ پر آج کچھ باتیں "ایمان بالرسالۃ" سے متعلق گذارش کرنا ہیں۔ اگرچہ کل کا موضوع نامکمل رہ گیا ہے لیکن چونکہ آنے والے کل کے بیان میں پیغمبرِ اسلامؐ کے احترام سے متعلق کچھ باتیں گذارش کرنا ہیں لہٰذا گذشتہ کل کے جو مسائل باقی رہ گئے ہیں ان مسائل کا ایک اجمالی تذکرہ کل آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا تاکہ یہ

اندازہ ہو سکے کہ پیغمبر اسلام کا احترام کیوں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ دین الٰہی میں اور مذہب عقل میں کوئی انسان اس وقت تک قابلِ احترام نہیں ہوتا ہے جب تک اس کے کارنامے نہ ہوں۔

گندی سیاسی دنیا میں تو یہ امکان ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی کارنامہ نہ ہو لیکن انسان قابل احترام ہو جائے۔ مگر مذہب عقل میں، مذہب انسانیت میں اور دین خدا میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی انسان قابل احترام قرار دے دیا جائے اور اس کی زندگی میں کوئی بات وجہ احترام نہ ہو۔ یہ مسائل وہ ہیں جن کی وضاحت انشاء اللہ کل کی مجلس میں کی جائے گی۔

آج یہ گذارش کرنا ہے کہ مالک کائنات نے انسان کی فلاح، انسان کی کامیابی، اور انسان کی نجات کے لیے پیغمبرِ اسلام کے اس مسلسل تذکرے کے بعد ان شرائط کا ذکر کیا ہے "فالذین اٰمنوا بہٖ" فلاح، کامیابی اور نجات کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ پیغمبر پر ایمان لایا جائے۔ "وَعَزَّرُوْهُ" دوسری شرط یہ ہے کہ پیغمبر کا احترام کیا جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ پیغمبر کی مدد کی جائے۔ "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ" اور چوتھی شرط یہ ہے کہ اس نور کا اتباع کیا جائے جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ اس کے بغیر نہ انسانی زندگی کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ انسان منزلِ نجات تک پہونچ سکتا ہے۔

آج قرآن حکیم کی آیات کا ایک مختصر جائزہ آپ کے سامنے پیش کرنا ہے تاکہ یہ اندازہ کیا جائے کہ مالک کائنات کی نگاہ میں ایمان کسے کہتے ہیں۔ ہماری دنیا میں تو سارے الفاظ اپنی قدر و قیمت کھو چکے ہیں، معاشرہ میں سارے الفاظ اپنے معانی کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ انتہائی درجہ کے بے ایمان کو بھی صاحب ایمان کہا جاتا ہے اور سب سے بڑا جھوٹا بھی "سب سے بڑا سچا" کہا جاتا ہے۔ لیکن دین خدا میں، کتاب خدا میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے مالک کائنات نے جب بار بار اپنے بندوں کو ایمان کی دعوت دی اللہ پر ایمان لاؤ، رسول پر ایمان لاؤ، آخرت پر ایمان لاؤ تو یہ پروردگار ہی کی ذمہ داری تھی کہ بندوں کو سمجھائے کہ ایمان کے معنی کیا ہیں تاکہ کوئی بھی انسان ایمان کا دعویٰ کرنے سے پہلے اپنے حالات کا جائزہ لے کر خود اپنا حساب کر لے کہ ہم منزلِ ایمان تک پہنچے یا نہیں۔

منزلِ ایمان پہلا مرحلہ ہے نجات تک جانے کے لیے۔ اس کے بعد احترام، اس کے بعد نصرتِ پیغمبرؐ، اور اس کے بعد نورِ الٰہی کا اتباع۔ یہ سارے مراحل بعد کے ہیں۔ پہلے مرحلہ کا نام ہے "ایمان بالرسول"۔ اگر رسول پر ایمان نہیں ہے تو انسان منزلِ نجات تک نہیں جا سکتا ہے۔

ایمان کے مختلف شعبے ہیں اللہ پر ایمان۔ آخرت پر ایمان۔ کتابوں پر ایمان۔ انبیاء پر ایمان۔ مگر چونکہ میرے موضوع کا تعلق رسالت الٰہیہ سے ہے اور میں تذکرہ سرکارِ دو عالمؐ آپ کے سامنے گذارش کر رہا ہوں لہٰذا اتنا ہی حصّہ گذارش کروں گا جس کا تعلق پیغمبرؐ پر ایمان سے ہے کہ پیغمبرِ اسلام پر ایمان لانے کے معنی کیا ہیں۔ اب آپ میری طرف متوجہ رہیں گے تاکہ یہ سلسلۂ آیات درمیان سے ٹوٹنے نہ پائے ورنہ پھر نتیجہ آپ کے سامنے واضح نہ ہو سکے گا۔

پہلا مرحلہ "اِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ"۔ پیغمبرؐ یہ منافقین آپ کے پاس آتے ہیں اور یہ آ کے کہتے ہیں کہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ رسول اللہ ہیں۔ ایمان میں اور کیا ہوتا ہے؟ "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔ ہم آپ جو ایمان کا اعلان کرتے ہیں تو ایمان بالرسالت کا اعلان یہی ہے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ منافقین پیغمبرؐ سے آ کے یہی کہتے ہیں کہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی بالکل وہی ایمان جیسے ایک مخلص کا ایمان ہوتا ہے۔ لیکن اب آپ قرآن مجید کی بلاغت دیکھئے۔ اگرچہ یہ منافقین کا ایمان نہیں ہے۔ نالائق ہیں، جھوٹے ہیں۔

مگر پروردگار فوراً نہیں کہتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ توجہ کریں آپ۔ مسئلہ ذرا دقیق ہے لیکن بہرحال کچھ قرآن فہمی کا ذوق بھی ہم میں آپ میں ہونا چاہیئے۔ یہ منافقین آپ سے آ کے کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اگر پروردگار فوراً بلافاصلہ یہ کہہ دیتا کہ "مگر یاد رکھئے کہ یہ جھوٹے ہیں"، تو اس کا صاف نتیجہ یہ ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔

مثلاً ایک آدمی ہمارے مجمع میں آیا اور اس نے آ کے بیان کیا کہ آج بازار میں

ایک درہم میں بیس میٹر کپڑا مل رہا ہے۔ اس نے یہ خبر دی ہم نے فوراً یہ کہا یہ جھوٹا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک درہم میں بیس میٹر کوئی کپڑا نہیں ملتا ہے۔

منافقین کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اگر خدا نے فوراً کہہ دیا ہوتا کہ یہ جھوٹے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہوتے کہ یہ غلط کہتے ہیں کہ آپ رسول ہیں، آپ ہمارے رسول نہیں ہیں۔ لہٰذا پروردگار نے ان کے جھوٹ کا اعلان کرنے سے پہلے یہ کہا "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ"، اور اللہ یہ جانتا ہے کہ آپ رسول ہیں۔ آپ کی رسالت میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن اب اس کے بعد اللہ ہی گواہی دیتا ہے کہ "اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ" یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ مگر ان کے سچّے جھوٹے ہونے کا آپ کی رسالت سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ یہ جھوٹے رہیں گے جب بھی آپ رسول رہیں گے۔ ان کے جھوٹے ہو جانے سے آپ کی رسالت مجروح نہیں ہوگی۔ لہٰذا پیغمبرؐ ہم گواہی دیتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ تو جب وہ بیچارے یہی آ کے کہتے ہیں "اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو جھوٹے کیوں ہیں؟ جھوٹے ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر کوئی جھوٹ بات کہے آدمی تو جھوٹا ہے مگر سچی بات کہے تو کیوں جھوٹا ہے۔

اگر منافقین آ کے کہتے کہ اب ہم لوگ بھی رسول اللہ ہو گئے ہیں تو یقیناً بے ایمان جھوٹے تھے۔ لیکن جب منافقین یہی کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں تو ان کے جھوٹے ہونے کی وجہ کیا ہے؟ جھوٹ بولنے والا جھوٹا۔ سچ بولنے والا سچّا۔ یہ ایک نئی قسم بیچاروں کی پیدا ہوئی ہے کہ بولتے ہیں سچ مگر ہیں جھوٹے۔ نہیں آپ نے توجہ نہیں کی۔ اس قسم کو یاد رکھیے گا۔ قرآن مجید نے پورا ایک سورہ نازل کیا ہے ان حضرات کے بارے میں تاکہ آدمی کو معلوم ہو جائے کہ خالی لفظوں سے آپ دھوکہ نہ کھائیے۔ ہو سکتا ہے لفظوں میں آدمی انتہائی سچّا ہو مگر واقعاً انتہائی جھوٹا ہو۔ لفظوں کی دنیا الگ ہے، حقیقتوں کی دنیا الگ ہے۔ اب لفظوں اور حقیقتوں میں فرق کیسے کیا جائے گا؟ قرآن نے دوسری آیت نازل کی۔ دوسری جگہ پر پروردگار نے اس کا اعلان بھی کیا کہ ایسا کیسے ہوگا کہ بات جو کہے وہ سچ ہو۔ کہنے والا جھوٹا ہو "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا"، پیغمبرؐ! یہ

صحرائی آپ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے "قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا" آپ کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ کیا بدقسمتی، بیکسی بیچاروں کی ہے کہ وہ آتے ہیں حضورؐ کو خوش کرنے کے لیے۔ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ خدا کہتا ہے، ان سے کہیے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ یہ مروّت کی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر آپ نے ان کے ایمان کو مان لیا تو اس کے خطرات بہت زیادہ ہیں، ہم ان خطرات کو سامنے نہیں آنے دیں گے آپ صاف کہیے کہ تم مومن نہیں ہو۔ اب ظاہر ہے کہ یہ ناراض ہو جائیں گے۔ ہم ایمان لائے ہیں۔ کہہ رہے ہیں مگر آپ نہیں مانتے ہیں۔ تو پھر ہم ہیں کیا "وَلٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا"، آپ ان سے کہیے کہ تم لوگ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔ مسلمان ہیں۔ ایمان کی بات نہ کرو "وَلٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا" کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ ہم مان لیں گے۔ یعنی تمہارا اسلام ہمیں منظور ہے۔ تمہارا ایمان ہمیں قبول نہیں ہے۔ تو حضورؐ اگر آپ ان کے کہنے سے انھیں مسلمان مان سکتے ہیں تو ان کے کہنے سے انھیں مومن کیوں نہیں مان سکتے ہیں۔ تسلسل یاد رکھیے گا۔ یا تو یہ بالکل بے ایمان جھوٹے ہیں۔ نہ ان کا اسلام نہ ان کا ایمان۔ لیکن یہ کہیں کہ ہم مسلمان ہیں تو آپ مان لیجیے۔ اور یہ کہیں کہ ہم مومن ہیں تو نہ مانیے۔ یہ کیسے جھوٹے، کیسے سچے ہیں کہ ایک بات کہیں تو سچے، اور دوسری بات کہیں تو جھوٹے۔ خدا نے کہا نہیں فرق ہے۔ ہم اسلام کیوں مانتے ہیں ایمان کیوں نہیں مانتے ہیں" لما یدخل الایمان فی قلوبکم" آپ ان کو سمجھا دیجیے کہ چونکہ ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے لہٰذا ہم تمھیں مومن نہیں مان سکتے ہیں۔ اب تو اندازہ ہو گیا کہ اسلام کی دنیا الگ ہے، ایمان کی دنیا الگ ہے۔ جب تک زبان سے لفظی بازی گری ہوتی ہے اسلام، اور جب عقیدہ دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے تو ایمان۔ جس کا دل خالی ہوتا ہے عقیدے سے وہ مسلمان تو ہوتا ہے مگر صاحب ایمان نہیں ہوتا ہے۔ ایمان نے اپنی جگہ زبانوں پر نہیں بنائی، ایمان نے اپنی جگہ دل میں بنائی ہے۔

اب بات آئی ہے تو ایک جملہ یاد رکھیے گا ایمان نے اپنا گھر بنایا ہے دل میں، اور نفاق نے اپنا گھر بنایا ہے زبان پر۔ منافق کے دل میں کوئی ایمان نہیں ہے جو کچھ ہے

زبان پر رہے۔ تو نفاق کی جگہ ہے زبان، ایمان کی جگہ ہے دل۔ اگر دل میں ایمان رہے اور زبان تک نہ آئے تو بھی نقصان نہیں ہے۔ لیکن اگر زبان پر ایمان رہے اور دل میں نہ آئے تو خدا کہتا ہے کہ یہ مومن نہیں کہے جا سکتے۔ پرانا جملہ برابر آپ سنتے رہتے ہیں۔ یہی فرق ہے منافقت میں اور تقیہ میں۔ منافقت میں ایمان زبان پر ہوتا ہے دل میں نہیں ہوتا ہے اور تقیہ میں ایمان دل میں ہوتا ہے چاہے زبان پر نہ آئے۔

اتنے واضح اور نمایاں فرق کے بعد بھی بعض سادہ لوح بے چارے مسلمان تقیہ کو منافقت کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ ابھی آپ کو منافقت کے معنی ہی نہیں معلوم۔ آپ نے اپنے ہی کو نہیں پہچانا ہم کو کیا پہچانیں گے۔ ابھی آپ کو منافقت ہی کے معنی نہیں معلوم ہیں تو آپ کو تقیہ کے معنی کیا معلوم ہوں گے مگر میرے سلسلۂ کلام کو ذہن میں رکھیں گے۔

یہ منافقین جب آ کے کہتے ہیں کہ آپ رسول اللہ ہیں تو خدا کہتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں یہ سچے کیسے بنیں گے۔ دوسری جگہ پر فیصلہ ہوا یہ اعراب آ کے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے آپ کہئے کہ تم مسلمان ہو۔ ایمان نہیں لائے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ایمان ابھی دل میں نہیں ہے۔ اس آیت سے اندازہ ہوا کہ منافقین کو جھوٹا کیوں کہا گیا ہے اس لیے کہ اگر ایمان ان کے دل میں آگیا ہوتا، اگر دل سے پیغمبرؐ کی رسالت کے قائل ہو گئے ہوتے تو جھوٹے نہ کہے جاتے۔ مگر چونکہ خدا نے یہ طے کر دیا کہ جن کا عقیدہ زبانوں پر رہتا ہے، دل پر نہیں رہتا ہم اس عقیدہ کو نہیں مانتے ہیں۔ لہٰذا منافقین کی یہی کمزوری ہے جس نے جھوٹا کہلوایا ہے تو منافق تو اس لیے جھوٹے قرار پائے کہ ان کا عقیدہ ان کے دل میں نہیں ہے۔

اب آئیے سچا کون ہے اسے بھی تلاش کریں۔ جھوٹوں کا حال تو معلوم ہو گیا اب سچوں کو تلاش کریں ان کا حال کیا ہے۔ ممکن ہے کوئی آدمی مجھ سے کہے آپ کو کیا تکلیف ہے کہ سچے جھوٹے سب مسلمان معلوم ہو جائیں۔ ارے جیسے گاڑی چل رہی ہے چلنے دیجئے۔ اگر سب مسلمان کہے جاتے ہیں تو الحمد للہ مجمع بڑھ ہی رہا ہے۔ عالم اسلام میں کثرت پیدا ہو رہی ہے آپ کو کیا پریشانی ہے؟ آپ نے کیوں ایسے ٹھکے ... [illegible]

کہ ایمان میں کتنے سچے ہیں اور کتنے جھوٹے ہیں۔ تو عزیزو! یہ میری ٹھیکیداری نہیں ہے۔

سورہ عنکبوت کی پہلی آیت ہے "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ" کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ یہ کہہ دیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور انھیں چھوڑ دیا جائے گا، ان کا امتحان نہیں لیا جائے گا۔ "وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ" ہم نے ان کے پہلے والوں کا امتحان بھی لیا ہے۔ خدایا یہ امتحان کیوں لیا؟ کہا "فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ" اس لیے کہ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں اور کتنے جھوٹے ہیں۔ تو عزیزو! یہ ہماری کوئی ٹھیکیداری، ہمارا کاروبار نہیں ہے یہ امتحان تو خدا نے شروع کیا ہے۔ جب وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں اور کتنے جھوٹے ہیں۔ تو ہم بھی اسی کے کلام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ کن لوگوں کو اس نے سچا قرار دیا ہے اور کن لوگوں کو اس نے جھوٹا قرار دیا ہے۔

ہم نہ کوئی فتنہ چاہتے ہیں نہ کوئی فساد چاہتے ہیں۔ نہ کوئی تفرقہ چاہتے ہیں نہ کوئی اختلاف چاہتے ہیں۔ پروردگار یہ چاہتا ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے، اس پر یہ بات واضح ہو جائے۔ اس پر تو واضح ہے اگرچہ الفاظ یہی ہیں کہ خدا یہ جاننا چاہتا ہے کہ دعوائے ایمان میں کتنے جھوٹے ہیں اور کتنے سچے ہیں۔ لیکن اگر وہ جاننا چاہتا ہے تو جانتا کون ہے؟ اس کے معنی کیا ہوئے؟ حقیقت امر یہ ہے کہ خدا اپنے جاننے کے واسطے یہ کام نہیں کر رہا ہے کہ خدا کو معلوم ہو جائے کون پاس ہوا، کون فیل ہوا۔ کون ایمان میں سچا ثابت ہوا، کون جھوٹا ثابت ہوا۔ یہ خدا ہمارے آپ کے علم کے لیے کر رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جھوٹا ہے اگر ہمیں دھوکہ دے تو ہم اس کو سچا سمجھ لیں۔ ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ چونکہ یہ خطرہ تھا کہ کوئی جھوٹا آ کے کہے گا مجھ سے بڑا مومن کون ہے۔ سب سے پہلے تو میں ہی مسلمان ہوا ہوں اور کوئی صاحب دھوکہ کھا جائیں۔ خدا نے کہا نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ کون جھوٹا، کون سچا اور یہ معلوم ہوگا امتحان کے ذریعہ۔ اب امتحان کیسے ہوگا؟ یہ بعد میں۔

اب تک کتنے مرحلے طے ہو گئے؟ پہلا مرحلہ یہ کہ خدا نے منافقین کو جھوٹا قرار دیا۔ دوسرا

مرحلہ یہ تلاش کرنا تھا کہ جھوٹے ہونے کی وجہ کیا ہے؟ تو خدا نے کہا کہ جب تک عقیدہ زبان پر رہے اس کا نام ایمان نہیں ہے۔ جب دل میں آجائے تو ایمان ہے۔ لہٰذا منافقت اندر کا مسئلہ ہے۔ غور کریں! ۔ تو خدایا تو نے سچے مومن کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اللہ و رسولؐ پر ایمان ہو اور شک نہ ہو تو کوئی ایسی پہچان بتائی ہوتی کہ ہم صورت دیکھ کر پہچان لیتے یہ سچا مومن ہے یہ جھوٹا مومن ہے۔ پہچان ایسی بتائی جس کی کسی کو اطلاع نہیں ہو سکتی۔ نہ یہ معلوم ہے کہ اندر ایمان ہے کہ نہیں۔ نہ یہ معلوم ہے کہ اندر شک ہے کہ نہیں۔ یہ سب تو اندرونی معاملات ہوگئے۔ ہم کیا کریں۔ ایسے اعلان کا فائدہ کیا ہوا۔ ایسے اعلان، ایسے معیار، ایسے میزان کا فائدہ کیا ہوا جو کوئی نہ سمجھ سکے۔ خدا نے کہا سچا مومن وہی ہے جو خدا اور رسولؐ پر ایمان لائے مگر شک نہ کرے۔ مگر کون کرے گا کون نہ کرے گا ہمیں کیسے معلوم ہوگا۔ ہم تو ہر جھوٹے کو سچا ہی سمجھیں گے۔ تو پروردگار نے کہا کہ جب ہم پہچنوانا چاہیں گے تو آپ پریشان نہ ہوں ہم دونوں قسموں کو پہچنوا دیں گے۔ انھیں بھی پہچنوائیں گے جن کے ایمان میں کبھی شک نہ داخل ہوا ہو، اور انھیں بھی پہچنوا دیں گے جن کے ایمان میں شک داخل ہو جائے۔ یہ اندر کی باتیں تم نہ سمجھ سکو گے مگر ہم انھیں کو مجبور کریں گے کہ اعلان کریں۔ اب تم انسانوں کی تاریخ پڑھو جہاں شک نہیں آیا اس کا اعلان یہ ہے کہ "اگر سارے پردے ہٹا دیئے جائیں تو بھی ایمان میں زیادتی نہیں ہو سکتی" اور جہاں شک آگیا وہاں اعلان ہوا جیسا شک آج ہوا ہے۔

تو خدا یہ جاننا چاہتا ہے۔ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے۔ خدا یہ دکھلانا چاہتا ہے کہ دعوائے ایمان میں کتنے سچے ہیں اور کتنے جھوٹے ہیں۔ اور یہ کیسے معلوم ہوگا؟ امتحان کے ذریعہ۔ امتحان لینے کے بعد خدا نے اعلان کر دیا کہ دعوائے ایمان میں وہ سچے ہیں جن کا ایمان اللہ و رسولؐ پر ہو، اور اس کے بعد پھر کبھی شک نہ کیا ہو۔ خیر اگر یہ شک نہ بھی کھلے تو ایک دوسری پہچان میں نے بالکل سامنے کر دی اسے دیکھ لو اور پہچان لو "جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ" راہِ خدا میں مال سے بھی جہاد کریں اور جان سے بھی جہاد کریں۔ خدا نے پہلے جہادِ مال کو رکھا یہ چھوٹا جہاد ہے، حالانکہ ہمارے واسطے تو یہی بڑا جہاد ہے

ہمارے لیے جہاد نفس جان دے دینا اتنا بڑا کام نہیں ہے جتنا بڑا کام مال دے دینا ہے۔ اس لیے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ کوئی دوست آیا دوست کے پاس۔ مجھے ضرورت ہے دو ہزار درہم کی آپ کے پاس ہوں گے؟ کہنے لگے کیا عرض کیا جائے درہم تو نہیں ہے ویسے جان حاضر ہے۔ یعنی درہم نہیں دیئے جا سکتے ہیں جان دی جا سکتی ہے۔ تو ہماری نگاہ میں جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اصل قیمت جو کچھ ہے وہ مال کی ہے اور شاید اسی لیے پروردگار نے بھی پہلے مال کو رکھ دیا ہے اس کے بعد جہاد نفس کا ذکر کیا ہے۔ اور شاید ایک مصلحتِ خدا یہ بھی ہو کہ جہاد نفس تو کبھی ہوگا اور کبھی نہ ہوگا جان کے ذریعہ جہاد کے بارے میں نہیں معلوم کہ کب معرکہ ہوگا، کب لڑائی ہوگی، کب کفار و مسلمین اکٹھا ہوں گے، کب جنگیں ہوں گی مگر مال کا جہاد تو صبح و شام ہوتا رہتا ہے۔ اگر دو منٹ کوئی بات کسی آدمی کے خلاف ہو بھی جائے خدا نخواستہ تو "رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف"۔ جہاد مال میں ہم کہاں ہیں، جہاد نفس میں ہم کہاں ہیں یا یوں کہا جائے کہ جہاد نفس میں کہاں ہوں گے یہ تو کل معلوم ہوگا جہاد مال میں کہاں ہیں یہ تو آج بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

ایک جملہ آپ کو سناؤں آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ جب ہم نے اپنے ایمان اور عقیدہ کا اعلان کیا تو ہم نے کہا حسینؑ پر تو ہماری جان قربان ہے۔ کتنا محتاط اعلان ہے۔ کتنی احتیاط سے اعلان ہوا ہے۔ فرزندِ رسولؐ پر، مولاؑ پر ہماری جان قربان ہے۔ لیکن جب مال قربان کرنے کا وقت آیا تو میں بھی کبھی کبھی ایسے مناظر دیکھتا ہوں کہ جیب میں ہاتھ ڈال تو دیا اور جیب سے پیسہ بھی نکال لیا لیکن اب مسئلہ ہے قربانی کا۔ اسی پرس میں پانچ سو کا نوٹ بھی رکھا ہوا ہے۔ اسی پرس میں دو سو کا نوٹ بھی ہے۔ اسی پرس میں سو کا نوٹ بھی ہے۔ اسی میں پچاس کا نوٹ بھی ہے۔ اسی میں دس کا نوٹ بھی ہے اسی میں خوش قسمتی سے پانچ کا نوٹ بھی ہے اور کھڑے ہیں اس کاؤنٹر پر جہاں یہ اعلان کرنا ہے کہ مولاؑ پر جان قربان ہے۔ مجھے کیا حق ہے کسی کے ایمان میں شک کرنے کا۔ یقیناً جان قربان ہوگی۔ لیکن خدا نے کہا جہاد نفس تو بعد میں ہوگا، پہلے جہاد مال کرو۔ سارے ورق الٹ کے، ڈھونڈھ کے پانچ کا نوٹ کھینچ کے نکالا اس احتیاط کے ساتھ

کہ کہیں ایک ساتھ دو نہ نکل آئیں۔ بس یہ ہے کل مال جو قربان ہے۔ سوچئے گا اطمینان سے گھر جا کے۔ اگر مولاؑ بھی کوئی ہماری برادری کے آدمی ہوتے تو ان کو دھوکہ دینا بہت آسان ہوتا۔ کہتے حضورؐ ہم آپ پر قربان ہیں اور حضورؐ بھی خوش ہو جاتے مگر وہ تو ہمارے رگ و ریشہ سے باخبر ہیں۔ ہمارے دل کے حالات جانتے ہیں۔ ہماری نیّتوں کو جانتے ہیں۔ ہمارے ضمیر کو پہچانتے ہیں۔ جو ہم خود اپنے بارے میں نہیں جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔ انھیں دھوکہ تو نہیں دیا جا سکتا ہے۔ آئے تھے اس جوش و خروش کے ساتھ کہ حضورؐ پر قربان اور جب قربانی کا وقت آیا تو بچ بچا کے جو سب سے کم تھا وہ نکالا قربان کرنے کے لیے۔ ہم نے تم کو دیکھ لیا۔ ہم پر خالی یہ پانچ کا نوٹ قربان ہے۔ باقی کچھ قربان نہیں ہے۔ اب اس کے بعد شیطان موجود ہی ہے سمجھانے کے لیے۔ کہا ٹھیک ہے دس بھی ہمارے پاس ہیں بیس بھی ہمارے پاس ہیں۔ پچاس بھی ہمارے پاس ہیں۔ سو بھی ہمارے پاس ہیں۔ مگر کام بھی تو ہمارے پاس بہت ہیں۔ بچّوں کا معاملہ ہے۔ بیگم کا معاملہ ہے۔ دوستوں کا معاملہ ہے۔ یہ معاملہ ہے وہ معاملہ ہے۔ لیکن یہ سب معاملات وہ ہیں جن میں کسی سے نہیں کہا کہ تم پر ہم قربان۔ نہ کبھی بیٹے سے کہا کہ تم پر ہم قربان۔ نہ کبھی بھائی سے کہا کہ تم پر قربان۔ نہ کبھی دوستوں سے کہا کہ تم پر قربان۔ جن پر قربان نہیں ہوئے ان کے واسطے دس والا بچا کے رکھا ہے، ان کے واسطے بیس والا نوٹ بچا کے رکھا ہے، ان کے لیے پچاس والا، سو والا، پانچ سو والا بچا کے رکھا ہے۔ اور جن پر قربان ہیں.....

بس اتنا ہی کافی ہے یہ جملہ۔ میں نے صرف اس لیے کہہ دیا تاکہ ہر آدمی اگر دھوکہ میں ہے تو اپنا حساب کر لے۔ ورنہ حساب کرنا ہمیں آتا ہے۔ چودہ سو برس پہلے مر جانے والوں کا حساب تو ہم کر ہی لیتے ہیں تو پھر زندوں کا حساب کرنے میں کیا تکلیف ہے۔ کون سا مشکل کام ہے۔ ہم نے تو خالی حساب کا ایک طریقہ بنا دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی حساب کرنا چاہتا ہے تو یہ پہچان لے کہ ہم جہادِ نفس میں کہاں ہیں اور جہادِ مال میں کہاں ہیں۔ ہمارا عمل کتنا ہے اور ہمارا دعویٰ کتنا ہے۔ اگر ہم جیسے صاحبانِ ایمان کا دعویٰ بھی عمل کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے اور ہمارا عمل بھی ہمارے دعوے کی تصدیق تو نہیں کر سکتا

کیا کہیں۔ ان کا تو نہ دعویٰ کچھ تھا نہ عمل کچھ تھا۔

سب کا دعوی ایمان ہے کہ سچے ہیں۔ لیکن اگر دل میں شک پیدا ہو جائے تو سچے نہیں ہیں۔ اگر مٹھی میں بخل پیدا ہو جائے تو سچے نہیں ہیں۔ اگر دل میں بزدلی پیدا ہو جائے تو سچے نہیں ہیں۔ سچے دعوائے ایمان میں وہ ہیں کہ دل بھی مضبوط رہے، شک نہ آنے پائے۔ مٹھی بھی کھلی رہے راہِ خدا میں قربانی کے لیے اور مال قربان کرتا رہے۔ اس قدر حوصلہ سلامت رہے جان دینے کا کہ وقت آئے تو اپنی جان کو بھی راہِ خدا میں عزیز نہ کرے۔ "اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ" یہ وہ ہیں جن کو پروردگار عالم امتحان کے بعد دعوائے ایمان میں سچا قرار دیتا ہے۔

کتنی منزلیں طے ہو گئیں جوڑتے رہیے گا۔ منافقین جھوٹے ہیں۔

کیوں جھوٹے ہیں۔ اعراب کے بارے میں واضح کیا گیا۔ اس لیے کہ ایمان دل کے اندر نہیں ہے اور ایمان کے دعوے میں کچھ جھوٹے ہیں، کچھ سچے ہیں۔ جن کا پہچاننا بھی ضروری ہے۔ یہ کام خدا نے شروع کیا ہے اور جب پہچاننے کی منزل میں آئے تو خدا نے اعلان کر دیا جہاں شک نہ ہو، جہاں جہادِ مال ہو، جہادِ نفس ہو، سمجھو وہاں دعوائے ایمان میں صداقت ہے ورنہ دعوائے ایمان جھوٹا ہے۔

ان چار منزلوں کے بعد اب ایک پانچویں منزل سنئے جہاں براہ راست اللہ نے پیغمبرؐ پر ایمان لانے کا واضح فیصلہ کیا ہے اور اتنا سنگین فیصلہ قرآن مجید کا دیگر مقامات پر نظر نہیں آتا ہے "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ" پیغمبرؐ! میں اپنی ذات کی قسم کھا کے کہہ رہا ہوں کہ یہ لوگ صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے۔ کب تک؟ "حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ" جب تک اپنے درمیانی اختلافات میں آپ کو حکم نہ بنائیں۔ میں پھر آ گیا اپنی منزل پر۔ جب تک اپنے درمیانی اختلافات میں آپ سے فیصلہ نہ کرائیں یہ صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے۔ تو اگر یہ اپنے معاملات کا خود فیصلہ کر لیں گے تو صاحبِ ایمان نہیں ہیں معاملات خود طے کر لیں گے اگر یہ اپنے معاملات ان کے ہوں مگر فیصلہ آپ کا ہو۔ تو سوچئے جب خدا کو یہ گوارا نہیں [illegible]

دعوے دار خدا کے معاملات کا فیصلہ کرنے بیٹھیں گے کہ معاملہ خدا کا اور فیصلہ کرے گا بندہ، تو یہ بندہ کیسے صاحبِ ایمان ہو جائے گا۔ یہ تو اس وقت تک صاحبِ ایمان نہ ہوں گے جب تک آپ سے فیصلہ نہ کرائیں۔ اچھا آگئے فیصلہ کرانے کے لیے۔ آپ نے فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد ہو گئے مومن۔ خدا نے کہا نہیں "ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ" اس کے بعد میرے حبیبؐ جب آپ کوئی فیصلہ کر دیں تو اس فیصلہ کے خلاف اپنے دل میں تنگی کا احساس نہ کریں کہ یہ کہہ دیا۔ یہ فیصلہ کیوں کر دیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اپنے بچے ہیں ان کی خاطر سجدے کو طول دیئے چلے جا رہے ہیں۔ بیٹی ہے اس کے لیے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ سب کیا کر رہے ہیں۔ اگر دل میں خیال بھی پیدا ہو گیا نبوت کے فیصلے کے خلاف تنگی کا احساس بھی پیدا ہو گیا تو پھر میرے حبیبؐ یہ صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے۔ شانِ ایمان یہ ہے کہ "يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا"، اپنے کو آپ کے حوالے کر دیں۔ جب تک منزلِ تسلیم میں نہ آجائیں گے یہ صاحبِ ایمان نہ ہوں گے۔ اور یہ مسئلہ وہ تھا جس کے واسطے خدا نے اپنی ذات کی قسم کھا کے اعلان کیا ہے۔ اب دیکھئے مسئلہ ایمان کا کتنا مشکل ہو گیا۔ جب کوئی اختلاف ہو تو حضورؐ سے فیصلہ کرائیں۔ اور جب فیصلہ کر دیں تو اپنے حق میں ہو یا اپنے خلاف ہو مگر دل میں کوئی تنگی کا احساس نہ پیدا ہو، خوش رہیں کہ حضورؐ کا فیصلہ ہے۔ کیا کہنا ہے سرکارؐ کا فیصلہ ہے۔ چاہے ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اگر یہ حوصلہ، یہ ہمت ہے تو اس کے معنی ہیں کہ صاحبِ ایمان ہے۔ اور اگر یہ حوصلہ نہیں ہے تو صاحبِ ایمان نہیں ہے۔ اسی مسئلہ کا پروردگار عالم نے دوسرے مقام پر اعلان کیا "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ" اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو، صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔ "فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ" اس کے بعد اگر آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے "فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ"، تو مسئلہ کو خدا اور رسولؐ کے حوالے کر دینا۔ اگر اپنے جھگڑوں کا خود تم نے فیصلہ کر لیا تو صاحبِ ایمان نہیں ہے صاحبِ ایمان ہونے کی شرط یہ ہے کہ خدا کے حوالے کرو۔ رسولؐ کے حوالے کرو۔ اگر خدا تک نہیں جا سکتے تو رسول تو سامنے موجود ہے۔ مسئلہ کو اس کے حوالے کر دو۔ اگر نبیؐ سے فیصلہ

خود کہتا ہے کہ میری ذات کی قسم یہ صاحب ایمان نہیں ہیں۔ اس شدت کا احساس آپ کریں گے اب میں آخری مرحلہ پر دو ایک جملے گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ جن بچوں پر بات واضح نہیں ہوئی ہے ان پر بھی واضح ہو جائے۔

معبود نے آخری مرحلہ پر آخری فیصلہ سُنا دیا کہ شرط ایمان یہ ہے کہ جب کوئی اختلاف ہو تو فیصلہ نبیؐ سے کرائیں اور جب نبیؐ فیصلہ کر دیں تو کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ ہو۔ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ" جب کسی بات میں تنازع جھگڑا ہو تو خدا کے حوالے کرو۔ رسولؐ کے حوالے کرو۔ اب ہمارے ایمان کا دارومدار اس بات پر ہے کہ جب کوئی جھگڑا ہو تو فیصلہ حضورؐ سے کرائیں۔ اگر پیغمبرؐ سے فیصلہ کرا لیا تو مومن ہو گئے اور پیغمبرؐ سے فیصلہ نہیں کرایا تو منافق و کافر ہو گئے۔ اب ہم پیغمبرؐ سے فیصلہ کرانا نہیں چاہتے، ہم پیغمبرؐ کے فیصلہ کو ماننا نہیں چاہتے تو خدا کہتا ہے کہ نبیؐ سے فیصلہ نہ کراؤ گے تو مومن نہ ہو گے۔ اب کریں کیا۔ ہم بھی سمجھ دار ہیں۔ ہم تو صحرا و بیابان کے رہنے والے نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ ہم نے کہا مسئلہ کا حل موجود ہے۔ خدا نے کیا کہا ہے جب کوئی جھگڑا پیدا ہو تو خدا اور رسولؐ سے فیصلہ کراؤ۔ اگر خدا اور رسولؐ سے فیصلہ کرائیں گے تو مومن ہیں، نہ کرائیں گے تو مومن نہیں ہیں۔

ہم نے کہا ہم سمجھ دار ہیں، جب تک نبیؐ سامنے رہیں گے ہم جھگڑا کریں گے ہی نہیں کہ حضورؐ سے فیصلہ کرانا پڑے۔ خدا نے تو کہا ہے کہ جب جھگڑا پیدا ہو جائے تو فیصلہ یہ کریں گے۔ یہ فیصلہ نہ کریں گے تو تم صاحب ایمان نہ بنو گے۔ تو بہترین بات یہ ہے کہ جھگڑے کو اتنی دیر روک لیا جائے کہ ان سے فیصلہ کرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ ایمان بھی سلامت رہے گا اور آیت پر عمل بھی ہوتا رہے گا۔ پروردگار نے کہا اگر تم میں اتنی ذہانت پائی جاتی ہے، اگر تم میں اتنی ہوشیاری پائی جاتی ہے تو یہ ذہن بھی تو ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ یہ دماغ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے، ہم سے تو کوئی بندہ آگے نہیں جا سکتا ہے۔

یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے۔ ایک پُرانی مثل ہے بلکہ پُرانا قصّہ ہے اور بغیر مثالوں

کے بچوں تک بات منتقل نہیں ہوسکتی ہے لہٰذا بس دومنٹ کے اندر یہ مثال بھی آپ سُن لیں۔ بادشاہ اور وزیر میں ہوگیا اختلاف۔ بادشاہ وزیر کو ملامت کرتا تھا کہ تم لوگوں کو اگر صحیح تربیت دو تو لوگ واقعاً صحیح اچھے خاصے مسلمان، مومن یا باقاعدہ انسان شریف ہوجائیں۔ یہ تربیت کی کمزوری ہے جو لوگ ٹھیک نہیں ہوتے ہیں۔

وزیر کہتا تھا کہ بعض لوگ واقعاً شریر ہوتے ہیں، خبیث ہوتے ہیں، نالائق ہوتے ہیں۔ کتنی ہی آپ ان کو تربیت دیجئے ٹھیک نہیں ہوسکتے ہیں۔ بادشاہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نہیں تربیت سے سب کچھ ہوسکتا ہے اب ظاہر ہے کہ وزیر بیچارہ کیا بحث کرے گا۔ کل وزارت سے برخاست کردیا جائے گا مگر بادشاہ کو یہ خیال ہے کہ وزیر پر یہ ثابت کردینا ضروری ہے کہ تربیت سے سب کچھ ہوسکتا ہے۔ اُس نے دوسرے آدمی سے کہا کہ تم بتاؤ تربیت سے انقلاب پیدا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

اس نے کہا بے شک ہوسکتا ہے۔ کہا تم کچھ کرکے دکھلاؤ تاکہ میں وزیر پر حجّت تمام کردوں۔

اس نے کہا کہ حضور تھوڑا موقع دیجئے۔ وزیر دو بلّیاں لایا اور بلّیوں کو ٹریننگ دینا شروع کی کہ جب بادشاہ آکے بیٹھے تو بادشاہ کے سامنے شمع لے کر کھڑی ہوجائیں۔ ایک دن، دو دن، چار دن، مہینہ، دو مہینہ گذر گیا۔ جب بادشاہ آکے دربار میں بیٹھتا ہے، بلّیاں شمع لے کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔ جب بادشاہ کو اطمینان پیدا ہوگیا کہ اب کوئی دھوکہ نہیں ہوگا تو ایک دن وزیر کے سامنے پھر ذکر کیا کہ تربیت سے زندگی میں انقلاب آسکتا ہے۔ وزیر نے کہا کہ میں نے آپ سے گذارش کی ہے نہیں ہوسکتا ہے۔ اب آپ نہیں مانتے ہیں تو میں آپ سے کیسے بحث کروں۔

فرمایا تم کو شرم نہیں آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ دیکھو کیا ہورہا ہے بلّیوں کا کام ہے شمع لے کر کھڑا ہونا؟ یہ کام آدمیوں کا ہے۔ آدمی شمع لیکر کھڑا ہوتا ہے۔ بلّیاں یہ کام نہیں کرتی ہیں۔ مگر تربیت سے ہوا کہ نہیں ہوا۔ اگر تربیت سے بلّیوں کا مزاج بدل سکتا ہے تو آدمی کا مزاج کیوں نہیں بدل سکتا ہے۔

وزیر نے دیکھا کہ بادشاہ اتنی اونچی دلیل لے آیا ہے کہ سارا مجمع قائل ہو گیا ہے۔
میں ہار گیا۔ بادشاہ سلامت جیت گئے۔ اب مجھے کیا سزا ملتی ہے۔

اس نے کہا حضور! آپ نے دو چار مہینہ کی محنت سے اپنے دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ دو چار منٹ کا وقت مجھے بھی دیجئے تاکہ میں اپنے دعویٰ کے بارے میں کچھ کہہ سکوں۔ کہا جاؤ تمھیں وقت دے دیا۔ وزیر دربار سے باہر نکلا اور باہر آنے کے بعد کیا کوشش کی، کیا محنت کی خدا بہتر جانتا ہے۔ کہیں سے ایک چوہے کا بچہ پکڑ کے لے آیا مٹھی میں دبا کے ایک چھوٹا سا چوہے کا بچہ لے آیا۔ کہا حضور کیا فرما رہے تھے؟ کہا میں فرما نہیں رہا ہوں، میں تم کو دکھا رہا ہوں۔ دیکھو تربیت سے مزاج کیسے بدلتا ہے۔ کہا حضور کیا آپ کا خیال ہے کہ بلّیوں کا مزاج بدل گیا ہے۔ کہا بالکل بدل گیا ہے۔ کیا اندھے ہو گئے ہو دیکھ نہیں رہے ہو کہ شمع لیے کھڑی ہیں۔ اس نے کہا حضور اپنی کرامت دکھلا چکے اب حقیر کی کرامت دیکھئے۔ یہ کہہ کر چوہے کا بچہ مُٹّھی سے نکال کے چھوڑ دیا۔ کہاں کی شمع اور کیسی روشنی۔ دونوں بلّیاں ٹوٹ پڑیں۔ اب بادشاہ کی جو حالت ہوئی وہ آپ محسوس کر سکتے ہیں۔

وزیر نے کہا سرکار آپ نے دیکھ لیا اصل میں ویسے حالات نہیں آئے جن میں فطرت پہچانی جاتی ہے ورنہ حالات پیدا ہو جائیں تو اس کے بعد آپ بتائیے کہ کیا ہوا تو میں مان جاؤں گا۔ توجہ کر رہے ہیں؟۔ لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ درمیان میں کوئی چوہے کا بچہ آنے ہی نہیں پائے گا۔ بلاتشبیہ گذارش کر رہا ہوں۔ نہ درمیان میں چوہے کا بچہ آنے پائے گا اور نہ فطرت پہچانی جائے گی۔ مگر پیدا کرنے والے نے کہا کہ جب میں پہچنوانا چاہوں گا تو فطرت سامنے آجائے گی۔ تم نے طے کر لیا کہ جب تک یہ رہیں گے فیصلہ کرنے والے ہم جھگڑا نہ کریں گے۔ ہم جب پہچنوانا چاہیں گے تو ایسا انتظام کر دیں گے کہ فطرت کھُل کر سامنے آجائے گی۔ اچھی خاصی زندگی گذر گئی۔ باعزّت سب آمَنّا صَدَّقنا کہہ رہے تھے۔ عزیزو میں کچھ گذارش نہ کروں گا۔ خود سوچئے گا۔ جس کی ایسی باعزّت زندگی گذری ہو کہ جو جملہ زبان سے نکلے آمَنّا۔ جو بات کہیں صَدَّقنا۔ سب قربان، سب

صدقے، سب نچھاور۔ اسے کیا تکلیف تھی کہ ایسی بات کہہ دے کہ سب کہیں ہذیان، بکواس۔ وہ اپنی عزّت کو کیوں خطرہ میں ڈال رہا ہے۔ مگر مسئلہ عزّت کو خطرہ میں ڈالنے کا نہیں ہے۔ مسئلہ اس دبی ہوئی فطرت کو اُبھارنے کا ہے۔ اتنی باعزّت زندگی گذارنے والا اب آخر میں کہتا ہے ایک قلم دوات لے آؤ۔ ارے آپ کو تو معلوم ہے کہ کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ ضرورت ہی کیا ہے کہ ایسی بات کہیں کہ اسی بات سے بہت سی باتیں پیدا ہو جائیں۔ لیکن کہہ دیا قلم دوات لاؤ۔ اتنے دنوں سے سب سنبھالے ہوئے ہیں اپنے کو، کوئی جھگڑا نہ ہونے پائے گا۔ میں نہیں کہتا امام بخاری فرماتے ہیں۔ اب جھگڑا شروع ہو گیا۔ دیا جائے، نہ دیا جائے۔ لایا جائے، نہ لایا جائے۔ اتنا اختلاف بڑھا کہ حضورؐ نے خود فرمایا "لَا یَنْبَغِیْ عِنْدَ نَبِیٍّ تَنَازُعٌ"، نبیؐ کے سامنے جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ یعنی اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نام حضورؐ نے پیار و محبت نہیں رکھا ہے، صحیح کتاب کی روایت کی بنا پر حضورؐ نے اس کا نام رکھا ہی تنازع۔ لفظیں یاد کر لیجیے کام آئیں گی۔ حضورؐ نے اس کا نام رکھا ہے جھگڑا۔ اور جب حضورؐ نے کہا یہ ہے جھگڑا تو اب قرآن نے کہا مسلمانو! جب کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو پیغمبرؐ سے فیصلہ کرانا۔ اگر پیغمبرؐ سے فیصلہ نہ کرایا تو پروردگار کی قسم تم صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے ہو۔

تو عزیزانِ محترم! ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ حضورؐ کے فیصلے کے آگے سر جُھکا دے۔ سر تسلیم خم کر دے۔ حضورؐ کے فیصلہ کے مقابلہ میں دل میں احساس بھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی یہ نہ سوچیے گا کہ مغرب کی تین رکعت کیوں ہے، اور صبح کی دو دو کیوں ہے اور عصر کی چار کیوں ہے۔ عشاء کی چار کیوں ہے۔ کبھی نہ سوچیے گا۔ جو فیصلہ ہو گیا وہ ہو گیا۔ جو فرما دیا وہ فرما دیا۔ بغیر وحی خدا کے فرماتے نہیں ہیں۔ جو فرما دیا اسی کے سامنے ہماری ذمہ داری ہے کہ سر جھکا دیں۔ اب اپنی عقل، اپنا خیال، اپنا مزاج، اپنی سوچ، اپنی فکر، ان باتوں کا کوئی گذر نہیں ہے۔ یہ تو منزل تسلیم ہے جو کہہ دیں وہی ماننا پڑے گا اس لیے کہ ان پر ایمان لائے۔ اپنی عقل پر ایمان نہیں لائے۔ اپنے مزاج پر ایمان نہیں لائے۔ ایمان ان پر لائے ہیں۔ اگر ایسے ہی صاحبِ عقل تھے تو ایمان ہی نہ لائے ہوتے۔ اگر

آپ ان سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں اور ان کی باتیں سب بیماری کا نتیجہ ہیں اور آپ کی باتیں سب عقلمندی کا نتیجہ ہیں۔ تو ان سے کہئے کہ آپ کا کلمہ پڑھیں۔ آپ کو کیا تکلیف ہے کہ آپ ان کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ جو زیادہ سمجھ دار ہے اس کا کلمہ پڑھنا چاہیئے۔ جو سمجھ دار ہے وہ غیر سمجھ دار کا کلمہ کیوں پڑھے گا۔ لیکن اگر ایمان لائے ہیں تو شرط ایمان یہ ہے کہ ان کے سامنے سر جھکانا ہو گا۔ ان کے سامنے سر نہیں اٹھانا ہو گا۔ عجب بات ہے اگر ایمان لائے ہو تو ان کے سامنے سر جھکانا ہو گا، ان کے سامنے سر اٹھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کیا ایمان ہے کہ نبیؐ سامنے آئے تو سب کا سر اٹھ جائے، اور عمرو بن عبدود سامنے آئے تو کسی کا سر نہ اٹھے۔ اب ہم نے اندر کے مزاج کو پہچان لیا۔ یہ سر کہاں اٹھتا ہے اور کہاں جھک جایا کرتا ہے۔

شرط ایمان یہ ہے کہ جہاد ہو مال سے، جان سے۔ حقیقی صاحبِ ایمان وہ ہے جو جان و مال سے جہاد کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اگر دنیا کی تاریخ میں ایسے مجاہدین نہیں ہیں تو نہ ہوں ہمارا کیا قصور ہے۔ اگر دنیا کی تاریخ میں میدانِ جہاد میں ثبات قدم کا مظاہرہ کرنے والے نہیں ہیں تو نہ ہوں، ہمیں کیا تکلیف ہے۔ اگر دنیا کی تاریخ میں میدانِ موت سے ہٹ جانے والے ملتے ہیں تو ملا کریں، ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری تاریخ میں تو وہ کردار ملتے ہیں کہ اگر مرنے کا ذکر نہ آئے تو پریشانی ہے۔ "قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ" یہ بھی ایک کردار تھا۔ خود قرآن مجید کہتا ہے آپ انھیں سمجھائیے کہ جس موت سے بھاگ رہے ہو بھاگ کے کہیں جا نہیں سکتے۔ "اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ" پیغمبرؐ! یاد دلائیے کہ جب آپ پکار رہے تھے اور یہ پلٹ کے نہیں آ رہے تھے۔ یہ میدانِ موت میں نہیں آنا چاہتے ہیں۔ جان دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے ہیں۔ یہ مرنے کی ہمت نہیں رکھتے ہیں۔ ایک تاریخ وہ بھی ہے جو بڑوں کی تاریخ ہے۔ بزرگوں کی تاریخ ہے۔ سن و سال والوں کی تاریخ ہے کہ موت سامنے آ جائے تو میدان چھوڑ کے سامنے سے چلے جائیں اور ایک بچوں کی تاریخ ہے۔ ایک کمسنوں کی تاریخ ہے۔ ایک نابالغوں کی تاریخ ہے کہ جب سب کا ذکر آیا کہ کل راہِ خدا میں سب قربان ہوں گے اور بچہ کا ذکر نہیں آیا تو دنیا کا کوئی دوسرا ہوتا تو

خوش ہوجاتا کہ کوئی نہ رہے گا مگر ہم رہ جائیں گے، ہماری جان بچ جائے گی۔ مگر یہاں عجیب منظر دیکھا جب محضرِ شہادت سُنایا گیا سب کا نام آیا ایک بچہ کا نام نہیں آیا تو بچہ مولاؑ کے سامنے سے اٹھا، خیمہ کے ایک گوشہ میں جا کے بیٹھ گیا اور بیٹھ کے زار و قطار رونا شروع کیا۔ ہائے میرا مقدر۔ دو برس کی عمر تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ یتیمی کی زندگی گذاری۔ باپ کے سائے سے محروم رہا۔ ایک آخری وقت آیا تھا ایک آخری سعادت کا، ایک آخری شرف کا، ایک آخری عزّت کا، یہ بھی مقدّر میں نہیں ہے۔ ابھی بچہ رو رہا تھا کہ روتے روتے نہ جانے کیا ذہن میں خیال آیا کہ جب میں انتہائی کمسن تھا باپ کی گود میں اور باپ دنیا سے رخصت ہو رہا تھا تو ایک تعویذ مجھے دیا تھا کہ بیٹا جب کوئی سخت وقت آجائے تب اس تعویذ کو کھولنا اس سے پہلے نہیں۔ اور تعویذ کو دیکھ لینا جو اس میں لکھا ہو اس کے مطابق عمل کرنا۔ جیسے ہی یہ خیال آیا فوراً تعویذ کو کھولا۔ دیکھا لکھا ہے "بُنَيَّ قَاسِمُ اُدْرِكْ عَمَّكَ الْحُسَيْنَؑ" بیٹا قاسمؑ تم سے بس اتنا کہنا ہے کہ چچا کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ اپنے چچا حسینؑ کا خیال رکھنا۔ بس قاسمؑ نے یہ دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ لبوں پر تبسّم ہے۔ آئے مولاؑ کے سامنے۔ فرمایا بیٹا خیر تو ہے، خوش دکھائی دے رہے ہو۔ کہا ہاں چچا ایک نوشتہ لے کر آیا ہوں ذرا اسے آپ پڑھ لیں۔ مولاؑ نے کاغذ کو لیا، پڑھا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہا بیٹا یہ نوشتہ لے کر آئے ہو یا اپنی موت کا پیغام سُنانے آئے ہو۔ ہائے اولاد والو! تیرہ برس کا کمسن بچہ اپنی موت کا پیغام سُنانے آیا ہے۔ فرمایا میرے لال سنو۔ کل وہ قربانی کا دن ہے کہ سب راہِ خدا میں قربان ہو جائیں گے۔ بیٹا قاسمؑ تمھارا کیا ذکر ہے تمھارا چھ مہینہ کا بھیّا علی اصغرؑ بھی راہِ خدا میں قربان ہو جائے گا۔ غیرت دار و! متوجہ رہنا۔ جب قاسمؑ نے اپنے مرنے کا ذکر سُنا تو خوش ہو گئے۔ مگر جیسے ہی مولاؑ نے کہا کہ تم کیا تمھارا چھوٹا بھیا علی اصغرؑ بھی راہِ خدا میں کام آجائے گا ایک مرتبہ بے قرار ہو گئے۔ کہا چچا اَهَلْ يَصِلُوْنَ اِلَى الْخِيَامِ"؟۔ اے چچا! کیا یہ اشقیا خیمہ میں آجائیں گے؟ ہاشمی بچہ کی غیرت گوارا نہیں کر سکتی کہ اشقیا خیمہ میں داخل ہو جائیں۔ حسینؑ نے قاسمؑ کو یہ کہہ کر سمجھا دیا۔ بیٹا میں علی اصغرؑ کو لے کر میدان میں جاؤں گا۔ مگر جی چاہتا ہے گذارش کروں۔ قاسمؑ یہ تمھارا

حوصلہ تھا تم یہ نہ سوچ سکے کہ اشقیاء خیمہ میں آجائیں گے اور یہ عابدؑ بیمار کا حوصلہ تھا کہ خیمے جل رہے ہیں، چادریں چھن رہی ہیں اور بیمار اس منظر کو دیکھ رہا ہے۔

بس عزیزو! اب کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ اب تو یہ تذکرے وہ ہیں کہ جہاں بنی ہاشم کے گھر میں صف عزا بچھی ہے۔ یہ رات بھی گذر گئی صبح کا وقت آیا اب جو قربانی کا وقت آیا۔ اولاد عقیل کی قربانی کے بعد جب اولاد علیؑ کی قربانی کا وقت آیا تو اولاد علیؑ میں امام حسنؑ اور امام حسنؑ کی اولاد میں جناب قاسمؑ۔ پھر آئے چچا کے سامنے۔ چچا آپ نے تو فرمایا تھا کہ محضر شہادت میں تمہارا نام بھی ہے۔ کل راہِ خدا میں تمہیں بھی قربان ہونا ہے۔ تو چچا پھر اب اجازت دیدیجئے۔ حسینؑ نے قاسمؑ کو سر سے پیر تک دیکھا۔ عزیزو! لفظوں کا کہہ دینا اور سُن لینا بہت آسان ہے مگر جس پر گذر رہی ہے اس کا دل جانتا ہے۔ امام حسینؑ نے بھتیجے کو سر سے پیر تک دیکھا۔ بیٹا میدان میں جانا چاہتے ہو؟ کہا ہاں چچا اب اجازت دیدیجئے۔ اب میدان میں جانے دیجئے۔ اب مجھے قربان ہونے دیجئے۔ کہا اچھا بیٹا ٹھہرو۔ یہ کہہ کر امام حسینؑ نے قاسمؑ کو سجانا شروع کیا۔ پہلے سر پر عمامہ باندھا اور عمامہ باندھا تو دونوں سرے سینے پر لٹکا دیئے۔ زرہ پہنائی۔ تلوار کمر سے لگائی۔ قاسمؑ کو تیار کیا۔ اب جو قاسمؑ آراستہ ہو گئے چلنا چاہتے ہیں تو نہ جانے مولاؑ کو کیا خیال آیا۔ ایک مرتبہ قاسمؑ کا گریبان چاک کر دیا۔ بچّے نے گھبرا کے پوچھا۔ چچا کیا مجاہدوں کے سجانے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ کیا میدان میں جانے والوں کا یہ بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ یہ آپ نے گریبان کیوں چاک کر دیا؟۔ کہا بیٹا یہ یتیموں کی نشانی ہے۔ یہ کہہ کر حسینؑ چاہتے تھے کہ قاسم کو گھوڑے پر بٹھائیں کہ ایک مرتبہ کلیجہ سے لگا لیا۔ کلیجہ سے لگا کے رونا شروع کیا۔ اُدھر بھتیجا رو رہا ہے اِدھر چچا رو رہا ہے۔ دونوں اتنا روئے کہ تاریخ کا فقرہ ہے کہ غش کھا کے گر پڑے۔ ہائے وہ ثانی زہراؑ کی مجبوری۔ اُدھر بھتیجا غش کے عالم میں، اِدھر بھائی غش کے عالم میں اور خیمہ میں ایک قطرہ پانی نہیں۔ زینبؑ کیسے ہوش میں لانے کا انتظام کریں۔ شہزادی بیٹھ گئیں۔ آنسوؤں کا چھڑکاؤ شروع کیا۔ حسینؑ نے آنکھیں کھولیں۔ قاسمؑ کو بیدار کیا۔ بچہ کو کلیجہ سے لگایا۔ بازو تھام کے گھوڑے پر بٹھایا۔ بس اب جو قاسمؑ چلے۔ میدان میں آئے۔ قاسمؑ کا

جہاد شروع ہوا۔ مگر عالم یہ ہے کہ اِدھر ایک کے بعد ایک بڑے سے بڑا پہلوان آرہا ہے اور اُدھر قاسم ایک ایک وار میں اس کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ اُدھر سے تربیت دینے والا دادِ شجاعت دے رہا ہے۔ شاباش میرے لال۔ عباس بھتیجے کا جہاد دیکھ رہے ہیں۔ شاباش میرے لال، شاباش میرے قاسم۔ جہاد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ایک مرتبہ چاروں طرف سے حملہ ہوگیا اور زخموں کی تاب نہ لاکر گھوڑے پر ٹھہر نہ سکے۔ جب خاک کی طرف چلے۔ آواز دی۔ عمّاہ چچا آئیے۔ حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ ایک مرتبہ کمر کو کس کے باندھا۔ میدان کا رُخ کیا۔ روایت کہتی ہے کہ اب جو آگے بڑھے تو دیکھا کہ قاتل سرہانے بیٹھا ہوا ہے۔ تلوار ہاتھ میں ہے قاسم کا سر کاٹنا چاہتا ہے۔ قاسم نگاہیں اُٹھا اُٹھا کر چچا کو دیکھ رہے ہیں۔ حسینؑ اس تیزی سے دوڑتے ہوئے جا رہے ہیں کہ کیسے زندہ بھتیجے تک پہونچ جائیں۔ بس اسی کش مکش کے عالم میں نہ جانے قاسم پر کیا گذر گئی کہ اُدھر کے سوار اِدھر۔ اِدھر کے سوار اُدھر۔ رونے والو! مقتل میں مَیں نے یہ فقرہ دیکھا ہے کہ سینہ پر چوٹ پڑتی تھی تو گھبرا کے کہتے تھے چچا، چچا، چچا۔ حسینؑ نے کہا اے بیٹا تیرے چچا کے لیے بڑا سخت وقت ہے کہ میں آیا مگر تیرے کام نہ آسکا۔ میں آیا مگر تجھے دشمنوں سے نہ بچا سکا۔ ہائے میری نگاہ کے سامنے تصویرِ برادر خاک میں مل گئی۔ اے بھیّا یہ تمہارا لال۔ اے بھیّا حسنؑ یہ تمہارا قاسم..... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۸

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِھِمْ اَجْمَعِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ!

صاحبانِ ایمان وتقویٰ وہ ہیں جو اس رسول نبیؐ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی۔ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے، بُرائیوں سے روکتا ہے۔ طیّبات کو حلال قرار دیتا ہے، خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت کے سر سے اس بوجھ کو اٹھا لیتا ہے اور انسانیت کو ان زنجیروں سے آزادی دلا دیتا ہے جن زنجیروں سے عالم انسانیت جکڑا ہوا تھا۔ پس جو لوگ اس نبیؐ پر ایمان لائے، اس کا احترام کیا اور اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہی لوگ زندگانی دنیا میں کامیاب ہیں۔

آیۂ کریمہ کے ذیل میں رسالتِ الٰہیہ کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام آپ حضرات کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے آٹھویں مرحلہ پر کچھ باتیں تعظیمِ پیغمبرؐ سے متعلق آپ کے سامنے گذارش کرنا ہیں۔

یہ نکتہ حقیقتاً قابلِ توجہ ہے کہ مالک کائنات نے اپنے حبیبؐ کے بارے

میں جن باتوں کا مطالبہ کیا ہے ان میں فقط ایمان نہیں ہے، فقط پیغمبرؐ کی نصرت اور مدد نہیں ہے بلکہ ایمان اور نصرت کے علاوہ پیغمبرؐ کا احترام اور پیغمبرؐ کی تعظیم بھی شامل ہے۔ یہ کوئی نیا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس سے پہلے بھی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ "لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ"، اللہ نے بنی اسرائیل سے اس وقت عہد لیا جب بنی اسرائیل کے درمیان اللہ نے بارہ نقیب بھیجے۔ اس کے بعد پروردگار نے اعلان کیا "اِنِّىْ مَعَكُمْ"، بنی اسرائیل میں تمھارے ساتھ ہوں مگر شرطیں ہیں "لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ"، اگر تم نے نماز قائم کی۔ "وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ"، اور تم نے زکوٰۃ ادا کی اور اس کے بعد میرے مرسلینؑ کا احترام کیا۔ پروردگار عالم نے بندوں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا مگر اس کے لیے تنہا نماز کو کافی نہیں قرار دیا۔ تنہا زکوٰۃ کو کافی نہیں قرار دیا۔ "اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ" اگر تم میرے رسولوں پر ایمان لائے۔ اور تنہا ایمان بھی کافی نہیں ہے۔ "وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ"، اگر تم نے میرے رسولوں کا احترام کیا۔ اس کے علاوہ بھی دیگر مقامات پر قرآن مجید میں یہ تذکرہ پایا جاتا ہے۔ مگر ساری باتوں کے عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ جس مسئلہ کی وضاحت کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ دین اسلام میں نہ پیغمبرؐ پر تنہا ایمان لانا کافی ہے، نہ پیغمبرؐ کی مدد کرنا کافی ہے، نہ پیغمبرؐ کا اتباع کرنا کافی ہے، نہ پیغمبرؐ کے ساتھ رہنا کافی ہے۔ اِن تمام باتوں کے ساتھ ایک بنیادی شرط ہے پیغمبرؐ کا احترام۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنے بزرگوں کا احترام نہ کرتی ہو۔ قانون احترام، شریعت اسلام کا کوئی قانون نہیں ہے۔ عالم عقل و عالم انسانیت کا قانون ہے جس پر ساری دنیائے انسانیت میں عمل ہوتا ہے۔ جو جس کی نگاہ میں قابلِ تعظیم ہوتا ہے وہ اس کی تعظیم کرتا ہے۔ کہیں آپ کو یہ بدبختی نظر نہ آئے گی۔ کسی قوم میں، کسی جماعت میں، کسی ملحد گروہ میں، کسی کافر گروہ میں، کسی مشرک جماعت میں کہیں بھی آپ کو یہ بدبختی نظر نہ آئے گی۔ کسی جماعت میں کہ انسان کی عظمت اور شخصیت کا اعلان بھی کیا جائے اور اس کے بعد یہ بھی کہا جائے کہ ہم ہی جیسے ہیں۔ جس قوم نے جسے محترم قرار دیا اُسے اپنے

سے بالاتر سمجھا۔ جس قوم نے جسے معظم قرار دیا اُسے اپنے سے اونچا سمجھا۔ کوئی قوم دُنیا میں ایسی نہیں ہے جس نے کسی کی عزّت کا، اُس کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہو، اور پھر اس کے بعد یہ بھی کہہ دیا ہو کہ کوئی فرق نہیں ہے، یہ اور ہم دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ یہ بدنصیبی پورے عالم انسانیت میں فقط عالم اسلام کا حصّہ ہے، جہاں ایمان بھی ہے، نصرت بھی ہے، تصدیق بھی ہے، قربانی بھی ہے، فدائی بھی ہیں۔ ساری باتیں پائی جاتی ہیں اور اس کے بعد بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ جیسے یہ ویسے ہم۔ اگر جیسے یہ ویسے ہی آپ تو ایمان ہی کیوں لائے تھے۔ اتباع ہی کیوں کیا تھا۔ پیروی ہی کیوں کی تھی۔ لیکن اگر ایمان لائے ہیں، اتباع کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کچھ اور ہیں اور آپ کچھ اور ہیں۔ اور جس دن یہ احساس پیدا ہو جائے گا جذبۂ احترام اندر سے پیدا ہو جائے گا۔ جذبۂ احترام کسی پر لادا نہیں جاتا ہے۔ کسی کے بارے میں آپ کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ یہ محترم ہیں، یہ بزرگ ہیں، آپ کے اندر خود بخود جذبۂ احترام پیدا ہو جائے گا۔ اسلام نے اسی نکتہ کیطرف مسلمان کو متوجہ کیا ہے کہ شاید مسلمان میں کوئی ایسی کمزوری پیدا ہو جائے کہ دنیا میں ساری قومیں محترم شخصیتوں کا احترام کریں اور مسلمان غافل ہو جائے۔ لہٰذا پروردگار نے کہا کہ تمھارے لیے شرط ایمان یہ ہے کہ اگر نبیؐ پر ایمان لائے ہو تو نبیؐ کا احترام بھی کرنا۔

چند جملے اس مقام پر تمہیدی طور سے گذارش کرنا ہیں تاکہ یہ باتیں میرے بچّوں کے ذہن میں رہیں کہ فقط سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہر ایک کی زندگی سے متعلق ہے تعظیم، احترام۔ یہ دنیا کی ہر قوم میں، دنیا کی ہر جماعت میں اور دنیا کے ہر انسان کے ذہن میں یہ تصوّر پایا جاتا ہے، اختلاف طریقۂ تعظیم میں ہوتا ہے۔ ایک قوم میں تعظیم کا طریقہ کچھ اور ہے، دوسری قوم میں تعظیم اور احترام کا طریقہ کچھ اور ہے۔ ہم نے اپنے بچپنے میں دیکھا کہ بزرگ بچّوں کو سمجھایا کرتے تھے کہ جب بزرگوں کے سامنے جاؤ تو اگر سر کھلا ہوا ہے تو ٹوپی پہن کے جاؤ۔ اور اسی ماحول میں چونکہ ہمارے ملکوں میں آپ جانتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت تھی، ان کا ٹھیک اس کے برعکس قانون تھا کہ جب کسی بڑے بزرگ کے سامنے جاؤ تو اگر ٹوپی پہنے ہو تو اُتار لو۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ تعظیم میں اختلاف ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مسلمان اپنے

بزرگوں کی تعظیم سکھاتا ہے اور عیسائی اپنے بزرگوں کی توہین سکھاتا ہے۔ تعظیم کی تعلیم یہ بھی دیتے ہیں۔ احترام کی تعلیم وہ بھی دیتے ہیں۔ احترام کے طریقوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اِن کے یہاں ٹوپی پہن لینا احترام ہے۔ اُن کے یہاں ٹوپی اُتار دینا احترام ہے۔ یہ مسئلہ قوموں کا ہے۔ آج بھی آپ دیکھ لیجیے بعض مسلمان معاشرہ ہیں جہاں مسجدوں کے اندر آپ کھانا کھائیں، پانی پئیں، بیڑی پئیں، سگریٹ پئیں، کوئی بولنے والا نہیں ہے۔ بعض مسلمان معاشروں میں اگر مسجد میں کوئی مسلمان سگریٹ کو ہاتھ لگا دے تو شاید واجب القتل ہو جائے۔ یہ قانونِ شریعت نہیں ہے، یہ قوموں کے اپنے اصول ہیں، اپنے طریقے ہیں۔ ہر جگہ تعظیم اور احترام کا ایک طریقہ پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ احترام ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں وہ احترام ہے۔

تو اصل تعظیم اور احترام قوموں کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جو بزرگ ہے اس کا احترام ہونا چاہیئے لیکن تعظیم اور احترام کے طریقوں میں اختلاف دنیا کی ساری قوموں میں پایا جاتا ہے۔

تیسرا مسئلہ، تعظیم اور احترام میں ایک اختلاف اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ احترام فقط شخصیت کا کیا جائے یا اس سے متعلقہ امور کا بھی احترام کیا جائے۔ بعض قوموں کا خیال ہے کہ یہ شخصیت محترم ہے، اس کا احترام ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے متعلق جو مسائل ہیں ان سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض قوموں کا اصول ہے کہ نہیں جس کو محترم مان لیا، جو چیز اس سے متعلق ہو جائے وہ بھی قابلِ احترام ہے۔ اور دنیا کی اکثریت، دنیا کی بیشتر قوموں میں یہی اصول پایا جاتا ہے جو محترم ہے وہ محترم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ جو چیزیں اس سے وابستہ ہو جائیں وہ بھی قابلِ احترام ہو جاتی ہیں۔ دنیائے عقل میں یہی قانون رائج ہے ورنہ گستاخی ہوگی مگر میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ایک آدمی غریب فقیر آدمی معمولی مکان میں رہنے والا، ایک آدمی رئیس دولت مند یا صاحب اقتدار قصر میں رہنے والا۔ ایک آدمی کا گذر اُس مکان کے پاس سے ہوا یا اِس مکان کے پاس سے ہوا۔ غریب نے اپنی دیوار پر لکھ رکھا ہے یہاں پیشاب کرنا منع ہے مگر اس کے بعد بھی جب ان کو کوئی جگہ نہ ملی تو غریب کے گھر کی دیوار ہی پسند آئی۔ لیکن جب کسی رئیس کے محل کے پاس سے گذرے، کسی بادشاہ، کسی وزیر، کسی

صاحبِ اقتدار کے قصر کے پاس سے گذرے تو چاہے حبس بول میں مر جائیں مگر یہ سوچ نہیں سکتے کہ اس کی دیوار کے قریب کھڑے ہو کر پیشاب کریں گے۔ بھئی دیوار تو دیوار ہے۔ وہی اینٹا وہی چونا۔ وہی گارا جو یہاں استعمال ہوا ہے وہی وہاں استعمال ہوا ہے۔ فرق کیا پیدا ہو گیا کہ غریب کی دیوار کے ساتھ وہ برتاؤ اور رئیس کی دیوار کے ساتھ یہ برتاؤ۔ آپ سوچ نہیں رہے ہیں۔ یہ فلاں صاحب کا قصر ہے۔ یہ فلاں کا محل ہے تو جن صاحب کا محل ہے وہ قابلِ احترام ہیں۔ محل سے کیا تعلق ہے۔ جن صاحب کا قصر ہے وہ قابلِ احترام ہیں دیوار سے کیا تعلق ہے ۔ کہا نہیں تو جس محل میں وہ رہیں گے وہ بھی قابلِ احترام ہو گا۔ جس قصر میں وہ رہیں گے وہ قصر بھی قابلِ احترام ہو گا۔ یہ دنیا کی ساری قوموں کا مانا ہوا عقیدہ ہے۔ کسی مصلحت سے انسان انکار کر دے یہ ہو سکتا ہے لیکن انسان کو اس کے حالات پر چھوڑ دیا جائے تو طریقۂ کار یہی ہے کہ اگر وہ محترم ہیں تو جو ان سے وابستہ ہے وہ بھی قابلِ احترام ہو گا۔ میری گاڑی کو دیکھنے کوئی نہیں آتا ہے۔ میں نے بھی پیسہ لگا کے خریدا ہے۔ لیکن کسی بڑے آدمی کی گاڑی کھڑی ہو جائے تو قریب سے جانے کی ہمت نہیں کرتے ہیں۔ بھئی بڑا آدمی محترم ہوتا ہے گاڑی محترم نہیں ہوتی ہے۔ گاڑی تو کارخانے سے نکلی ہے۔ اگر وہ نہ خریدتے تو شاید میں ہی خرید لیتا۔ کہا مگر آپ خرید لیتے تو شاید ہم اس کا احترام نہ کرتے۔ مگر چونکہ انھوں نے خرید لیا ہے اس لیے محترم ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ محترم نہیں ہیں وہ محترم ہیں۔ تو محترم کا گھر بھی محترم جس میں برابر رہتے ہیں۔ اور محترم آدمی کی وہ گاڑی بھی محترم ہے جس میں کبھی بیٹھتے ہیں، کبھی اُتر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کا رابطہ ہے مگر محترم ہے۔ حد یہ ہے کہ زندہ رہیں تو جس گھر میں رہیں وہ گھر محترم ہے اور مر گئے تو مرنے کے بعد بھی احترام کو قوموں نے نظر انداز نہیں کیا جہاں دفن ہو گئے وہ مقبرہ محترم ہو گیا۔ وہ جگہ محترم ہو گئی۔ سارے عالم عقل کے یہی فیصلے ہیں تو اس کے معنی کیا ہوئے کہ اُمّتِ اسلامیہ بھی ان قوانین پر عمل کرنے والی ہوتی تو پروردگار کو الگ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ نجات ان کے لیے ہے جو نبیؐ پر ایمان لائیں اور نبیؐ کا احترام کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سرکارؐ کا کوئی خاص احترام مقصود

ہے کہ جس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ پروردگار چاہتا ہے کہ میرے پیغمبرؐ کا احترام دنیا کے سارے بڑے انسانوں سے زیادہ کیا جائے۔ اس لیے کہا تمھارا ایمان کامل نہیں ہوگا تم نجات کے حقدار نہیں ہوگے جب تک اس پیغمبرؐ کا احترام نہیں کروگے۔ میں ان تذکروں میں آپ کا زیادہ وقت نہیں صرف کر سکتا ورنہ اصل بات رہ جائے گی۔

ہمارے یہاں احترام کی بھی قسمیں ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں کسی مقام پر گیا ذرا مجھے بھی یہ خیال ہے کہ اگر میں چپّل اُتار کر چلا گیا تو پامال ہو جائے گی لیکن صرف اس لیے اُتار دیا کہ کیا فرق پڑتا ہے۔ بالآخر میرے بھی پیر ہی اس پر رہتے ہیں۔ کوئی آدمی چپل جب پہنتا ہے تو پیر ہی اس پر رہتے ہیں کوئی سر تو رہتا نہیں ہے تو میں نے بھی اس پر پیر ہی رکھا ہے۔ اگر مومنین کے پیر اس پر پڑیں گے تو پیر ہی پڑیں گے کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی اور اگر یہ خیال ہے کہ خراب ہو جائے گی، میلی ہو جائے گی، پُرانی ہو جائے گی تو جس خدا نے اتنا دیا ہے دوبارہ خرید دے گا۔ مگر ایک مردِ مومن کو خیال پیدا ہو گیا اور فوراً پلٹ کے انھوں نے چپّل کو اُٹھا کے کسی معقول جگہ پر رکھ دیا۔ میں نے کہا بھائی آپ کیوں زحمت کر رہے ہیں؟ کہنے لگے مولانا یہ آپ کی چپّل ہے۔ حالانکہ میری چپل نہیں ہے یہ کارخانے کی چپّل ہے مگر فقط تھوڑی دیر کے لیے جو مجھ سے رابطہ پیدا ہو گیا کہ مجھ جیسے غریب فقیر آدمی نے اس پر پیر رکھ دیئے تو اب اس کا اتنا احترام ہو گیا کہ بیچارے مردِ مومن اس کو رکھنے کی جگہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ یہ ساری شریف قوموں کے طریقے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مکان محترم تھا۔ گاڑی محترم تھی۔ وہ خود بھی ایک قیمت رکھتی تھی مگر اس کی تو کوئی قیمت بھی نہیں ہے مگر چونکہ آپ کے پیروں میں ہے یا لفظیں بدل دوں۔ چونکہ آپ کے قدموں میں ہے لہٰذا اس کا احترام اتنا زیادہ ہو گیا۔ اور میں شاید بات کو نہ سمجھ سکتا یا اپنے بچّوں کو نہ سمجھا سکتا۔ یہ بات تو اس دن سمجھ میں آئی جب جنگ صفین سے واپسی پر مولائے کائناتؑ ایک مقام پر ٹھہر کر اپنی ٹوٹی ہوئی جوتیوں کی خود اصلاح کر رہے تھے اور ابن عباس نے دیکھ کر کہا مولاؑ! اب یہ جوتیاں بہت خستہ حال ہو گئی ہیں، بہت بوسیدہ ہو گئی ہیں اب ان کو پھینک دیجیے۔ فرمایا یہ بتاؤ کہ اس کی بازار میں قیمت کیا ہے؟ شاید ابن عباس یہ سمجھے کہ اس کو بیچ کے مولاؑ دوسری

خریدنا چاہتے ہیں۔ عرض کی "لَیْسَ لَهَا قِیْمَةٌ"، اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ بازار میں کوئی لے جائے گا تو اس کو کوئی نہ خریدے گا۔ اس لیے کہ پرانی بوسیدہ ٹوٹی ہوئی اسے کون خریدے گا۔

عجب فقرہ مولائے کائنات نے ارشاد فرمایا اور شاید یہی مصلحت رہی ہوگی پروردگار کی۔ اور ابن عباس اسی اعلان کی حقیقت کی طرف جا رہے ہوں گے۔ کہا ابن عباس اگر ان جوتیوں کی کوئی قیمت نہیں ہے تو یہ یاد رکھو کہ تمھارے تخت حکومت سے علیؑ کی نگاہ میں یہ جوتیاں زیادہ قیمتی ہیں۔ اب دنیا کو علیؑ کی عظمت کا اندازہ ہوا کہ جس تخت حکومت، تخت اقتدار کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہو میری نگاہ میں اس کی اتنی قیمت بھی نہیں ہے جتنی قیمت نعلین کی ہے۔ اِن جوتیوں کی ہے۔ یہ جوتیاں محترم ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ علیؑ کے قدموں میں آگئی ہیں۔ تخت حکومت کی کوئی قیمت نہیں ہے اور کسی کہنے والے نے۔ بڑی اچھی بات کہی ہے کہ یہ جوتیاں تخت حکومت سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اس لیے کہ ان جوتیوں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ سوائے حق کے کسی کے قدم دیکھے نہیں ہیں۔ تو اب معلوم ہوا کہ ان کی عظمت کیا ہے اور شاید اسی لیے جب حضورؐ چلے تھے تو آواز آئی تھی کہ پیغمبرؐ مع نعلین کے چلے آؤ۔ تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ سب زمین پر رہنے کے قابل ہیں اور یہ یہاں تک آنے کے لائق ہیں۔ جو تم سے الگ ہو جائے وہ وہاں رہے گا اور جو تمھارے قدموں سے وابستہ ہو جائے وہ اتنا بلند ہو سکتا ہے۔

تو شخصیت بھی محترم ہوتی ہے اور شخصیت سے متعلق چیزوں کا بھی احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اُن سے رابطہ پیدا ہو گیا ہے، ان سے تعلق پیدا ہو گیا ہے ورنہ شاید ذاتی طور پر اس کی کوئی اہمیت اور کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ مگر اس رابطہ نے، اس تعلق نے اسے اہم بنا دیا ہے، اسے قابلِ احترام بنا دیا ہے۔ آج بھی آپ جانتے ہیں کہ کتنے مقامات ایسے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کی نگاہ میں کتنے محترم ہیں صرف اس لیے کہ ان کا سرکارِ دو عالمؐ سے کوئی رابطہ ہے۔ لاہور کی مسجد میں چلے جائیے یہ کیا ہے یہ سرکارؐ کا جُبّہ ہے۔ ارے کپڑا ہی تو ہے یعنی حیرت کی بات ہے اس دور میں جب کہ سرکارؐ کا احترام

سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ جہاں کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہم ہی جیسے انسان ہیں وہاں پیغمبرؐ کا احترام سمجھ میں نہیں آرہا ہے جُبّہ کا احترام سمجھ میں آرہا ہے۔ کشمیر میں چلے جائیے موئے مبارک۔ یہ بال سرکار دو عالمؐ کا ہے اس کا احترام ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ حضورؐ سے تعلق ہے۔ جُبّہ باہر کی چیز ہے۔ بال بہرحال جسم کا ایک حصّہ ہے مگر یہ بھی ایک تعلق رکھتا ہے۔ وہ بھی ایک رابطہ رکھتا ہے۔ یہ بھی قابلِ احترام ہے وہ بھی قابلِ احترام ہے۔ اب یہ تو مقدر کی بات ہے کہ جو جُبّہ پہن لیا وہ محترم ہوگیا۔ جو دل کے ٹکڑے ہیں وہ قابلِ احترام نہ ہو سکے۔ جو بال بدن سے الگ ہو گئے وہ قابلِ احترام ہو گئے۔ وہ آلؑ جو اجزائے پیغمبرؐ ہیں وہ قابلِ احترام نہ ہو سکے۔ اب چونکہ دنیا میں ایسے اختلافات کے امکانات تھے لہٰذا مالک کائنات نے اپنے حبیب کے احترام کے اصول خود معین کیے۔

اس پوری تمہید کو آپ ذہن میں رکھیں اور اب نتیجہ کو پہچانیں۔ اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کے احترام کے لیے خود اصول بنا دیئے ہیں تاکہ یہ اختلاف قوموں کا اختلاف نہ ہو جائے کہ فلاں آدمی یوں احترام کرے گا اور فلاں آدمی یوں احترام کرے گا۔ ورنہ اگر مسئلہ کو قوموں کے حوالے کر دیا گیا تو جیسے دنیا میں اختلافات چل رہے ہیں ویسے ہی اسلام میں بھی اختلاف ہو جائے گا۔ ہر آدمی نبیؐ کے ساتھ جو برتاؤ چاہے گا کرے گا اور کہے گا کہ ہمارے یہاں ایسا ہی احترام ہوتا ہے۔ پروردگار نے کہا۔ نہیں۔ یہ تمھارا پیغمبرؐ ہوتا تو احترام تم طے کرتے۔ یہ ہمارا پیغمبرؐ ہے اسے ہم نے محترم بنایا ہے تو ہم بتائیں گے کہ اس کا احترام کیسے ہوتا ہے۔ ساری باتیں گذارش نہیں کروں گا۔ اللہ نے احترام پیغمبرؐ کے چھ۶ طریقے بتائے ہیں، انھیں آپ جلدی جلدی سُن لیں آیتیں میں پڑھوں گا معنی آپ پہلے سے جانتے ہیں۔ پہلا طریقہ احترام پیغمبرؐ۔ ایمان والو! "اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ" اللہ و رسولؐ تمھیں کسی بات کی دعوت دیں تو فوراً لبیک کہو۔ اب یہ نہ سوچو کہ ٹھیک کہہ رہے ہیں یا غلط کہہ رہے ہیں۔ کہاں بُلا رہے ہیں۔ کیوں بُلا رہے ہیں۔ یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ یہ رسولؐ ہے تقاضائے احترام یہ ہے کہ جب

بُلائے تو فوراً لبیک کہہ کے آؤ۔ یہ نہ سوچو کیا ہوگا "لما یحییکم" وہ بُلاتے ہی ہیں اس کام کے لیے جس میں زندگی ہوتی ہے۔ یہ مرنے کے لیے نہیں بلاتے ہیں۔ یہ موت دینے کے لیے نہیں بُلاتے ہیں۔ یہ زندگی کے واسطے بُلاتے ہیں۔ تو ان کا پہلا احترام یہ ہے کہ جب بُلائیں تو فوراً لبیک کہو یہ نبوت کے احترام کی ایک قسم ہے۔

دوسری قسم پیغمبرؐ کے احترام کی قرآن مجید نے خود بیان کیا "یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" ایمان والو! خبردار اللہ و رسولؐ سے آگے نہ بڑھ جانا۔ خیر اللہ سے آگے کیا بڑھ جائیں گے۔ شاید مادی اعتبار سے یہی ہو سکتا ہے کہ اگر حضورؐ ساتھ چل رہے ہیں اور کوئی آدمی آگے بڑھ جائے تو یہ کہا جائے کہ یہ حضورؐ سے آگے نکل گئے۔ پروردگار نے کہا کہ خبردار اس کا خیال رکھنا اور اسی لیے ہمارے یہاں بھی آج فقہی اعتبار سے یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان قبرِ پیغمبرؐ کے برابر کھڑے ہو کے نماز پڑھنا چاہے تو جب تک وہ قبرِ پیغمبرؐ سے پیچھے ہے اس وقت تک کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر قبرِ پیغمبرؐ سے آگے کھڑا ہو جائے تو اس کی نماز نہ ہو سکے گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ نے رسولؐ سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اور اگر ہم نے سمجھ لیا کہ مر گئے تو رسولؐ نہیں رہ گئے۔ اگر ہمارا خیال یہ ہو گیا کہ دنیا سے چلے گئے تو اب رسولؐ نہیں رہ گئے۔ یہ احترام تو رسولؐ کا تھا تو شاید یہ نماز صحیح بھی نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ وہ زندہ رہیں تب بھی رسولؐ ہیں اور اگر دنیا سے چلے جائیں تو بھی ان کی رسالت کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ ان کی رسالت کا سلسلہ تمام نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا جو احترام حیاتِ پیغمبرؐ میں تھا وہی احترام پیغمبرؐ کے انتقال کے بعد بھی برقرار ہے۔ مسلمان کے لیے احترامِ پیغمبرؐ یہ ہے کہ مسلمان پیغمبرؐ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

تیسرا احترام "یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ" ایمان والو! خبردار تمہاری آواز نبیؐ کی آواز پر بلند نہ ہونے پائے۔ یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ سرکار اگر کہیں بیٹھ جائیں تو وہاں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر حضورؐ کہیں تشریف فرما ہوں تو مسلمان لاؤڈ اسپیکر پر بات

نہیں کر سکتے ہیں اس لیے کہ ان کی آواز رسولؐ کی آواز سے بلند ہو جائے گی نہیں۔ آواز بلند کرنے کے معنی آپ جانتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی پر جب اپنی آواز بلند کرنا چاہتا ہے تو اس کے معنی خالی آواز کا والیوم (VOLUME) بڑھا دینا نہیں ہے۔ اپنی بات کو دوسرے کی بات سے آگے بڑھانا ہے۔ لہٰذا خبردار نہ نبیؐ کی آواز پر آواز بلند ہونے پائے اور نہ نبیؐ کی بات پر اپنی بات کو بلند تر بنانے کی فکر کرنا۔ یہ ایک احترام ہے۔ اس کے بعد خالی یہی نہیں کہ حضورؐ کی آواز سے آواز بلند نہ ہونے پائے بلکہ حضورؐ کے سامنے بلند آواز سے بات کرنے کی اجازت بھی نہیں ہے "کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ" جیسے آپس میں بات کرتے ہو تو بلند آواز سے، اونچی آواز سے بولتے ہو۔ لیکن اگر پیغمبرؐ کے سامنے بات کرنا ہو تو چاہے تمھاری آواز پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہ ہو لیکن پھر بھی اونچی آواز سے بولنا خلاف احترام پیغمبرؐ ہے۔

آپ احترام محسوس کر رہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نبیؐ کس آواز سے بول رہے ہیں اور کس کی آواز ان سے بلند ہو گئی یا بلند نہیں ہوئی۔ نہیں۔ حضورؐ کے سامنے بیٹھے ہیں تو آہستہ بولئے۔ شرافت سے بات کیجئے۔ پیغمبرؐ کے سامنے آپ کی آواز بلند نہ ہو جائے اس لیے کہ آپس میں کبھی اونچی آواز سے بولتے ہیں کبھی آہستہ بولتے ہیں پیغمبرؐ کے سامنے یہ اختیار کسی مسلمان کو نہیں دیا گیا ہے۔ اچھا اگر فرض کیجئے کہ غلطی ہو گئی کہ ایک مسلمان نے پیغمبرؐ کے سامنے بلند آواز سے بات کی تو آپس میں۔ حضورؐ سے کوئی بات نہیں ہو رہی ہے۔ دو مسلمان بیٹھے ہیں باتیں کر رہے ہیں اور ذرا آواز بلند ہو گئی تو اس سے کیا ایمان پر کوئی اثر پڑ جائے گا۔ کیا یہ حضورؐ کا کافر ہو گیا۔ حضورؐ کو نہیں مانتا ہے۔ کیا حضورؐ کی عظمت میں کوئی فرق پیدا ہو گیا۔ کیوں۔ کیا ہوا؟ اگر آواز بلند ہی ہو گئی۔ اگر اونچی آواز سے باتیں کرنے لگا تو کیا قیامت آگئی۔ سورۂ حجرات پڑھئے۔ سورۂ حجرات اعلان کر رہا ہے نبیؐ کی آواز پر آواز بلند نہ ہونے پائے اور نبیؐ کے سامنے ویسے اونچی آواز سے نہ بولنا جیسے آپس میں باتیں کرتے ہو۔ خدایا اگر یہ ہو جائے تو کیا ہو گا۔ کہا "اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ" ہوشیار رہو۔ اگر نبیؐ کے سامنے تمھاری آواز بلند ہو گئی تو تمھارے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔

خدا جانتا ہے کائنات میں کسی شخصیت کے واسطے یہ احترام نہیں رکھا گیا ہے جو احترام سرکارِ دو عالمؐ کا ہے۔ لیکن شاید آپ متوجہ نہیں اس لفظ کے معنی کی طرف۔ پروردگار نے کیا کہا۔ اگر نبیؐ کی آواز پر تم نے اپنی آواز کو بلند کیا یا نبیؐ کے سامنے اونچی آواز سے آپس میں باتیں کرنے لگے تو نتیجہ کیا ہوگا۔ تمھیں خیال بھی نہ پیدا ہوگا اور تمھارے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ سوچیے بظاہر خطا کتنی چھوٹی ہے اور سزا کتنی بڑی ہے۔ نہیں پھر توجہ کریں میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ بظاہر خطا کتنی چھوٹی ہے خالی آواز اونچی ہوگئی ہے۔ نہ کوئی مار پیٹ ہے نہ کوئی توہین ہے نہ کوئی بات ہے، مگر سارے اعمال برباد۔ ایک آواز کیا بلند ہوگئی اب نہ نمازوں کی کوئی قیمت رہ گئی، نہ روزوں کی کوئی قیمت رہ گئی، نہ حج کی کوئی قیمت رہ گئی، نہ زکوٰۃ کی کوئی حیثیت رہ گئی، نہ تلاوت کی کوئی حیثیت رہ گئی سب بیکار ہوگیا صرف اس لیے کہ حضورؐ کے سامنے آواز بلند کیوں ہوئی۔ نبیؐ کی آواز پر تمھاری آواز کیوں بلند ہوئی۔ تمھارے سارے اعمال برباد ہو گئے۔

خدایا! میں فریاد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی کوئی مدت معین ہے۔ ایک سال ہم نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب کیا اور ایک دن حضورؐ کی آواز پر آواز بلند ہوگئی تو کیا ایک سال کے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے؟

خدا نے کہا، بے شک۔

میں نے کہا اگر دو سال اعمال کیے؟

کہا تم میرے الفاظ کے معنی کیوں نہیں سمجھتے۔ اگر تم نے نبیؐ کے سامنے اونچی آواز سے بات کی۔ نبیؐ کی آواز پر آواز بلند کی تو میں سب برباد کر دوں گا۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ ایک سال کا عمل ہے یا کہ دو سال کا ہے یا دس سال کا عمل ہے یا پندرہ سال کا ہے یا بیس سال ہے یا اکیس سال کا ہے یا بائیس سال کا ہے یا تیئس سال کا ہے۔ جتنے عمل کیے ہوں گے اگر ایک دن آواز بلند ہوگئی تو سب بیکار ہے۔

سوچو عزیزو! جب آواز پر آواز بلند ہونے کی یہ سزا ہے تو اگر کوئی ایسی بات

کو نبیؐ کی بات سے اونچا بنانا چاہتا ہو تو قرآن کی نگاہ میں اس کے عمل کی کیا قدر و قیمت رہ جائے گی۔

وہ چاہے اپنا ہی جیسا بشر ہو یا اپنے سے بھی کچھ کم درجہ کا بشر ہو۔ جیسا بھی ہو لیکن اس کا احترام یہی ہے کہ سب کے اعمال کا دار و مدار اسی کے احترام پر ہے۔ سب کے ایمان کا دار و مدار اسی کے احترام پر ہے۔ اگر اس کے احترام میں ذرہ برابر فرق آگیا تو تمہارے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہ رہ جائے گی۔ اب اندازہ ہوا کہ کہاں وہ اُمّت، کہاں وہ دُنیا، کہاں وہ عالم اسلام، جس کے سارے اعمال کا دار و مدار ایک پیغمبرؐ کے احترام پر ہے۔ اگر یہ احترام قائم ہے تو سارے اعمال قیمتی ہیں۔ سارے اعمال کی جزا ہے۔ سارے اعمال کا انعام ہے۔ لیکن اگر یہ احترام برقرار نہ رہا تو کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ابھی تو کچھ کہنے کا ذکر بھی نہیں آیا۔ اب اس کے بعد میں نہ کہوں گا آپ اہل نظر ہیں خود سوچیے گا اور جو میں کہنا چاہتا ہوں اسے سمجھئے گا۔ ہم نے حضورؐ کو کچھ نہیں کہا خالی حضورؐ کے سامنے اپنی آواز بلند کر دی حضورؐ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی۔ حضورؐ کے بارے میں کچھ نہیں کہا مگر خدا کہتا ہے ہم تمہارے اعمال کو برباد کر دیں گے۔ ہمارے نبیؐ کے احترام میں فرق آگیا ہے تو اگر حضورؐ ہی کے بارے میں کوئی فیصلہ ہم فرما دیں تو سوچیے پھر اس کے بعد ہمارے عمل کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ ہمارے عمل کی کیا اہمیت رہ جائے گی۔ اور ہمارا ایمان کس قابل رہ جائے گا۔

ایک اور احترام جس کی طرف کل میں نے اشارہ کیا تھا آج اس کی مختصر سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو۔ رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" اگر آپس میں کسی بات پر اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے پلٹا دو خدا اور رسولؐ کی طرف۔ فیصلہ خدا کرے گا یا رسول کرے گا۔ اگر تم نے خود فیصلہ کیا تو نبوت کے احترام میں فرق آگیا۔ توجہ کرو عزیزو! احترام پیغمبرؐ کیا ہے۔ اختلاف تمہارے درمیان ہوا ہے کہ یہ باغ آپ کا ہے

یا ہمارا ہے۔ یہ گھر آپ کا ہے یا ہمارا ہے۔ اختلاف ہمارے آپ کے درمیان ہوا ہے۔ لیکن ہم اپنے معاملات کو بھی خود طے نہیں کر سکتے۔ فیصلہ ہو گا پیغمبرؐ کے ذریعہ۔ اگر پیغمبرؐ کی طرف پلٹا دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا ایمان سلامت ہے۔ ہمارا اسلام سلامت ہے اور اگر پیغمبرؐ کو درمیان سے ہٹا دیا اور ہم خود طے کرنے بیٹھ گئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا اسلام و ایمان سلامت نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پیغمبرؐ کا احترام نہیں ہوا اور شاید پروردگار عالم نے اگر پیغمبرؐ ہی کا نام لیا ہوتا کہ جب کوئی اختلاف پیدا ہو تو نبیؐ کی طرف پلٹا دو۔ تو پلٹانے کے معنی بھی سمجھ میں نہ آتے۔

عزیزو! متوجہ رہیں یہ بڑا دقیق مسئلہ ہے اور اسی پر میرے مستقبل کے بیان کا دارومدار ہے۔ اگر آپ نے اس کو محسوس کر لیا تو انشاءاللہ بہت لطف آئے گا اور جو باتیں کبھی کبھی سطحی انداز سے کہی جاتی ہیں میں اس بات کو استدلالی انداز سے آپ کے سامنے گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر پروردگار عالم نے یہ کہا ہوتا کہ جب تم میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اختلاف کو نبیؐ کی طرف پلٹا دینا۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ حضورؐ کی ذات کو فیصلہ کرنا ہے اور اس پورے قانون کا تعلق فقط ان لوگوں سے ہوتا جو مکہ مدینہ کے رہنے والے تھے اس لیے کہ وہ تو اپنے جھگڑے کو حضورؐ کے یہاں پیش کر سکتے تھے مگر اُسی دَور میں ایک آدمی جو دنیا کے کسی اور حصّہ کا رہنے والا ہے جہاں تک اسلام پہونچ گیا ہے اگر وہاں دو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے اور وہ اپنے مسئلہ کو لے کر پیغمبرؐ کے پاس آنا چاہیں تو شاید جب تک یہ پہونچیں گے مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ ایک آدمی ہزار میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔ مسلمان تو ہو گیا ہے اور دو مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور دونوں چلے ہزار میل سرکار دو عالمؐ سے فیصلہ کرانے کے لیے۔ اس لیے کہ خدا نے کہہ دیا ہے جب کوئی اختلاف پیدا ہو تو نبیؐ کی طرف پلٹاؤ۔ دس درہم کا فیصلہ کرانے کے لیے ہزار میل کا فاصلہ۔ پھر بھی اُس دَور والے سے تو کہا بھی جا سکتا تھا کہ جاؤ نبیؐ کے پاس لیکن اگر آج ہم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس قانون سے آزاد ہو گئے اس لیے کہ حضورؐ ہیں ہی نہیں کہ ہم حضورؐ کی طرف پلٹائیں ...

فیصلہ کریں گے۔ یہ ساری پریشانی، یہ ساری مجبوری، یہ ساری بے کسی، مکہ مدینہ کے اُس دَور کے مسلمانوں کے لیے تھی۔ آج کے مسلمان بالکل آزاد ہیں۔ نہ رسولؐ ہیں، نہ رسولؐ کی طرف پلٹانے کا کوئی امکان ہے۔

پروردگار نے کہا کہ اپنی طرف سے میری لفظوں کے معنی نہ بیان کرنا جتنا تم سمجھ لیتے ہو۔ اس سے زیادہ تم کو میں سمجھتا ہوں۔ لہٰذا اختلاف میں رسولؐ کی طرف اور خدا کی طرف پلٹانا ہے۔ تو پہلے اپنا نام لیا، اس کے بعد نبیؐ کا نام لیا کہ اگر میری طرف پلٹانا ہوگا تو کیا میری بارگاہ میں لے کر آؤ گے؟ میں نے کوئی دربار سجایا ہے؟ میں نے کوئی بارگاہ سجائی ہے؟ میں نے کوئی دارالقضاوۃ کھولا ہے؟ میں نے کوئی محکمہ بنایا ہے کہ یہاں میں بیٹھا ہوں اور فیصلہ کرنے کے لیے تم آؤ میں فیصلہ کروں گا؟۔ اگر میری طرف پلٹانے کے معنی سمجھ گئے تو نبیؐ کی طرف پلٹانے کے معنی خود ہی سمجھ میں آجائیں گے۔

میرے پاس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ نہ تم میرے پاس آؤ گے نہ میں تمھارے پاس آؤں گا۔ تم جسمانیات کی دنیا کے رہنے والے، میں اس سے بہت بالاتر۔ تم مکانوں کے قیدی میں لامکاں۔ تمھارا عالم کہیں اور میں کچھ اور۔ تو نہ میں تمھارے پاس آؤں گا فیصلہ کرنے کے لیے، نہ تم میرے پاس آؤ گے فیصلہ کرانے کے لیے۔ میں نے فیصلے خود پہلے سے کر دئیے ہیں۔ یہ ایک سو چودہ سوروں میں میں نے کیا کیا ہے؟ زندگی کے ہر مسئلہ کا فیصلہ میں نے نازل کر دیا ہے۔ اب میری طرف پلٹانے کے معنی یہ ہیں کہ جب کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو تم نہ طے کرنا۔ میری کتاب پڑھو۔ میرا قرآن پڑھو۔ تو جیسے میں تمھارے سامنے نہ آیا اور جو میرے فیصلے موجود ہیں قرآن کی شکل میں ان کو سند بنا دیا کہ اگر انھیں نظرانداز کر دیا اور خود تم نے کوئی فیصلہ کیا تو تمھارا ایمان مجھ پر نہیں ہے۔ اسی طرح نبی ممکن ہے۔

خدایا تو بتا دے کہ اگر ان سے محبت کریں تو مجرم تو نہ ہو جائیں گے۔ کہا "قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا" ہم نے ان کی محبت کو اجر رسالت بنا دیا ہے۔

خدایا! تو بتا دے کہ تیری نگاہ میں سچے ہیں یا نہیں؟

کہا کہ جھوٹوں پر لعنت کرنے کا وقت آیا تو ہم نے کسی اور کو نہیں بھیجا ہے۔

ہم نہ کسی تاریخ کے بندے ہیں نہ کسی روایت کے بندے ہیں۔ نہ کسی راوی کے بندے ہیں۔ خدا کے بندے ہیں۔ خدا نے کہا جب کوئی اختلاف پیدا ہو جائے ہم سے پوچھو۔ ہم فیصلہ کریں گے۔ ہم نے پوچھا علم کے بارے میں۔ پروردگار نے بتایا۔ ہم نے پوچھا طہارت کے بارے میں۔ خدا نے فیصلہ کیا۔ ہم نے پوچھا صداقت کے بارے میں۔ خدا نے فیصلہ کیا۔ ہم نے پوچھا محبّت کے بارے میں۔ خدا نے فیصلہ کیا۔ پروردگار! ان کے کرم کے بارے میں تیرا کیا فیصلہ ہے؟ کہا "یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا" یہ وہ ہیں جو اپنی ضرورت کے باجود ہماری محبّت میں مسکین و یتیم و اسیر کو کھلا دیتے ہیں۔ پروردگار! ان کا کرم تو معلوم ہو گیا، ان کی سخاوت معلوم ہو گئی باقی کمالات کے بارے میں؟ پروردگار نے کہا اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ کہا خدایا! ان کے جہاد کے بارے میں کیا ارشاد ہے، ہم ان کے بارے میں کیا عقیدہ قائم کریں؟ کہا، "یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" یہ وہ ہیں جو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ اور تم کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا یہ تو میں اعلانات قرآن کے ذریعہ کر رہا تھا۔ اس کے بعد جب کوئی جہاد کا قدر دان نہ پیدا ہوا۔ کوئی تھا ہی نہیں جو شانِ جہاد دیکھتا۔ کوئی تھا ہی نہیں جو جہاد کی قدر دانی کرتا اس لیے کہ تمھارے لیے جہاد کیا ہوتا تو تم نے قصیدہ پڑھا جب میری راہ میں جہاد کر رہا تھا۔ میری راہ میں دنیا سے چلا جائے مگر نبیؐ کے فیصلے کہیں جانے والے نہیں ہیں۔ جیسے میرا کلام محفوظ رہے گا ویسے ہی سنّت پیغمبرؐ محفوظ رہے گی۔ جب کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو فیصلے کے لیے دو ہی جگہیں ہیں، کوئی تیسری جگہ نہیں ہے۔ یا کتابِ خدا یا سیرتِ پیغمبرؐ۔ انہی کے ذریعہ فیصلہ ہو گا۔ ان سے ہٹ کر اگر کوئی مسلمان فیصلہ کرنا چاہے گا تو یہ فیصلہ خود اس بات کی علامت ہے کہ صاحبِ ایمان نہیں ہے۔ یہ فیصلہ اس بات کی نشانی ہے کہ یہ صاحبِ ایمان نہیں ہے۔

اگر میری بات کو یہاں تک آپ نے محسوس کیا ہے تو چلیے۔ خدا نہ کردہ آج

میرا کسی مسلمان سے اختلاف ہو گیا۔ میں نے کہا اُمّت کی قیادت علیؑ کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے تھی۔ ایک نے کہا نہیں علیؑ کے ہاتھ میں نہیں ہونی چاہیئے تھی میرے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ اختلاف ہو گیا یا نہیں ہو گیا۔ اب خدا کہتا ہے کہ اگر صاحبِ ایمان ہو تو فیصلہ میں کروں گا۔ چلئے فیصلہ خدا سے کرائیں۔ تاریخ سے کیا فیصلہ کرانا ہے۔ راویوں سے کیا فیصلہ کرانا ہے۔ خدایا تو بتا دے کہ علیؑ کے بارے میں تو نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

مالک نے آواز دی۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو ؟

خدایا تو بتا دے کہ علیؑ کا علم کیسا ہے ؟

کہا "کُلَّ شَیْئٍ اَحْصَیْنَاہُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ"

ہم تو خدائی فیصلہ چاہتے ہیں۔ پروردگار تو بتا دے کہ تو نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ ہم علیؑ کا علم پوچھنا چاہتے ہیں، باقی سب کا علم تو یوں ہی معلوم ہو جائے گا۔ تو بتا دے تو نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے ؟

کہا ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں جمع کر دیا ہے۔ یہاں جہالت کا گذر نہیں ہے۔

خدایا تو بتا دے کہ تو نے علیؑ کی طہارت کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے ؟

کہا "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ" ہم نے انھیں حقِ طہارت عنایت کیا۔ لڑ رہا تھا تو میں نے انتظام کیا جاؤ جا کر اعلان کرو "لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَارِ" یہ بھی خدائی فیصلہ ہے۔

تو جب کوئی اختلاف پیدا ہو جائے۔ میں دوسرا رُخ نہیں گذارش کروں گا۔ میں تو خالی اپنی بات کہنا چاہتا ہوں۔ دوسروں سے میرا کیا تعلق ہے۔ میں تو خدا سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خدایا! علیؑ کے بارے میں تیرا فیصلہ کیا ہے۔ باقی کے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا وہ آپ جا کے تلاش کریں گے۔

اس کے بعد پروردگار نے کہا اگر صاحبِ ایمان ہو تو میری طرف پلٹاؤ، اور نبیؐ کی طرف پلٹاؤ۔ میں نے یہ سارے مسائل حضورؐ کی طرف پلٹا دیئے۔

میں نے کہا حضورؐ، پروردگار کا فیصلہ تو میں نے سُن لیا، لیکن چوں کہ خدا نے کہا

اِدھر بھی لاؤ اُدھر بھی لے جاؤ۔ تو آپ کی بارگاہ میں لے کر آئے ہیں۔ حضورؐ آپ فیصلہ سُنائیں۔ علیؑ کے علم کے بارے میں آپ کا فیصلہ کیا ہے؟

کہا، "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا"

کہا حضورؐ علیؑ کی ذات کے بارے میں کیا فیصلہ فرماتے ہیں؟

کہا، "اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَاحِدٍ"

حضورؐ، علیؑ کی شجاعت کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟

فرمایا "لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلًا کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ"۔

خلقت کے بارے میں حضورؐ کا فیصلہ موجود ہے۔ علم کے بارے میں سرکارؐ کا فیصلہ موجود ہے۔ سخاوت کے بارے میں سرکارؐ کا فیصلہ موجود ہے۔ قضاوت کے بارے میں فرمایا "اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ"، تم میں علیؑ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ تو یہ حضورؐ کا فیصلہ ہے علیؑ کے فیصلہ کے بارے میں جو علیؑ فیصلہ کریں، علیؑ سے بہتر کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہے۔ اب میں سمجھا کہ اگر حضورؐ نہیں بھی رہ گئے اور کوئی جھگڑا پیدا ہو گیا تو اس سے فیصلہ کراؤ جس سے بہتر حضورؐ کی نگاہ میں کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں میرا فیصلہ چاہتے ہو تو میں اپنا فیصلہ سُنا کر جا رہا ہوں تاکہ تمھیں اندازہ ہو جائے کہ اگر صاحبِ ایمان ہو تو جو خدا نے فیصلہ کیا ہے وہ ماننا۔ جو میں نے فیصلہ کیا ہے وہ ماننا یہی تقاضائے ایمان باللہ ہے اور یہی تقاضائے احترام رسالت ہے۔ الحمدللہ کہ نہ ہم نے اپنے ایمان کو کسی شک سے آلودہ کیا ہے نہ حضورؐ کے احترام میں کوئی فرق پیدا ہونے دیا ہے۔ جو سرکارؐ نے فیصلہ کر دیا وہی فیصلہ کیا۔ حد یہ ہے کہ جس کے لیے اٹھ کے کھڑے ہو گئے ہم نے اسے قابلِ تعظیم مان لیا اور جس کو حضورؐ نے باہر کر دیا ہم نے کبھی اپنے گھر میں اس کو جگہ نہیں دی۔

اس لیے کہ ظاہر ہے کہ نبیؐ اور اُمّت کا رشتہ دو بھائیوں کا رشتہ نہیں ہے کہ ہمارے بھائی سے ان کا اختلاف ہے لیکن خیر ہم کو ان کے اختلاف سے کیا تعلق ہے اب ایسے بھی بھائی نہیں ہیں بہرحال نبیؐ ہیں۔ بہرحال پیغمبر ہیں۔ بہرحال خدا کے رسول ہیں۔ ان کے

معاملات ہمارے معاملات سے اجنبی نہیں ہیں۔ جو ان کا دوست ہے وہ یقیناً ہمارا دوست ہے۔ جو ان کا دشمن ہے وہ یقیناً ہمارا دشمن ہے۔ ان کی نگاہ میں اگر قابلِ احترام ہے تو ہماری نگاہ میں قابلِ احترام ہے۔ ان کی نگاہ میں اگر قابلِ احترام نہیں ہے تو ہماری نگاہ میں کوئی احترام نہیں ہے۔ چاہے ساری دنیا اسے محترم قرار دے۔ اس لیے کہ ہم پر پیغمبرؐ کا احترام واجب کیا گیا ہے۔ ہم پر تاریخ کا احترام واجب نہیں ہے۔ ہم پر راویوں کا احترام واجب نہیں ہے۔ ہم پر پیغمبرؐ کا احترام واجب ہے، بتائیے ان کا احترام کیسے نہ کریں جن میں سے کوئی آجائے تو اس کے لیے محفل میں کھڑے ہو جائیں۔ کوئی آجائے تو اس کے لیے سجدہ کو طول دے دیں۔ کوئی آجائے تو اسے کاندھے پر بٹھا لیں۔ ان کا احترام نہ کرکے کیا نبیؐ کے احترام کا انکار کر دیں۔

ہاں آج اگر کوئی آدمی کہے کہ ساری دنیائے اسلام کا میری شخصیت عظیمہ پر اتفاق ہو گیا ہے تو دنیائے اسلام کیا ہے پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں۔ دنیائے اسلام کیا ہے مالک کائنات کے مقابلہ میں۔ مالک کا فیصلہ بندوں کے واسطے ہے۔ سرورِ کائناتؐ کا فیصلہ اُمت کے واسطے ہے۔ نہ دنیائے اسلام کوئی شے ہے، نہ دنیائے کفر کوئی شے ہے۔ یہ دنیائے اسلام دنیائے اسلام رہے گی اگر حضورؐ کا فیصلہ مانے گی۔ ورنہ اگر حضورؐ کا فیصلہ نہ مانے تو یہ دنیائے اسلام دنیائے اسلام نہ کہی جائے گی۔

عجب مسئلہ ہمارے مولانا شبلی نے اٹھایا ہے:

"چونکہ یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے عالم اسلام میں کہ سرکار کی ہر بات وحی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم لوگوں کو بہرحال سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ حضورؐ کی ہر بات وحی ہوتی ہے یا حضورؐ کی کوئی بات ہذیان بھی ہو سکتی ہے۔

ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اس لیے کہ یہ عالمِ اسلام میں اختلافی مسئلہ ہے۔"

اللہ کیا عالم اسلام ہے جس میں پیغمبرؐ کی حیثیت اختلافی ہے۔ پیغمبرؐ کا بیان جس کے بارے میں خدا کہتا ہے "اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" (یہ جو بولتے ہیں وہی وحیِ الٰہی ہے) یہ کہتے ہیں کہ عالم اسلام میں اختلافی مسئلہ ہے۔ سنجیدگی سے غور کیجئے۔ خیر آپ غور کرتے

رہے سنجیدگی سے۔ ہم کسی کو غور کرنے سے نہیں روک سکتے۔ آپ سنجیدگی سے غور کریں کہ پیغمبرؐ کا ہر بیان وحی کے مطابق ہوتا ہے، یا معاذ اللہ کسی وجہ سے بھی وہ بہکی ہوئی بات بھی کر سکتے ہیں۔ ہم بھی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ اگر پیغمبرؐ کو کوئی بہکا ہوا کہے تو واقعی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں رہ سکتا۔

ہمارے ایمان کا، ہمارے ایقان کا تقاضا یہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ کا احترام کریں اور سرکارؐ کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے کو بھول جائیں۔ ہم کیا، ہمارے خواہشات کیا، ہمارے جذبات کیا، ہم کیا چاہتے ہیں، ہم کیا نہیں چاہتے ہیں۔ صرف یہ دیکھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں، ان کی نگاہ میں کون ہے، ان کی نگاہ میں کس کی عظمت ہے، ان کی نگاہ میں کس کا احترام ہے۔ بس جو اُن کی نگاہ میں ہے وہی سب کچھ ہے ورنہ ہماری کوئی نگاہ نہیں ہے۔ ہمارا کوئی خیال نہیں ہے۔ ہم خیالات کے مذہب کے قائل نہیں ہیں، ہم رسالت کے مذہب کے قائل ہیں۔ اور ہم نے یہ ایک اصول بنا لیا ہے روز اوّل سے کہ جس کو سرکارؐ نے محترم بنایا ہے ہم نے اسی کو محترم مانا ہے اور جس کو انھوں نے محترم بنا دیا ہم نے اسے بھی محترم مان لیا۔ اس محترم نے جسے محترم بنا دیا ہم نے اسے بھی محترم مان لیا۔ ہمارا سلسلہ احترام پیغمبرؐ سے مل رہا ہے۔ اگر حضورؐ نے علیؑ کو محترم بنایا تو علیؑ محترم ہیں۔ اگر حسینؑ کو کاندھے پر بٹھایا تو حسینؑ محترم ہیں۔ اگر حسینؑ کسی سے کہہ دیں کہ بھیّا جاؤ دیکھو فوج دشمن کیا کہہ رہی ہے۔ میں تم پر قربان تو سوچنا پڑے گا کہ یہ انسان کتنا محترم ہے۔

۹ محرّم کی عصر کا وقت تھا۔ ابن سعد نے فوجوں سے خطاب کر کے کہا بس اب وقت آگیا ہے کہ خیام حسینی پر حملہ کر دیا جائے۔ تیار ہو جاؤ اور بہترین موقع ہے کہ دن کے اُجالے میں حملہ کر دیا جائے اور حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے۔ امام حسینؑ مصلحت پروردگار سے نہیں چاہتے ہیں کہ اس وقت جنگ چھیڑی جائے۔ مشیّت الٰہی نے ایک وقت معین کر دیا ہے۔ ایک رات درمیان میں آنے والی ہے جس کو حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ عبادت الٰہی میں گذارنے والے ہیں۔ لیکن کس کو آگے

بڑھائیں۔ کون جائے جو ابن سعدؑ سے بات کرے۔ کون جائے جو شمرؑ سے بات کرے۔ کون جائے جو حسینؑ کی نمائندگی کرے۔ تاریخ کا فقرہ ہے کہ فرزند رسولؐ نے اپنے شیر کو دیکھا "ارکب بنفسی انت" عباس تم سوار ہو کر جاؤ۔ بھیّا تم پر میری جان قربان ہو۔ اللہ ایک طرف کربلا کے سارے شہید جن سے ہم آپ کہتے ہیں کہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان۔ ایک طرف تنہا عباس علمدار۔ بھیّا میں تم پر قربان۔ اس جملہ کو سُننے کے بعد عباس کے جذبات کا کیا عالم ہو گا خدا جانتا ہے۔ ہم آپ تو تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔

عباس اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ وقت کیسے آجائے کہ میں مولاؑ پر قربان ہو جاؤں تا کہ مولاؑ کے اس جملہ کا احترام رہ جائے۔ حکم تھا آقا کا آگے بڑھے۔ فوجِ دشمن سے آ کے گفتگو کی اور یہ طے ہو گیا کہ اس وقت جنگ نہیں ہو گی۔ ایک رات عبادتِ الٰہی کے لیے ہو گی۔ چنانچہ ساری رات عبادتِ الٰہی میں گذرتی رہی۔ صبح کے وقت جب فرزند رسولؐ نے لشکر کو مرتب کیا۔ مجھے تو لشکر کہتے ہوئے بھی تکلّف ہوتا ہے۔ کیا لشکر تیس ہزار سپاہی کم سے کم اُدھر میمنہ پر دس ہزار، میسرہ پر دس ہزار، قلب لشکر پر دس ہزار۔ اور اِدھر صرف بہتّر جن میں نو دس برس کے بچے بھی ہیں۔ تیرہ برس کا نابالغ بچہ بھی ہے۔ چھ مہینہ کا بچہ بھی ہے۔ جو تھوڑے سے افراد حسینؑ کے پاس ہیں، حسینؑ نے ان کو بھی تین حصّوں میں بانٹ دیا۔ یہ میمنہ زہیر کے ہاتھوں میں۔ وہ میسرہ حبیب کے ہاتھوں میں۔ قلب لشکر عباس علمدار کے ہاتھوں میں۔ اس کے بعد حسینؑ نے اپنے لشکر کا علم ویسے ہی علمدارِ کربلا کو دیا جیسے پیغمبرؐ نے اپنا عَلم عباس کے باپ کو دیا تھا۔ یہ وراثت ہے جو عباس علمدار کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ کل پیغمبرؐ کا عَلم علیؑ کے ہاتھوں میں تھا آج حسینؑ کا پرچم عباس کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ وہ پرچم ہے جس سے سارے اہلِ حرم کی ڈھارس وابستہ ہے اور یہ وہ شخصیت ہے جس سے سب کی امیدیں وابستہ ہیں۔ عباس لشکر کو مرتب کر رہے ہیں۔ جنگ کا وقت آگیا۔ جنگ کا انتظام عباس کے ہاتھوں میں ہے۔ وقت گذرتا رہا ظہر کا

ہنگام آیا۔ یہاں تک کہ نمازِ ظہر بھی تمام ہو گئی۔ اس کے بعد بنی ہاشم کی قربانی کا وقت آ گیا۔ جب بنی ہاشم قربان ہونے لگے اور ایک ایک کر کے سب راہِ خدا میں کام آ گئے تو ایک مرتبہ عباس آئے مولاؑ کے سامنے دستِ ادب جوڑ کے کھڑے ہوئے۔ کہا مولاؑ اب تو مجھے اجازت دے دیجیے۔ آقا کب تک برداشت کروں دشمنوں کے طعنے۔ اتنی لاشیں اٹھائیں۔ اتنے جنازے اٹھائے۔ مولاؑ اب تو اجازت دے دیجیے۔

عجب فقرہ حسینؑ نے کہا۔ بھیّا تمھیں کیسے اجازت دوں " اَنْتَ حَامِلُ لِوَائِیْ"، تم میرے علمبردار ہو " وَکَبْشُ کَتِیْبَتِیْ" تم میرے سردار لشکر ہو، تمھیں کیسے جانے دوں۔ عباسؑ تم تو جانتے ہو کہ جب سردار مارا جاتا ہے تو لشکر کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ عزیزو! میں تو کچھ نہ کہہ سکتا تھا مگر بات خود عباس علمدار نے کہہ دی۔ جب امام حسینؑ نے کہا کہ تم میرے لشکر کے علمبردار ہو۔ تو ایک مرتبہ عباس نے داہنے دیکھا، بائیں دیکھا۔ مولاؑ سے بہتر اپنے شیر کی اداؤں کو کون پہچانتا ہے۔ عرض کرتے ہیں آقا وہ لشکر کہاں ہے جس کا میں سردار ہوں۔ جب کوئی نہ رہ گیا سب قربان ہو گئے اب تو مجھے اجازت دے دیجیے۔ بھیّا اگر جانا چاہتے ہو تو تم تو سُن رہے ہو کہ چھوٹے چھوٹے بچّے خالی کوزے ہاتھ میں لیے ہوئے العطش العطش ہائے پیاس ہائے پیاس۔ لے بھیّا اگر ہو سکے تو بچّوں کے لیے پانی کا کوئی بندوبست کرو۔

عباس درِ خیمہ پر آئے۔ آ کے آواز دی سکینہ! بھتیجی نے چچا کی آواز سُنی دوڑ کر درِ خیمہ تک آئی۔ چچا کیسے یاد فرمایا؟ کہا بیٹی ذرا مشکیزہ تو لاؤ۔ آقا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں بچّوں کے لیے پانی کا انتظام کر دوں۔ ذرا مشکیزہ تو لاؤ۔ سکینہ مشکیزہ لے کر چلیں۔ چھوٹے چھوٹے بچّے سکینہ کے ساتھ ہیں۔ بی بی یہ مشکیزہ کہاں لے جا رہی ہو؟ کہا بچّو تمھیں نہیں معلوم ہے، میرا چچا پانی لینے کے لیے جا رہا ہے۔ بس اب تمھاری پیاس کی مدت تمام ہو رہی ہے۔ اب میرا چچا جا رہا ہے۔ بس تھوڑی دیر میں پانی آنے والا ہے۔ بچّے آ کر لگے

مولاؑ سے رخصت ہوئے۔ آگے بڑھے۔ چار ہزار کا نہر پر پہرہ۔ پہرے کو توڑا۔ فرات تک پہونچے۔ مشکیزہ کو فرات میں ڈبویا۔ مشکیزہ کو بھرا۔ لے کر چلے۔ داہنا شانہ قلم ہوگیا کوئی پرواہ نہیں۔ بایاں ہاتھ کٹ گیا کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ایک فکر ہے کہ یہ مشکیزہ بچّوں تک پہونچ جائے۔ آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ تیر مشک سکینہ پر لگا۔ جیسے ہی مشکیزہ کا پانی بہنے لگا عباسؑ نے گھوڑے کا رُخ موڑ دیا۔ اب میں خیمہ کی طرف جا کر کیا کروں گا۔ سر جُھکا کے پشتِ فرس پر بیٹھ گئے۔ ایک ظالم نے سر پر ایک گرز لگایا، علیؑ کا لال پُشتِ فرس پر سنبھل نہ سکا۔ اب جو پشتِ فرس سے خاکِ کربلا کی طرف چلے۔ کیا گذر گئی میں نے پرسوں اشارہ کیا تھا کہ ماں برابر یہ کہہ کر مرثیہ پڑھتی تھی، بیٹا عباس تجھ پر اُس وقت کیا گذری ہوگی جب ہاتھوں کے کٹنے کے بعد تو گھوڑے سے گرا ہوگا۔ گرتے گرتے مولاؑ کو آواز دی۔ حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ ایک مرتبہ کمر کو تھام کے آگے بڑھے۔ "اَلْاٰنَ اِنْکَسَرَ ظَهْرِیْ" عباس کمر ٹوٹ گئی۔ اب کوئی تدبیر سامنے نہیں ہے۔ عباس دشمن طعنے دے رہے ہیں کہ علمدار کہاں ہے۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے۔ ایک مرتبہ چلتے چلتے اُتر کے کسی چیز کو اُٹھا کے سینے سے لگالیا۔ آگے بڑھے یہاں تک کہ اس منزل پر پہونچے جہاں شیر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ آئے۔ آ کے سرہانے بیٹھے۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ روایت کہتی ہے کہ عباس نے سر ہٹا لیا۔ دوبارہ سر اُٹھا کے زانو پر رکھا شیر نے سر اُٹھا لیا۔ کہا بھیّا مجھے خیال ہے کہ میں دیر سے آیا مگر بھیّا یہ اپنا سر میرے زانو سے کیوں ہٹا رہے ہو؟ کہا مولا یہ میری مجال؟ فقط یہ سوچ رہا ہوں کہ اس وقت تو میرا سر آپ کے زانو پر ہے تھوڑی دیر کے بعد جب آپ گھوڑے سے گریں گے تو آپ کا سر کس کے زانو پر ہوگا۔ بھائی بھائی میں گفتگو ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ عباس خاموش ہوئے۔ حسینؑ نے مرثیہ شروع کر دیا۔ اے عباس جو آنکھیں تیری ہیبت سے نہ سوتی تھیں اب سوئیں گی۔ ارے بھیّا اب سیدانیاں جاگیں گی۔ انھیں سونا نصیب نہ ہوگا۔ امام حسینؑ نے وصیّت کے مطابق لاش کو فرات

کے کنارے چھوڑا۔ پرچم کو لے کر۔ اب جو بچّوں نے دیکھا کہ علم آرہا ہے۔ سارے بچّے سکینہ کے گرد جمع ہو گئے۔ بی بی آپ کا چچا آرہا ہے۔ بی بی آپ کا سقا آرہا ہے۔ جب پرچم درِ خیمہ کے قریب آیا تو بچّی نے بڑھ کے خیمہ کا پردہ اٹھا دیا۔ کیا دیکھا۔ بابا آئے چچا نہیں آئے۔ دوڑ کے قدموں میں لپٹ گئیں۔ بابا، میرا چچا کہاں ہے؟ کہا سکینہ کیا چچا کا انتظار کر رہی ہو۔ کہا بابا کیسے نہ انتظار کرتی چچا نے پانی کا وعدہ کیا تھا۔ میرا چچا بے وفا نہیں ہے۔ حسینؑ نے بچی کو کلیجہ سے لگا لیا۔ سکینہ اب چچا کا انتظار نہ کرنا تیرا چچا فرات کے کنارے شانے کٹا کے سو گیا۔ بچّی تڑپ گئی۔ چچا اگر معلوم ہوتا کہ آپ واپس نہ آئیں گے تو سکینہ مرجاتی پانی کا تقاضا نہ کرتی۔ ہائے میرا چچا۔ ہائے میرا چچا۔

سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۹

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتِمِ النَّبِیّٖنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی
اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی
اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ ۔
اَمَّا بَعْدُ!

"صاحبانِ ایمان وتقویٰ وہ ہیں جو اس رسول نبیؐ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں۔ جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی۔ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے۔ بُرائیوں سے روکتا ہے۔ طیّبات کو حلال قرار دیتا ہے۔ خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت کو اس بوجھ اور ان زنجیروں سے آزادی دلاتا ہے جن زنجیروں میں عالم انسانیت جکڑا ہوا ہے۔ پس جو لوگ اس پیغمبرؐ پر ایمان لائے۔ پیغمبرؐ کا احترام کیا، پیغمبرؐ کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو پیغمبرؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہی لوگ فلاح پانے والے اور کامیاب ہیں۔"

آیۂ کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ کلام "رسالتِ الٰہیہ" کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے نویں مرحلہ پر کچھ باتیں نصرت پیغمبرؐ سے متعلق گذارش کرنا ہیں۔

ابتدائی طور پر ایک ہلکا سا اشارہ بعض ان مطالب کی طرف جن کا تذکرہ اس کے پہلے مکمل نہ ہوسکا۔ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں قرآن مجید کی اس آیت میں

تین مطالبات ہیں۔ پیغمبرؐ پر ایمان لانا۔ پیغمبرؐ کا احترام کرنا اور پیغمبرؐ کی مدد کرنا میں نے اس کے پہلے اشارہ کیا تھا کہ پیغمبرؐ کا احترام اسلام کا قانون بھی ہے اور عقل بشر کا تقاضا بھی ہے۔ ہر وہ انسان جس کی زندگی میں کارہائے نمایاں ہوتے ہیں وہ ہر صاحبِ عقل اور صاحبِ انصاف کی نگاہ میں خود بخود محترم ہو جاتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے تیئیس سال کے مختصر سے عرصہ میں جتنا بڑا انقلاب پیدا کیا ہے۔ جس طرح سماج کو برائیوں سے نکال کر نیکیوں کے راستہ پر لگایا ہے اس کی تاریخ کائنات میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

قرآن مجید نے پیغمبرِ اسلام کی بعثت کے موقع پر جس صورت حال کا تذکرہ کیا ہے اس کے لیے میں نے عرض کیا تھا کہ مختلف عیوب، مختلف کمزوریاں تھیں جو سارے سماج میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اتنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے، اتنے فسادات کی اصلاح کرنے کے لیے ایک انسان کو کتنی بڑی زندگی درکار ہے۔ کتنے ساتھی درکار ہیں۔ کتنے وسائل اصلاح درکار ہیں۔ کتنے اسلحے درکار ہیں۔ کیسا ماحول درکار ہے۔ آپ جب ان حالات کا تصور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ کام جو ہزاروں افراد کی معیت میں، ہزاروں اسلحوں کے ہونے کے باوجود، ہزاروں وسائلِ ابلاغ کے ہوتے ہوئے دنیا میں انجام نہیں پا سکتا ہے، وہ کام سرکارِ دو عالمؐ نے تن تنہا انجام دیا ہے۔

اس وقت چند لفظوں میں وہ خاکہ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ میرے پیغمبرؐ کے آنے سے پہلے ان کا کیا حال تھا اور پیغمبرؐ کے آنے کے بعد سماج میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ہوا ہے۔

قرآن مجید نے جن اٹھارہ برائیوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک برائی یہ تھی کہ انسان ذہنی طور پر اتنا پست ہو گیا تھا کہ مخلوق ایسی نہیں تھی جس کے سامنے اس کا سر نہ جھک جاتا ہو۔ آسمانی مخلوق ہو یا زمینی مخلوق ہو۔ زمین پر چلنے والی مخلوق ہو یا ایک مقام پر ثابت مخلوق ہو۔ قوتِ نمو رکھنے والی مخلوق ہو یا بالکل ہی جامد مخلوق ہو۔ ہر مخلوق کو انسان نے اس قابل بنا لیا تھا کہ اس کے سامنے سرِ نیاز جھکا

دیا جائے اور اس کی خدائی کا اعتراف کر لیا جائے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے سورج سے لے کر ٹھوکروں میں آنے والے ذرّات تک سب خدا تھے۔ سوچئے انسانی ذہن کتنا پست ہو گیا تھا۔ ابھی اسی پتھر کو ٹھوکر ماری تو پتّھر تھا۔ اٹھا کر طاق پر رکھ دیا تو وہ خدا ہو گیا۔ درخت جب تک نہیں کاٹا گیا خدا ہے۔ جب کاٹ دیا گیا تو لکڑی بن گیا۔ انسان کے پاس اتنی فکر، اتنی سمجھ، اتنا شعور نہیں تھا کہ جس کو خدا مانا ہے اس میں کوئی بات تو ایسی ہونی چاہیئے جو ہم سے زیادہ ہو۔ اگر خدا کے لیے خالقیت درکار نہیں ہے، اگر خدا کے لیے رازق ہونا شرط نہیں ہے تو کم سے کم خدا ماننے کے لیے اپنے سے کچھ بالاتر تو ہونا چاہیئے لیکن یہ اپنی ٹھوکروں میں آنے والے یہ کیسے خدا ہو گئے۔

کسی مصنّف نے ایک بڑا حسین جملہ لکھا ہے کہ عجیب بات ہے سڑک سے گذر رہے ہیں، سڑک پر ایک پتّھر میل کا نصب ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اسی پتّھر پر کسی کُتّے کو پیشاب کرتے ہوئے دیکھا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد کسی بندے کو اسی کے سامنے سجدہ کرتے دیکھا۔ سوچئے پتّھر کا مقدر۔ کتنی جلدی خراب ہوا، کتنی جلدی بنا۔ خراب ہوا تو کتنا کہ کُتّوں کی نگاہ میں بھی قابلِ احترام نہیں تھا، اور محترم ہوا تو اتنا کہ بشر نے اس کے سامنے سجدہ کر لیا۔ جب آپ اس پستیٔ ذہن کا اندازہ کر سکتے ہیں تو آپ محسوس کریں گے کہ پیغمبرؐ نے کیا انقلاب برپا کیا ہے۔

یہ انسان کی ابتدا کے اعتبار سے ہے کہ انسان خدا کو نہیں پہچانتا تھا۔

انتہا کے اعتبار سے انسان اس دن کو نہیں پہچانتا تھا جس دن حساب و کتاب ہونے والا ہے۔ یاد رکھئے کہ جس کے ذہن میں حساب و کتاب والے دن کا خیال رہتا ہے اس کا کردار ہوتا ہے اور جو اس دن کو بھول جاتا ہے اس کا کردار الگ ہوتا ہے۔ دنیا کے سارے فسادات کی بنیاد یہ ہے کہ عالم انسانیت نے اپنے ذہنوں سے قیامت کا خیال نکال دیا ہے ورنہ اگر یہ معلوم رہے کہ آج جتنا کریں گے کل حساب دینا پڑے گا۔ آج جو ظلم کیا ہے کل اس کا انتقام لیا جائے گا تو کبھی ایسے حالات نہ پیدا ہوں۔

تاریخ میں مختلف افراد کے بارے میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ انھیں جب حجاج کے

سامنے لایا گیا تو حجاج نے فرطِ غیظ و غضب سے کہا کہ بتاؤ تم کیسے قتل ہونا چاہتے ہو، اس لیے کہ میری نگاہ میں محبتِ علیؑ کی ایک ہی سزا ہے کہ آدمی کو قتل کر دیا جائے۔ سامنے جلّاد ہے، سامنے تلوار ہے، سامنے حجاج جیسا حاکم ہے۔ ایسے وقت میں انسان کا جواب کیا ہونا چاہیے۔ کوئی ترحم کی درخواست، ہوتی کہ اگر مارنا ہی چاہتے ہو، قتل ہی کرنا چاہتے ہو، تو کم سے کم ویسے قتل کرو جس میں کم سے کم تکلیف ہو۔ کم سے کم اذیت ہو۔ دیر تک مجھے مصیبت کو برداشت کرنا پڑے گا مگر اللہ والے کا جواب پہچانیے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ جس کے ذہن سے عقیدۂ قیامت نکل جاتا ہے وہ حجاج ہوتا ہے۔ اور جس کے ذہن میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے وہ محبِ علیؑ ہوتا ہے۔

عجب جواب دیا۔ کہا مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے۔ مجھ سے یہ سوال کیوں ہے کہ میں کیسے قتل ہونا چاہتا ہوں۔ تو پہلے بتا دے کہ تو کیسے قتل ہونا چاہتا ہے؟ اس نے کہا کہ تمھاری مجال کہ تم مجھے قتل کرو گے۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ تو کیسے قتل ہونا چاہتا ہے، تم میں یہ ہمت پائی جاتی ہے کہ قیدی میرے سامنے، دربار میرا، افراد میرے، جلّاد میرا، اور تم میں یہ حوصلہ پیدا ہو گیا کہ مجھ سے اس انداز سے گفتگو کر رہے ہو؟۔ کہا نہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ میں تجھے قتل کروں گا۔ میں فقط یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انسان دنیا میں جیسا جُرم کرے گا آخرت میں ویسی ہی سزا دی جائے گی۔ جیسی سزا کا حوصلہ تجھ میں پایا جاتا ہو ویسے ہی ظلم کی ہمّت پیدا کر۔ میں ہر ظلم برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

فرق پہچانا آپ نے۔ ان دونوں کے ذہن میں کیا فرق ہے؟

اتنا ہی فرق ہے کہ وہ جس آخرت کو بھول گیا تھا، علیؑ کا غلام اس آخرت کو یاد دلانا چاہتا ہے تاکہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ ظلم پیدا ہوتا ہے آخرت کو بھول جانے سے اور انصاف قائم ہوتا ہے آخرت کو یاد رکھنے سے۔

یہی وجہ ہے کہ خدا نے جس کو انصاف کا ذمہ دار بنایا اس کے عقیدہ کو قیامت سے جوڑ دیا۔ اوّل توحید، دوسرے عدل، تیسرے نبوّت، چوتھے امامت، پانچویں قیامت۔ سمجھے آپ عقیدۂ امامت کو قیامت سے کیوں جوڑا گیا ہے؟ قیامت کا کام ہے عدل و

انصاف کا حساب لینا اور امامت کا کام ہے عدل و انصاف قائم کر دینا۔

یہ اسلام کے بنیادی عقائد کے اعتبار سے جو اسلام نے بعد میں پیش کیے اس کے بعد اگر تہذیب اور اخلاق کا عالم دیکھنا چاہتے ہیں تو خود قرآن مجید نے جن حالات کیطرف اشارہ کیا ہے ان کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد جیسے سارا مال ترکہ میں تقسیم ہوتا تھا یہ مکان انھیں ملا ہے۔ یہ پیسہ انھیں ملا ہے۔ یہ کپڑا انھیں ملا ہے۔ جو مال جسے ملا ہے وہ مال استعمال کرے گا۔ وہ مال اس کا اپنا ہے اس مال کو وہ استعمال کرے گا۔ جس انداز سے باپ کے مرنے کے بعد ان کی ساری املاک کو ترکہ میں تقسیم کیا جاتا تھا ویسے ہی باپ کی بیوی یعنی اپنی ماں بھی بطور ترکہ اولاد کو دی جاتی تھی۔ قرآن مجید نے اسی لیے کہا تھا "وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ" خبردار جن سے تمھارے باپ نے نکاح کیا ہے ان سے تم نکاح نہ کرنا۔ سوچیے کہاں تک انسانیت ذلیل ہو سکتی ہے ہم تو بیسویں صدی کے حالات سے پریشان ہیں کہ اس دنیا کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اتنے مسلمان، لاکھوں مسلمان، کروڑوں مسلمان، پچاس اسلامی حکومتیں سب پریشان ہیں اس دنیا کی اصلاح کیسے کی جائے۔ کل تو نہ کروڑوں مسلمان تھے نہ لاکھوں چاہنے والے تھے نہ حکومتیں تھیں، نہ اقتدار تھا نہ وسائل ابلاغ، کچھ نہیں تھا ایک آدمی تھا جو یہ آواز بلند کر رہا تھا کہ خبردار یہ کام نہ ہونے پائے۔ یہ ذلت کی آخری انتہا تھی کہ ماں کو میراث میں لینے کے بعد بطور ترکہ استعمال کیا جائے۔ یہ اونچے رشتہ کا حال تھا جس کا نام ہے ماں اور جو پست رشتہ تھا اس کا حال میں بیان کر چکا ہوں کہ بیٹی پیدا ہو اور زندہ دفن کر دی جائے۔ اس کے بعد دیگر اخلاقیات کو اگر دیکھنا ہے تو بدکاری کوئی عیب نہیں تھی۔ شراب پینا کوئی بُرائی نہیں تھا۔ جُوا کھیلنا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ سود کھانا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ یہ دنیا کا حال تھا اور ذرا اونچے چلے گئے تو اپنی اولاد، اپنے اپنے گھر والوں کا احترام، ان کی عزّت، ان کے بارے میں اچھے اچھے خیالات مگر ملائکہ۔ اللہ کی بیٹیاں۔ قرآن مجید نے کیا حسین نقشہ کھینچا ہے کہ جب تم نے ملائکہ کو دیکھا نہیں تو تمھیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ اگر کبھی بزمِ پیغمبرؐ میں کسی نے وہب کلبی کی شکل میں کسی ملک کو دیکھا بھی ہو گا تو وہ بھی اتفاق سے

مرد ہی کی شکل میں دیکھا ہوگا اور کسی نے اپنے سرہانے ملک الموت کو دیکھا ہوگا تو اس نے بھی کسی نہ کسی مرد ہی کی شکل میں دیکھا ہوگا۔ یہ عجیب قیامت ہے کہ جس کو دیکھا نہیں ہے، جس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ پہلے اسے عورت قرار دیا اور عورت قرار دینے کے بعد شجرہ کی تلاش شروع ہوگی۔ اس لیے کہ ہر آدمی سوچ رہا تھا کہ اگر ہماری اولاد ہوتی تو ہم تو بیٹیوں کو زندہ نہیں رہنے دیتے۔ یہ کیسے بچّے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ پروردگار عالم نے کہا کچھ تو انصاف کیا ہوتا مجھے خدا نہیں مانا تو نہ مانا ہوتا۔ جب جانتے ہو کہ میں ہی پیدا کرنے والا ہوں تو اتنا باذوق تو مانا ہوتا کہ اگر تم اپنے واسطے بیٹی نہیں پسند کرتے ہو، بیٹا پسند کرتے ہو جب کہ تمھیں پیدا نہیں کرنا ہے۔ تم تو خالی تمنّا کر سکتے ہو۔ دُعا کر سکتے تو مجھے خود ہی بنانا ہے۔ تو اگر بیٹا بیٹی سے بہتر ہے تو جب میں اپنے لیے اولاد کا انتخاب کروں گا تو میں بیٹیاں نہیں بناؤں گا، بیٹے ہی بناؤں گا۔ مگر تمھارے پاس اتنا بھی شعور نہیں ہے۔ میرے بارے میں اس ذوق کے بھی قائل نہیں ہو جس ذوق کے اپنے بارے میں قائل ہو۔

آپ نے حالات دیکھے۔ اب مالیات کو دیکھیں گے تو اس کا بھی وہی حال دکھائی دے گا۔ اس کے بعد جتنی اور برُائیاں وہمیات سے تعلق رکھتی ہیں، خرافات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک پورا سماج تھا جو غلاظتوں میں ڈوبا ہوا، برُائیوں میں ڈوبا ہوا، خباثتوں میں ڈوبا ہوا، ذہنی خباثت، عملی خباثت، عقلی خباثت، اجتماعی خباثت، اقتصادی خباثت، سیاسی خباثت، کوئی برُائی ایسی نہیں تھی جس سے وہ سماج پاک رہا ہو۔

ایک انسان اُٹھا اور وہ یہ کہہ رہا ہے۔ ہے کوئی جو میرے بوجھ کو ہٹائے۔ ہے کوئی جو میرا ساتھ دے۔ اس دن تو کوئی ساتھ دینے والا بھی دکھائی نہ دیا ایک بچہ کی آواز فضا میں گونج رہی تھی "اَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" اور کوئی آواز نہیں سُنائی دی۔ جتنی آوازیں سُنائی دیں سب بعد میں۔ اس دن کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ ایک انسان

اٹھا ہے۔ پروردگارِ عالم کے اعتماد پر۔ پروردگارِ عالم کی نصرت کے بھروسہ پر، اور اس نے یہ اعلان کیا ہے کہ میں اس دنیا کو منقلب کر دوں گا۔ میں ان حالات کو بدل دوں گا۔ میں اس ماحول کو برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ میرا خدا برداشت کرے گا نہ میں برداشت کروں گا۔ میری ذمہ داری ہے کہ میں اس سماج میں انقلاب پیدا کروں۔ زیادہ زمانہ نہیں تیرہ سال مکّہ میں، دس سال مدینہ میں، اور جو ساتھ دینے والے ہیں ان کا حال بھی آپ کو معلوم ہے۔ پہلے دن ایک تھا اس کے بعد جتنے ہو گئے ہوں۔ لیکن بہر حال تیئیس[۲۳] سال کے بعد جب وہ دنیا سے جا رہا تھا تو کتنا بڑا انقلاب پیدا کر کے گیا۔ جو پتّھروں کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے ان کی نگاہیں نامحرموں کے سامنے بند ہونے لگیں۔ جو جنگ و جدال کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے انھیں صلح کرنے کا شعور دے دیا۔ جو بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے انھیں بیٹیوں کا احترام سکھا دیا۔ جو عورت کو میراث نہ دیتے تھے ان کی نگاہ میں اولاد کو وارث بنا دیا۔ جو مال حرام کھانے والے تھے ان کو مال لٹانے کا حوصلہ دیدیا۔ جو گلے کاٹنے والے تھے ان کو قربانی دینے کا حوصلہ دے دیا۔

ایک انسان اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دے سوچا نہیں جا سکتا۔ تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ انقلاب ایک نمونہ تھا کہ تم نے طاقت کا پہلا حصّہ دیکھا ہے۔ یہ چھوٹے سے جزیرے میں اتنا بڑا انقلاب دیکھا لیا۔ اب اس کے بعد جب افراد بڑھیں گے۔ اولاد بڑھے گی۔ ذُرّیت کام کرے گی۔ نسلیں کام کریں گی۔ تو اس کے بعد اگر یہ ساری بُرائیاں کل عالم میں پھیل جائیں گی تو ایک میرا ہی وارث اُٹھے گا جو سارے عالم کے ظلم و جور کو عدل و انصاف میں تبدیل کر دے گا اور خدا نے میرے وقار کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے میرا ہی نام بھی دیا ہے اور میری ہی کُنیت بھی دی ہے تاکہ دنیا کو پھر یہ احساس پیدا ہو جائے یہ کسی غیر کا کام نہیں ہے یہ ابوالقاسم کا ہی کام ہے۔ یہ محمد ہی کا کام ہے۔

اب اس کے بعد میں اس موضوع کی مختصر وضاحت کرنا چاہتا ہوں جس کو آج میں نے عنوانِ کلام قرار دیا ہے۔ مسئلہ ہے نصرتِ رسالت کا۔ فلاح پانے والے، کامیاب، نجات پانے والے وہی ہیں جو پیغمبرؐ پر ایمان لائے، پیغمبرؐ کا احترام کیا اور پیغمبرؐ کی مدد کی اس مقام

پر صرف دو باتیں گذارش کرنا ہیں۔ زیادہ وقت نہیں ہے۔ لیکن آپ ان دونوں باتوں کی طرف مکمّل طور سے متوجہ رہیں تاکہ اس حقیقت کو پہچانیں جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

حیاتِ پیغمبرؐ میں جتنے اعمال پائے جاتے ہیں۔ سیرتِ پیغمبرؐ میں جتنی باتیں پائی جاتی ہیں ان باتوں کے بارے میں سوچنے کے لیے انسان کو الگ سے معیار قائم کرنا ہوگا۔

پیغمبرِ اسلامؐ کے اعمال، پیغمبرؐ کے افعال، پیغمبرؐ کی سیرت قیاس دنیا کے دوسرے انسانوں کی سیرت پر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ فقط میرا عقیدہ یا میرا ایمان نہیں ہے۔ یہ پیغمبرِ اسلامؐ کی شخصیت کو دیکھنے کے بعد ہر انسان خود اندازہ کر سکتا ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ کے اعمال، آپ کے افعال کی الگ ایک دنیا تھی۔ حضور دنیا میں آئے تو دنیا کی اصلاح کے لیے آئے۔ دنیا کو سنوارنے کے لیے آئے۔ دنیا کو راہ راست پر لگانے کے لیے۔ لہٰذا پیغمبرؐ کے سارے اعمال میں اس رُخ کا ہونا ضروری ہے کہ دنیا کی اصلاح ہو جائے۔ پیغمبرؐ کے ہر عمل میں اس پہلو کا ہونا ضروری ہے کہ دنیا کو کیسے سنوارا جائے گا اور دُنیا کو کیسے راہ راست پر لایا جائے گا۔ ورنہ کتنے اعمال ایسے ہیں کہ جن کی سرکارِ دو عالمؐ کو کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس کے بعد بھی حضورؐ نے وہ اعمال انجام دیئے کہ اگر ہم یہ کام نہ کریں گے تو تم کیسے سمجھو گے کہ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔

ایک غیر مسلم نے ایک کتاب لکھی قرآن مجید کے خلاف اس میں بہت سی باتیں بہت سے خرافات ہیں۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" یہ کس کا کلام ہے۔ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے۔ یہ کس کا کلام ہے۔ اگر پیغمبرؐ نے اپنے پاس سے بنایا ہے تو مسلمان کیوں کہتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے۔ اور اگر یہ کلامِ خدا ہے تو یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ کوئی آدمی خود اپنی تعریف کرے۔ یہ کون کہہ رہا ہے؟ خدا ہی تو کہہ رہا ہے۔ قرآن کلامِ خدا ہے اور قرآن کہہ رہا ہے ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے۔ یعنی ساری تعریف میرے واسطے ہے اور یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے کہ کوئی آدمی اپنی خود تعریف کرے۔

پہلے جب میں نے اس کتاب کو پڑھا۔ آج سے تیس پینتیس سال پہلے تو مجھے پڑھ کر ہنسی آگئی کہ بیچارے نے رُخ تو اچھا نکالا تھا اور ہو سکتا تھا کہ دو چار مسلمان گمراہ بھی ہو جاتے مگر آخر میں ایسی احمقانہ بات کہہ دی کہ یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے کہ کوئی آدمی خود اپنی تعریف کرے۔ اگر یہ بات نہ کہی ہوتی تو شاید دو چار منٹ اس کی بات سوچنے کے قابل ہوتی۔ ابھی تو آپ نے کہا کہ دو قسمیں ہیں یا کلامِ پیغمبرؐ ہے یا کلامِ خدا۔ اگر کلامِ پیغمبرؐ ہے تو آدمی کا کلام ہے۔ لیکن اگر کلامِ خدا ہے تو آدمی کا کلام نہیں ہے۔ ہم نے اگر کلامِ پیغمبرؐ کہا ہوتا تو آپ کو یہ کہنے کا موقع تھا کہ اچھا نہیں لگتا کہ کوئی آدمی اپنی تعریف خود کرے۔ جب کہ یہ پیغمبرؐ کی تعریف نہیں ہے خدا کی تعریف ہے۔ لیکن اگر کلامِ خدا ہے تو یہ آپ کو کس دن خیال پیدا ہو گیا کہ یہ کسی آدمی کی بات ہے جس کو مسلمان نے خدا کہا ہے۔ لیکن بہر حال لوگ سوچتے ہیں کہ اپنی تعریف اپنی زبان سے اچھی نہیں ہوتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! اس مسئلہ کا واقعی حل بھی سامنے موجود ہے۔ آپ سوچئے ہم آپ جب پیدا ہوئے تو دوسروں کا حال نہیں سب اپنا اپنا حال تو جانتے ہیں کہ ہم آپ جب پیدا ہوئے تو اتنے جاہل تھے کہ دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور خود اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ قرآن مجید کا بھی اعلان ہے "وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا" اللہ نے تم کو اس عالم میں پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ کتنا بڑا چیلنج ہے کسی صاحب میں ہمّت ہو تو کہہ دیں کہ نہیں، ہم کچھ جانتے تھے۔ اتنا بڑا جاہل کہ اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ماں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ گھر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ تو جو اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ اپنے پیدا کرنے والے کو کیسے سمجھ لے گا۔ ایسا جاہل پیدا ہونے والا اپنے خالق اور مالک کو کیسے پہچان لے گا۔ یہ تو اس مالک کی ذمہ داری تھی کہ ایسی مخلوقات کے سامنے اپنی عظمت اور اپنے جلال و جمال کو پیش کرتا تا کہ یہ بیچارہ یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کہاں سے آپ کو پہچانیں گے۔ ہماری اوقات ہی کیا ہے لہٰذا اس نے کہا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پہچانو!

میں کون ہوں۔ سب کسی ایک کام میں قابلِ تعریف ہو جاتے ہیں لیکن اگر ساری تعریفیں کہیں اکٹھا ہو سکتی ہیں کہ نہ تنہا میں ہوں۔ سب ایک دو کے پرورش کرنے والے ہیں اور اگر عالمین کا کوئی پالنے والا ہے تو میں ہوں۔ وہ اگر نہ پہچنواتا تو کوئی پہچنوانے والا نہ ہوتا۔

اب بات آگئی ہے تو جملہ کو محسوس کیجیے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر خدا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" نہ کہتا تو کوئی خدا کا پہچاننے والا نہ ہوتا۔ خدا نے ایک راستہ بتا دیا کہ کسی شخص کا بھی اپنی تعریف کرنا عیب ہے مگر جو نہیں جانتے ان کو بتانا بھی فرض ہے۔ اگر عالم عربیت پیغمبرؐ کو پہچان سکتا ہوتا تو کبھی نہ کہتے میں "رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ" ہوں۔ کبھی نہ کہتے "رَسُوْلُ اللّٰهِ" ہوں۔ کبھی نہ کہتے میں صاحبِ اعجاز ہوں۔ کبھی نہ کہتے میں صاحب کمال ہوں۔ تو جیسے خدا کا فرض تھا کہ مخلوقات کو پہچنوائے کہ میں کون ہوں۔ ویسے ہی نبی کا فرض تھا کہ اس مخلوق کو سمجھائے کہ میں کون ہوں اور جب یہ راستہ آگے بڑھا تو اب نہ کہئے گا کہ منبر سے یہ کہنا کہ جو چاہو دریافت کرو اچھا نہیں لگتا ہے۔ اگر یہ نہ کہا ہوتا تو لوگ پہچانتے کیسے کہ یہ کیا ہیں۔ یہ کہنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ کہنے والا اور ہے کہ جو چاہو دریافت کرو اور وہ کہنے والا اور ہے کہ سب جانتے ہیں تنہا میں نہیں جانتا ہوں۔

تو عزیزانِ محترم! میں یہ گذارش کر رہا تھا سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی میں آپ کے اعمال و افعال کی ایک بڑی بنیاد یہ ہے کہ اگر حضورؐ نے یہ اعمال انجام نہ دیئے ہوتے تو دنیا والوں کو وہ طریقے ہی نہ معلوم ہوتے اور زندگی کا وہ اصول ہی نہ معلوم ہوتا کہ کیسے زندگی گذاری جاتی ہے۔ وہ پروردگار جس نے حبیب کو اتنا بڑا شرف دیا کہ جب چاہا وہاں بلا لیا عرش اعظم پر جہاں تک کسی کا ذہن نہیں پہونچتا وہاں پیغمبرؐ کے قدم پہونچے۔ وہ صاحبِ اختیار جو زمین پر بیٹھ کر آسمان کے چاند کو توڑ سکتا ہے۔ کیا یہ اپنی دو روٹیوں کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ کیا یہ انسان اپنے دو وقت کے کھانے کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ کیا پروردگار اسے انگلیوں میں صرف اتنی طاقت دیتا ہے کہ چاند کو توڑ دے اتنی قوت نہیں دیتا ہے کہ اشارہ کرے...

قرآن میں مثال موجود ہے۔ جو خدا مریم کو یہ شرف دے سکتا ہے کہ درخت خرما ہلائیں تو بغیر فصل کے تازہ میوے مل جائیں۔ وہ خدا اپنے پیغمبرؐ کو یہ طاقت نہیں دے سکتا تھا اور اگر دے سکتا تھا تو مالِ خدیجہؑ سے تجارت کرنے کا کیا کام تھا۔ ایک ایک خرمہ کے واسطے ایک ایک ڈول پانی کھینچنے کی کیا ضرورت تھی۔ تو اگر پیغمبرؐ مالِ خدیجہؑ لے کر تجارت کرنے کے واسطے گئے تو کیا پیغمبرؐ مالِ خدیجہؑ کے محتاج تھے۔ اگر پیغمبرؐ باغ میں جا کر سینچائی کر رہے ہیں ایک ڈول پر ایک خرمہ لینے کے واسطے تو کیا پیغمبرؐ خرمہ کے محتاج تھے۔ جس کے صدقہ میں کُل کائنات بنی ہے وہ محتاج کس کا ہے۔ مگر چونکہ پروردگارِ عالم نے اس پیغمبرؐ کو اصلاحِ انسانیت کے واسطے بھیجا تھا لہٰذا کہا کہ پیغمبرؐ! اگر تم تجارت نہ کروگے تو کل تجارت عیب بن جائے گی۔ اور اگر تم اپنے مال سے تجارت کروگے تو سیٹھوں کی تجارت تو تجارت ہوگی اور غریبوں کی تجارت ذلّت ہو جائے گی۔ یعنی جس کے پاس تجارت کا سرمایہ ہو وہ اگر تجارت کرے تو کیا کہنا۔ لیکن اگر دوسرے کے پیسے سے تجارت کرے تو یہ تو انھیں کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں۔ پیغمبرؐ! میں تمھیں بھی مال دے سکتا تھا مگر میں چاہتا ہوں کہ تم تجارت بھی کرو تو مالِ خدیجہؑ سے، تاکہ نہ تجارت عیب بننے پائے اور نہ دوسرے کے مال سے تجارت عیب بننے پائے۔ ورنہ اسلام ساہوکاروں کا مذہب بن جائے گا۔ اے پیغمبرؐ! تم چلو محنت مزدوری کرو۔ مشقّت برداشت کرو ایک ایک خرمہ کے واسطے کہ اگر یہ نہ کروگے تو کل مزدوری عیب ہو جائے گی۔ تو جتنے کاموں کو پروردگار نے حلال بنایا تھا سب کی زحمت اپنے پیغمبرؐ کو دی تاکہ سیرتِ پیغمبرؐ بہترین نمونہ بن جائے اور کل کوئی عمل عیب نہ بننے پائے۔ کل کوئی عمل نقص نہ بننے پائے۔ ورنہ پیغمبر کسی بات کا محتاج نہیں تھا۔ اب آپ کو معلوم ہوا کہ پیغمبرؐ کے اعمال کی مصلحت احتیاج نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کے اعمال کی مصلحت مجبوری نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کے اعمال کی مصلحتیں اور ہیں۔ کہیں اُمّت کو تعلیم دینا مصلحت ہے۔ کہیں نمونۂ عمل کرنا مصلحت ہے۔ کہیں کوئی اور مصلحت ہے۔ لیکن ان سب کا کوئی تعلق احتیاج، غرض اور ضرورت سے نہیں ہے۔

اتنی بات واضح ہوگئی تو دو جملے اور پہچانیں تاکہ میں اپنی منزل پر آجاؤں۔ اگر پیغمبرؐ مالِ خدیجہؑ کے بجائے اپنے مال سے تجارت کرتے یا خدا نے نبیؐ کو راتوں رات خزانہ دیدیا ہوتا تو یا حضورؐ بیٹھ کے کھاتے یا تجارت ہی فرماتے۔ تو نبیؐ کی زندگی میں کھانا تو ہوتا، نبیؐ کی زندگی میں تجارت تو ہوتی مگر وہ کردارِ خدیجہؑ کہاں سے سامنے آتا جو عالمِ انسانیت کی آدھی برادری کے واسطے ایک نمونہ بنا ہوا ہے۔ جب مالِ خدیجہؑ سے حضورؐ نے تجارت کی اور اس کے بعد خدیجہ نے پیغام دے کر حضورؐ سے خود عقد کیا، تب دنیا کو اندازہ ہوا کہ مال کی کوئی حیثیت نہیں ہے کمال کے مقابلہ میں۔ تب دنیا کو اندازہ ہوا کہ اگر نبیؐ کے گھر میں پیسہ مانگنے والی آسکتی ہیں تو نبیؐ کے گھر میں دولت لٹانے والی بھی آسکتی ہے۔

عالمِ اسلام پورے کردارِ خدیجہؑ سے محروم رہ جاتا اگر سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی میں یہ شعبہ نہ ہوتا۔ اسی لیے پروردگارِ عالم نے کہا پہلے دن آپ کو یہ کام انجام دینا ہوگا۔ آپ کو تجارت کرنا ہے اور مالِ خدیجہؑ سے تجارت کرنا ہے۔ اب جو حضورؐ پلٹ کے آئے اور خدیجہؑ کے غلام نے سرکارؐ کے کرامات، معجزات اور کارہائے نمایاں کا ذکر کیا تو اس کے بعد جو صورتِ حال سامنے آئی وہ آپ کی نگاہ کے سامنے ہے۔

میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ حضورؐ کے کاموں کی مصلحت نہ غرض تھی نہ ضرورت۔ کوئی الگ مصلحت ہے جس کی ایک قسم میں نے بیان کر دی تاکہ بات آپ کے ذہنوں سے قریب تر ہو جائے۔ اب جس دن پیغمبرؐ لوگوں سے مدد مانگ رہا تھا اللہ نے کہا وہی نجات والے ہیں جو پیغمبرؐ کی مدد کریں گے۔ تو جس دن پیغمبرؐ لوگوں سے مدد مانگ رہا تھا کیا پیغمبرؐ مدد کا محتاج تھا۔ جو خدا مدد کرنے والے کو طاقت دے سکتا تھا کہ وہ اس خدا کی دی ہوئی طاقت سے پیغمبرؐ کی مدد کرے۔ وہ طاقت کو بجائے ان کے بازو میں رکھنے کے ان ہی کے بازو میں رکھ دیتا۔

تو کیا اگر پیغمبرؐ لوگوں سے مدد مانگ رہا ہے کسی بات کے لیے تو کیا پیغمبرؐ کا مدد مانگنا پیغمبرؐ کی کمزوری کی نشانی ہے؟ پیغمبرؐ کی مجبوری کی نشانی ہے؟ پیغمبرؐ کی محتاجی کی نشانی ہے؟ یا اس کے پیچھے کوئی اور مصلحت کام کر رہی ہے؟ اسی نکتہ کو پہچانو عزیزو! اور پہچاننا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

رہا تھا تو پیغمبرؐ کے بارے میں سوچا بھی جا سکتا ہے کہ بشر ہیں۔ ایک آدمی کے بازو میں کتنی طاقت ہو گی۔ ایک آدمی کے ہاتھ پاؤں میں کتنی قوت ہو گی۔ ایک آدمی کے پاس کتنا سرمایہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے زیادہ کی ضرورت پڑ جائے اور مدد مانگنا پڑے۔ لیکن پروردگار نے کہا کہ پیغمبرؐ! آپ بعد میں مدد مانگیں گے۔ آپ دنیا سے مدد کا مطالبہ بعد میں کریں گے۔ پہلے تو ہم کہیں گے "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ" اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمھاری مدد کرے گا۔ اب دیکھوں میرے بارے میں کون سوچتا ہے کہ بازوؤں کی طاقت کمزور ہو گئی ہے۔ میرے بارے میں کون سوچتا ہے کہ دل کی طاقت کمزور ہو گئی ہے۔ تو میں نے اسی لیے پہلے مدد مانگ لی تاکہ تمھارے بارے میں کوئی سوچنے نہ پائے کہ جب مدد کا مطالبہ کیا ہے تو کمزور ہوں گے۔ مدد مانگنا طاقت کی کمزوری ہے۔ دنیا میں مدد مانگنا دنیا کے اعتبار سے طاقت کی کمزوری ہے۔ جب آدمی طاقت میں کمزور ہوتا ہے تو دوسرے سے مدد مانگتا ہے۔ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے ضعیف آدمی، کمزور آدمی ہے اب جو اُٹھنا چاہتا ہے تو ہم سے کہا ذرا ہاتھ پکڑنا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم کھڑے ہو سکیں لہٰذا آدمی مدد مانگتا ہے۔ جب طاقت کا کمزور ہوتا ہے۔ جب دولت کا کمزور ہوتا ہے۔ طاقت کا کمزور ہوتا ہے تو مدد مانگتا ہے۔ اور دولت کا کمزور ہوتا ہے تو قرض مانگتا ہے۔ مجھے چار ہزار روپئے کی ضرورت ہے، میرے پاس دو ہی ہزار ہیں تو میں کیا کروں کہیں نہ کہیں سے قرض لوں گا۔ کسی مردِ مومن سے، مردِ کافر سے، بینک سے جو طریقہ جس کا ہو گا اس لیے کہ جب دولت میں کمزور ہو جائے گا تو قرض مانگے گا۔ تو دنیا میں مدد مانگنا علامت ہے کہ طاقت کمزور ہے اور قرض مانگنا نشانی ہے کہ دولت کا کمزور ہے۔ مگر کیا کیا جائے قرآن مجید میں پروردگار نے دونوں کام کر دیے۔ کبھی بندوں سے کہا "اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" خدا کو قرض دو۔ کبھی کہا "اَنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ" مدد کرو۔ تو پروردگار! کیا مال کچھ کم پڑ گیا ہے۔ خدایا! کیا طاقت کمزور ہو گئی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیوں قرض مانگتا ہے۔ کیوں مدد مانگتا ہے۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ جو قرض مانگتا ہے وہ مال کا کمزور ہوتا ہے، اور جو مدد مانگتا ہے وہ طاقت کا کمزور ہوتا ہے۔

بات واضح ہے لیکن ایک جملہ یاد رکھیے گا۔ آدمی چاہے مال مانگے یا مدد مانگے دونوں کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مجھے چار پیسے کی ضرورت ہے۔ میں نے آپ سے کہا کہ مجھے چار پیسے چاہیئے آپ دید یجئے میں آپ کا بہت بہت شکر گذار ہوں گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں کمزور ہوں اس لیے کہ پیسہ آپ دیں گے اور میرے پاس سوائے شکریہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ آپ مجھے چار پیسے دید یجئے ابھی میں آپ کو چار ہزار دوں گا۔ تو کیا اس کے بعد بھی کوئی آدمی مجھے دولت کا کمزور سمجھ سکتا ہے۔ میں چار ہزار دینے کے قابل ہوں تو میں چار پیسے کا محتاج ہوجاؤں گا۔

اسی طرح اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میری مدد کریں، اس کے بعد جتنی مدد آپ چاہیں گے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ گھبرائیے گا نہیں ہزار سامنے آجائیں، لاکھ سامنے آجائیں میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں آپ کا محتاج نہیں ہوں۔ تو جب میں مدد کے مقابلہ میں مدد کی بات کروں۔ جب میں قرض کے مقابلہ میں دس گنا، بیس گنا، سو گنا، ہزار گنا، لاکھ گنا دینے کی بات کروں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں آپ کا محتاج نہیں ہوں۔ آپ مجھ سے یہی تو پوچھیں گے کہ پھر مانگ کیوں رہے ہیں؟ جب دس گنا دے سکتے ہیں، سو گنا دے سکتے ہیں تو مانگ کیوں رہے ہیں؟ تو میرا ایک ہی جواب ہوگا کہ مانگ اس لیے نہیں رہا ہوں کہ میری احتیاج ظاہر ہو۔ مانگ اس لیے رہا ہوں تاکہ آپ کی محبت ظاہر ہو۔ یہ قرض میں نے آپ سے مانگا ہے یہ اپنی ضرورت کے واسطے نہیں مانگا ہے، میں تو دس گنا آپ کو دے سکتا ہوں۔ اس لیے مانگا کہ دیکھوں آپ دے بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ تو میرے قرض مانگنے کی مصلحت احتیاج نہیں ہے، گستاخی معاف آپ کی محبت کو بے نقاب کرنا ہے۔ میں جو مدد مانگ رہا ہوں میں کمزور نہیں ہوں۔ میں یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ آپ میرے مددگار ہیں یا نہیں۔ اسی لیے آپ مدد کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اب پروردگار آواز دیتا ہے کہ میں نے قرض مانگ کے سو گنا، ہزار گنا، لاکھ گنا کا وعدہ کیا تو پہچانا تم نے کہ میں مال کا کمزور نہیں ہوں۔ جب میں نے کہا کہ خدا کی مدد کرو

خدا تمھاری مدد کرے گا تو تم نے پہچان لیا کہ میں طاقت کا کمزور نہیں ہوں۔ تم مجھ سے یہ پوچھتے ہو کہ خدایا پھر یہ مانگ کیوں رہا ہے۔ تو یاد رکھو کہ میں اگر تم سے دولت نہ مانگتا تو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ایثار کرنے والا کون ہے اور بخل کرنے والا کون ہے۔ تو میں اپنی غرض کے لیے نہیں مانگ رہا ہوں۔ تمھیں پہچاننے کے لیے یا پہچنوانے کے لیے مانگ رہا ہوں ورنہ اگر تم راہِ خدا میں صدقہ دے کر آؤ گے تو مجھے کیا ملے گا۔ میں تو پہلے ہی سے کہہ رہا ہوں کہ صدقہ دے کر آؤ۔ اب بھی نہ سمجھے کہ میں محتاج نہیں ہوں۔ اس لیے کر اگر میں نے احتیاج کی بنا پر کہا ہوتا تو میں کہتا تحفہ لے کر آؤ۔ ہدیہ لے کر آؤ۔ یہ نہ کہتا کہ صدقہ دے کر آؤ۔ حضورؐ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تحفہ لے کر آؤ۔ ہدیہ لے کر آؤ۔ یہ دنیا کے بادشاہ کہتے ہیں۔ پیغمبرؐ نے کہا کہ صدقہ دے کر آؤ۔ پھر اعلان کرتے ہیں کہ صدقہ میں اور میری اولاد سب پر حرام ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اگر مانگا بھی ہے تو اپنے گھر والوں کے پالنے کے لیے نہیں، تمھیں پالنے کے لیے مانگا ہے۔

تو مالک کائنات یہ اعلان کر رہا ہے کہ میں قرض مانگ رہا ہوں تمھارے حوصلوں کو دیکھنے کے لیے۔ میں مدد مانگ رہا ہوں تمھاری طاقتوں کو دیکھنے کے لیے۔ میری طاقت نہ دیکھو میں تو طاقت بانٹنے والا ہوں۔ میں طاقت دینے والا ہوں۔ میری طاقت کبھی کمزور نہیں ہو سکتی۔ میں تمھاری طاقت دیکھنا چاہتا ہوں۔ کبھی میدان میں آسکتے ہو کہ نہیں۔ اور اگر آسکتے ہو تو ٹھہر سکتے ہو یا نہیں۔ اگر شجاعت کے جوہر دکھلا سکتے ہو تو ایک کے مقابلہ میں یا دس کے مقابلہ میں یا ہزار کے مقابلہ میں یا اگر ایک ہی ہزار کے مقابلہ والا ہو تو کیا کرو گے۔ ہم فقط تمھیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم ہماری طاقت نہ دیکھو ہم تمھاری طاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم ہماری دولت نہ دیکھو ہم تمھارا حوصلہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اب اندازہ ہوا کہ احتیاج کی بنا پر مانگنا اور ہے اور امتحان کی بنیاد پر مانگنا اور ہے۔ اللہ نے پیغمبرؐ کو کُل کائنات کے ذخیرے دینے کے بعد اب پیغمبرؐ سے کہا کہ مدد مانگو تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ میں تمھارا محتاج نہیں ہوں۔ تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور میں کہا

دیکھنا چاہتا ہوں؟ تمھیں خود اپنے کو دکھلانا چاہتا ہوں۔ اپنی اپنی حیثیت، اپنی اپنی اوقات، اپنے اپنے حالات تم خود پہچانو۔ کون میری مدد کرنے والا ہے۔ کون میرا ساتھ دینے والا ہے۔ ورنہ مجھے کس کی ضرورت ہے۔ میں کُل کائنات سے بے نیاز بنایا گیا ہوں۔ میرا ایک خدا ہے جس کا میں نیاز مند ہوں۔ باقی ساری کائنات کو میرا محتاج بنایا ہے۔ مجھے سارے کائنات سے بے نیاز بنایا ہے۔

اب یہاں تک بات آگئی ہے تو ایک جملہ اور یاد رکھیے گا۔ پروردگارِ عالم نے بے نیاز ہونے کے بعد بھی مال کی دنیا میں قرض مانگا اور طاقت کی دنیا میں مدد کا مطالبہ کیا اور پھر یہ اعلان کیا کہ اگر میں قرض مانگوں تو مجھے محتاج نہ سمجھنا۔ اگر میں مدد مانگوں تو مجھے کمزور نہ سمجھنا۔

کتنا دور سے خدا نے انتظام کیا ہے۔ کتنی دور سے پروردگارِ عالم عظمتِ آلِ محمدؐ کا اہتمام کیا ہے۔ میں قرض بھی مانگوں گا۔ میں مدد بھی مانگوں گا تا کہ تمھارے میں یہ بات رہ جائے کہ قرض مانگنا احتیاج کی دلیل نہیں ہے۔ مدد مانگنا کمزوری کی دلیل نہیں ہے۔ خدایا تو یہ کیا انتظام ہو رہا ہے؟ کہا یہ مستقبل کا انتظام ہو رہا ہے۔ میرے دو بندے ہوں گے۔ ایک یہودی کے یہاں جا کے قرض مانگے گا۔ ایک میدانِ جہاد میں آکے مدد مانگے گا۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے لوگ محتاج سمجھ لیں۔ اسے کمزور سمجھ لیں۔ اس لیے پہلے ہی یہ کام میں خود انجام دے لوں تا کہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ نہ قرض مانگ کے علیؑ محتاج ہو سکتے ہیں اور نہ مدد مانگ کے حسینؑ کمزور ہو سکتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر قرض مانگ کے شکریہ ادا کرتے تو محتاجی کی دلیل بن جاتا، مگر جب دیوار کو سونے کا بنا دیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بے نیاز ہیں حوصلے دیکھنا چاہتے ہیں۔

سرکارِ دو عالمؐ کی حیات کا ہر عمل مسلمان کے لیے نمونہ ہے، مسلمان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ حضورؐ نے یہ سارے اعمال اس لیے انجام دیئے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ زندگی کیسے گذاری جاتی ہے اور اس کے بعد قدم قدم پر امتحان بھی لیتے رہے کہ دنیا میں یہ ہوتا ہے۔

بچہ مکتب میں، اسکول میں داخل ہوا اور اس کے بعد آخر تک پڑھتا چلا جاتا ہے مگر تین مہینہ کے بعد، چھ مہینہ کے بعد، سال بھر کے بعد برابر امتحان بھی ہوتا رہتا ہے تاکہ بچّے کو معلوم تو ہو کہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اگر امتحان درمیان میں نہ ہو اور معلوم ہوا کہ بیس سال کے بعد اکٹھا امتحان ہو رہا ہے تو وہ بیچارہ آجتک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں بالکل کامیاب ہوں۔ بیس سال کے بعد معلوم ہوا کہ کچھ نہیں پڑھا تھا۔ تو پڑھانے والے کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وقتاً فوقتاً امتحان لیتا رہے تاکہ اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوتا رہے کہ اس سال فیل ہو گئے تو آئندہ پاس ہونے کی کوشش کرے۔ اس سال نمبر کم ہیں تو اگلے سال زیادہ ہوں۔ بس پروردگار عالم نے بھی یہی طریقہ کار پیغمبرؐ کے حوالے کیا، پیغمبرؐ! جب تم کو معلّم بنا کے بھیجا ہے تو معلّم کی ذمہ داری ہے کہ امتحان بھی لیتا رہے۔ کبھی مال سے امتحان لے۔ کبھی طاقت سے امتحان لے۔ کبھی کسی اور مسئلہ میں امتحان لے، تاکہ اُمّت کو احساس رہے کہ ہم ابھی کس مرحلۂ امتحان تک پہونچے ہیں۔ تربیت کا بہترین طریقہ یہی ہوتا ہے، اور اخلاق اور زندگی سنوارنے کا بہترین انداز یہی ہوتا ہے۔ اب جب بات یہاں تک آگئی ہے تو ایک فقرہ اور سُنیں، اس کے بعد منزلِ مصائب تک آنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان تاریخوں میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ پیغمبر اسلام کے اعمال و افعال کا قیاس دنیا کے لوگوں پر اور ان کی سیرت، ان کے اعمال کا قیاس لوگوں کے کردار پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مصلحتیں الگ ہوتی ہیں۔ آج کسی بھی طبیب، کسی حکیم، ڈاکٹر کے پاس آپ چلے جائیں اور کوئی بیماری ہلکی سی بیان کر دیں سر میں درد ہو رہا ہے اب وہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہوگی شاید آپ نے فلاں چیز کھالی ہوگی۔ شاید آپ دیر تک جاگے ہوں گے۔ شاید آپ نے کوئی بد پرہیزی کی ہوگی۔ شاید . . . شاید۔ اب کوئی وجہ تو ہوگی۔ بلا وجہ تو ہو نہیں سکتا ہے کوئی کام خلاف احتیاط جس کا نام بد پرہیزی ہے۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا جب ہی تو آپ بیمار ہو گئے۔ بیماری از خود تو آتی نہیں ہے۔ خدا نے جب بھیجا تھا تو

صحت دے کر بھیجا تھا، بیماری کو دے کر نہیں بھیجا تھا۔ اگر بیماری آئی ہے تو کوئی بنیاد ہوگی۔ کوئی وجہ ہوگی۔ کوئی سبب ہوگا۔ تو ہماری زندگیوں میں اگر بیماری داخل ہو تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہزار بدپرہیزی ہوتی ہے۔ ہزار بے احتیاطی ہوتی ہے۔ ہزار غلطیاں ہوتی ہیں۔ ہم تو کیسے بھی بیمار ہو سکتے ہیں لیکن جس کی زندگی میں غلطی کا کوئی امکان نہ ہو، جس کی زندگی میں بدپرہیزی کا کوئی تصور نہ ہو، جس کی زندگی میں بداحتیاطی کا کوئی خیال نہ ہو جس کی زندگی میں بھولے سے کچھ کھا لینے کا خطرہ نہ ہو، سہو نہیں، نسیان نہیں، خطا نہیں، غلطی نہیں، خلاف احتیاط نہیں، بدپرہیزی نہیں۔ تو اس کی صحت کو ایسا نمونہ ہونا چاہیے کہ ساری زندگی میں کبھی دردسر بھی نہ ہوتا۔ اس لیے کہ کوئی بدپرہیزی نہیں۔ کوئی غلطی نہیں۔ کوئی خطا نہیں۔ یہ تو ہم آپ کرتے ہیں جو نہیں جانتے ہیں کہ کیا کھانا چاہیے، کیا نہیں کھانا چاہیے۔ کیا مفید ہے، کیا مضر ہے۔ کیا اچھا ہے، کیا بُرا ہے۔ مگر کیا پیغمبرؐ کے یہاں بھی یہ سب ہوگا؟ اور اگر نہیں تو پیغمبرؐ کو کوئی بیماری ہونی نہیں چاہیے۔ مگر پھر حیاتِ پیغمبرؐ میں بیماری بھی دیکھتے ہیں تو آخر پیغمبرؐ کی حیات میں بیماری کیوں آ گئی۔ اگر اب تک آپ وہ ساری بات سمجھ گئے ہیں کہ حیاتِ پیغمبرؐ میں تجارت کیوں آ گئی۔ حیاتِ پیغمبرؐ میں مزدوری کیوں آ گئی۔ حیاتِ پیغمبرؐ میں قرض مانگنا کیوں آ گیا۔ حیاتِ پیغمبرؐ میں مدد مانگنا کیوں آ گیا۔ تو یہ نکتہ بھی سمجھ میں آجائے گا اس لیے کہ اس کی بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ ہم نے تاریخ میں تین بیماریاں دیکھیں اور سب کے بیمار ایسے جہاں خطا کا کوئی امکان نہیں۔ کسی کے سر میں درد دیکھا۔ کسی کی آنکھ میں تکلیف دیکھی اور کسی کو بخار میں مبتلا دیکھا۔ تین بیمار دیکھے اور تینوں معصوم۔ جہاں نہ بدپرہیزی، نہ خطا، نہ غلطی۔ مگر اس کے بعد بھی اِن کے سر میں درد۔ اُن کی آنکھوں میں تکلیف۔ وہ بخار میں مبتلا۔ خدایا یہ بیماری کہاں سے آ گئی۔ یہ بیماری کیوں آئی۔ پروردگار نے کہا یہ بیماری بدپرہیزی سے نہیں آئی ہے۔ بداحتیاطی سے نہیں آئی ہے۔ یہ مرض تمہارا مرض نہیں ہے۔ تو آخر ان کی زندگی میں مرض آیا کیوں؟ کہا اس کی بھی اپنی مصلحتیں ہیں۔ اگر میری مصلحتوں کو پہچاننا چاہتے ہو تو۔ لو پہچانو کہ اگر انھیں دردسر نہ ہوتا تو جتنی دیر دردسر رہا اس میں جو جو کام ہوتے سب کا ذمہ دار انھیں کو بنا دیا جاتا۔ میں نے دردسر میں اسی لیے

مبتلا کر دیا تاکہ یہ کسی کے عمل کے ذمہ دار نہ بننے پائیں۔ اگر اُن کی آنکھوں میں تکلیف نہ ہوتی تو لوگ کہتے علم پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے لوگ سمجھیں کہ علم انھیں تلاش کر رہا تھا۔ اسی لیے آشوب چشم میں وہ ڈھونڈھتے نہیں آئے کہ بھائی علم کہاں بٹ رہا ہے۔ علم کہاں تقسیم ہو رہا ہے۔ حضورؐ کہاں ہیں۔ پرچم کہاں ہے۔ رایت کہاں ہے۔ ذرا وہ جگہ بتاؤ ہم بھی چل کے اپنا نام لکھوا دیں۔ تاریخ میں ایسا کوئی فقرہ نہیں ہے۔ وہ تو آشوب چشم میں ہیں، ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں وہ کہاں ہیں، یعنی اگر ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے تو میری نگاہیں تو دیکھ رہی ہیں۔ اور ایسے دیکھ رہی ہیں کہ کہیں ٹھہر نہیں رہی ہیں۔ تو جب عظمتِ پیغمبرؐ کا اظہار کرنا ہوا تو پیغمبرؐ کو دردِ سر میں مبتلا کر دیا۔ اور جب عظمتِ علیؑ کا اظہار کرنا ہوا تو انھیں آشوبِ چشم میں مبتلا کر دیا۔ اب اگر یہ بچے بیمار نہ ہوتے تو نذر کیسے ہوتی، اور اگر نذر نہ ہوتی تو روزے کیسے ہوتے، اور اگر روزے نہ ہوتے تو وقت افطار کیسے آتا، اور اگر وقت افطار نہ آتا تو یتیم و مسکین و اسیر کیسے مانگنے آتے، اور اگر یہ سب نہ آتے تو سورۂ ھَلْ اَتیٰ کو لوحِ محفوظ سے اُترنے کا راستہ کیسے ملتا۔

تو پیغمبرؐ کسی شئے کا مطالبہ کرتا ہے تو پیغمبرؐ کسی بات کا محتاج نہیں ہے۔ پیغمبرؐ اگر یہ فرما رہا ہے کہ میرے اہلبیتؑ سے محبت کرو تو کیا محبت اہلبیتؑ کریں گے تو اپنی عاقبت بنائیں گے۔ پیغمبرؐ کو کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کو انعام ملنے والا نہیں ہے۔ لیکن پیغمبرؐ یہ حکم دے رہے ہیں کہ دنیا کو خود اندازہ ہو جائے کہ کون میری قدر جانتا ہے اور کون قدر نہیں جانتا ہے۔ کون میری محنتوں کی قدر و قیمت کو پہچانتا ہے اور کون نہیں پہچانتا ہے۔ لہٰذا حضورؐ کے اعمال کی مصلحتیں الگ ہیں اور دنیا کے اعمال کی بنیادیں الگ ہیں۔

اب بات چونکہ میں نے نصرت ہی سے شروع کی تھی۔ جب تبلیغ کا پہلا دن تھا تو اس حقیقت سے دنیا کا کوئی انسان نہ مسلمان نہ غیر مسلم ابھی تک انکار نہیں کر سکا کہ جب حضورؐ نے پہلے پہل مطالبہ کیا تو مدد کا مطالبہ کیا اور اس وقت کوئی دنیا میں پیغمبرؐ کا مدد کرنے والا نہیں تھا سوائے ایک انسان کے۔ دعوت ذوالعشیرہ کسی کتاب میں آپ پڑھیں۔ حضورؐ نے پیغام سنایا اور پیغام سنانے کے بعد فرمایا کون ہے جو میرا بوجھ اٹھائے گا؟

یہ پہلا مطالبہ تھا۔ اُس دن پیغمبرؐ کا کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا سوائے اس کمسن شہزادے کے جو اُٹھ کے کہتا ہے "اَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" میں موجود ہوں۔ مدد مانگنے والا پیغمبرؐ، مدد کرنے والا علیؑ۔ یعنی تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ جب وقت نصرت آیا تو مدد لینے والا پیغمبرؐ تھا اور مدد کرنے والا علیؑ۔ اس کے بعد پھر دوبارہ جانِ پیغمبرؐ سامنے آیا اور اس نے مطالبۂ نصرت کیا تو یہاں بھی بنی ہاشم میں جو پہلے سامنے آیا وہ بھی ایک علیؑ تھا۔ اصحاب کی قربانی کے بعد انصار کے راہ خدا میں کام آجانے کے بعد اب وہ وقت آیا ہے جب بنی ہاشم قربان ہوں گے۔ اولاد ابو طالبؑ قربان ہوگی۔ اپنی گود کے پالے قربان ہوں گے تو ایسے وقت میں ایک مرتبہ فرزند رسولؐ نے مڑ کے اپنے کڑیل جوان کو دیکھا "تَقَدَّمْ وَلَدِیْ"۔ بیٹا اب تم آگے بڑھو۔ علی اکبر اب تم جاؤ۔ اب حسینؑ اپنے کڑیل جوان کو قربان کرنے جا رہے ہیں۔ مگر ابھی تک تو یہ ہو رہا تھا کہ جو میدان میں جا رہا ہے وہ مولاؑ سے آکے اجازت مانگ رہا ہے۔ حبیب، زہیر، مسلم، بریر، چاہنے والے، جاں نثار جو بھی آیا آقا اجازت دیجئے میدان میں جاؤں۔ یہ شاید پہلا اور آخری واقعہ ہے کربلا میں جب حسینؑ نے اجازت دینے کے بعد بھی یہ فرمایا کہ بیٹا مگر خیمہ میں جاؤ۔ فرق محسوس کیا آپ نے۔ عون و محمد جا رہے ہیں۔ شہزادی خود لے کے آئی ہیں۔ بھیّا میرے گود کے پالوں کو اجازت دیدیجئے۔ قاسم کو میدان میں جانا ہے۔ قاسم خود آئے۔ مولاؑ مجھے میدان میں جانے دیجئے۔ عباس علمدار کو میدان میں جانا تھا۔ آئے آقا مجھے اجازت دیجئے۔ مگر نہ جانے کیا مصلحتِ امامت تھی کہ علی اکبر سے خود فرمایا بیٹا تم میدان میں جاؤ، مگر پہلے خیمہ میں جاؤ۔ باپ کا حکم ملا۔ علی اکبر خیمہ میں آئے پھوپھی کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ جس نے اتنے دنوں ناز و نعم سے پالا تھا وہ علی اکبر کی اداؤں کو نہ پہچانے گی تو کون پہچانے گا۔ بیٹا خیر تو ہے، کیسے آنا ہوا؟ پھوپھی اماں اب وقت آگیا ہے میری قربانی کا۔ بابا نے فرمایا ہے کہ جاؤ خیمہ سے رخصت ہو کر آؤ۔ اب آپ فرمائیں۔ ثانی زہراؑ سر سے پیر تک علی اکبر کو دیکھ رہی ہیں۔ کبھی علی اکبر کو دیکھتی ہیں، کبھی بھائی کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ ہائے علی اکبر تمھیں کیسے جانے دوں، مگر علی اکبر تم نہ جاؤ گے تو میرے بھیّا پر قربان کون ہوگا۔ نہ جانے کیا علی اکبر نے کیا کہا کیا ثانی زہراؑ

نے سوچا۔ بعض روایات میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ثانی زہراؑ نے کچھ دیر تکلّف فرمایا اور کوئی جواب نہ دیا تو علی اکبر نے کہا کہ پھوپھی اماں اگر آپ اجازت نہ دیں گی تو میں نہ جاؤں گا۔ مگر یہ بتائیے کہ اگر محشر میں دادی نے پوچھ لیا کہ علی اکبر زیادہ عزیز تھا یا حسینؑ، تو میں تو کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔ آپ فرمائیے کہ آپ کیا جواب دیں گی؟ بس یہ سُننا تھا کہ شہزادی نے فرمایا بیٹا جاؤ۔ جلدی جاؤ۔ میرے مانجائے پر قربان ہو جاؤ۔ زینبؑ کی ایک آرزو ہے جتنی دیر میرا مانجایا زندہ رہ سکے زینبؑ کے پاس جو کچھ ہے سب اس راہ میں قربان ہے۔

عزیزو! آج کی صورت حال پچھلے دنوں سے قدرے مختلف ہے۔ کل تک یہ جملہ میں نے نہیں کہا تھا لیکن آج یہ جملہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ میرے سامنے جو مجمع بیٹھا ہوا ہے ان ہزاروں افراد میں اکثریت تو جوانوں کی ہے۔ تمھیں تو اندازہ ہے عزیزو! جوانی کسے کہتے ہیں۔ تمھیں تو اندازہ ہے کہ جوانی کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ جوانی میں آدمی مرنا چاہتا ہے یا زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مگر نہ جانے کربلا میں کون سا وقت آگیا تھا کہ کڑیل جوان قربان ہونے کے لیے بے چین ہے۔ علی اکبر نے پھوپھی کو سلام کیا۔ خیمہ سے چلنا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ بیبیاں آگے بڑھیں۔ کہا علی اکبر ہم سمجھ گئے کہ اب تم جا کے واپس نہ آؤ گے۔ ایک لمحہ کے لیے ٹھہر جاؤ۔ علی اکبر نے کہا بیبیو! کیا کہنا ہے، جلدی کہو، مجھے جانے دو۔ میرا بابا اکیلا رہا جا رہا ہے۔ چاہنے والے قربان ہو چکے ہیں۔ بیبیوں نے کہا، علی اکبر ٹھہرو! سیدانیوں نے حلقہ بنایا۔ سیدانیوں کے حلقہ میں، درمیان میں علی اکبر ہیں۔ اکبر تبہ بیبیوں نے کہا، علی اکبر! تم جاتے ہو تو جاؤ، ہم روک نہیں سکتے۔ لیکن علی اکبر! اِرحم غُربَتنَا'' ہماری غربت پر رحم کرنا، ہماری بیکسی پر رحم کرنا، اب ہمارا کون رہ گیا ہے سبھی تو قربان ہوئے جا رہے ہیں۔ بس یہ سُننا تھا کہ علی اکبر نے کہا بیبیو! تمھیں اپنی غربت کا خیال ہے میرے بابا کی غربت کا خیال نہیں ہے؟ جاؤ علی اکبر جاؤ۔ علی اکبر چلے خیمہ کے در کے قریب آئے۔ درِ خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ کسی نے بڑھ کے دامن تھام لیا۔ واپس آگئے۔ مورخ کربلا کہتا ہے کہ بار بار علی اکبر خیمہ سے نکلنا چاہتے ہیں، کوئی روک لیتا ہے تو رُک جاتے ہیں۔

سات مرتبہ خیمہ کا پردہ اُٹھا اور گرا اور اب جو علی اکبر خیمہ سے باہر نکلے تو جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

اولاد والو! میں نے مقتل میں کوئی جملہ تو نہیں دیکھا لیکن جی چاہتا ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ سوچیں۔ یہ کون ہے جو بار بار علی اکبر کو روک رہا ہے۔ میں نہیں جانتا اتنا سوچ رہا ہوں کہ اگر کسی بزرگ نے روکا ہوتا تو بازو تھاما ہوتا۔ یہ کون ہے جو بڑھ کے دامن کھینچ لیتا ہے عجب نہیں چھوٹی بہن نے کہا ہو بھیا۔ اب تم بھی جا رہے ہو۔ علی اکبر اب بتاؤ ان بیبیوں کا کون پُرسانِ حال ہوگا۔ آئے اپنے بابا کے سامنے۔ حسینؑ نے اپنے کڑیل جوان کو سجایا۔ بازو تھام کے گھوڑے پر بٹھایا۔ کہا جاؤ بیٹا خدا حافظ۔ مگر میرے لال ایک بات کا خیال رکھنا جب تک میرا تمھارا سامنا رہے۔ مُڑ مُڑ کے مجھے دیکھتے رہنا۔ علی اکبر میدان کی طرف جا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ قدموں کی آہٹ محسوس کی مُڑ کے دیکھا۔ ضعیف باپ کمر تھامے چلا آرہا ہے۔ بابا آپ نے تو رخصت کر دیا تھا۔ اب میدان میں کیوں آرہے ہیں؟ کہا بیٹا اگر تم صاحبِ اولاد ہوتے تو یہ اندازہ ہوتا کہ جوان کو رخصت کرنے کے بعد ضعیف باپ کا کیا عالم ہوتا ہے۔ اکبر میدان میں آئے۔ جہاد کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پلٹ کے آئے بابا کے سامنے آ کے کھڑے ہو گئے۔ اتنا بڑا کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ مگر علی اکبر کوئی انعام مانگنے نہیں آئے ہیں۔ عجب سوال کیا ہے بابا پیاس مارے ڈالتی ہے۔ کیا ایک گھونٹ پانی کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے۔ ہائے جس کا چھ مہینہ کا بچہ پیاس سے جاں بلب ہو وہ کیا کرے۔ کہا علی اکبر اپنی زبان میرے دہن میں دے دو شاید کچھ تسکین ہو جائے۔ علی اکبر نے زبان باپ کے دہن میں دی اور فوراً کھینچ لی۔ اے بیٹا یہ کیا؟ کہا بابا آپ کی زبان میں تو کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ کہا اچھا بیٹا تو جاؤ اب ساقیٔ کوثر تمھیں سیراب کریں گے۔ علی اکبر میدان میں آئے۔ جہاد کرتے رہے۔ جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگے تو بابا کی بیکسی کا خیال آیا یہ نہ کہا کہ بابا آؤ۔ کہا بابا آخری سلام لے لو۔ حسینؑ نے کمر کو کس کے باندھا مقتل کا رُخ کیا۔ یا علی بیٹا کہاں ہو۔ اے میرے لال اب کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ بیٹا کہاں ہو۔ چلتے چلتے کڑیل جوان کے سرہانے

پہونچے۔ سر اُٹھا کے زانو پر رکھا باپ اپنے بیٹے کو دیکھ رہا ہے۔ بیٹا باپ کو دیکھ رہا ہے۔ ہائے حسینؑ کی بیکسی۔ ایک مرتبہ حسینؑ نے دیکھا کہ علی اکبرؑ کے کراہنے کی آواز کانوں میں آرہی ہے۔ بیٹا کیا سینہ میں تکلیف ہے۔ بیٹا یہ سینہ پر ہاتھ کیوں رکھا ہے۔ علی اکبر ذرا اپنے ہاتھوں کو ہٹاؤ۔ علی اکبر کیا جواب دیں۔ باپ کے سامنے زخم جگر کو کیسے پیش کریں۔ خاموش ہیں۔ کوئی جواب نہیں دیتے۔ ایک مرتبہ حسینؑ نے ہاتھ تھام کے ہٹایا۔ خون کا فوّارہ جاری ہوا دیکھا۔ برچھی کا پھل کڑیل جوان کے سینہ میں ٹوٹ کے رہ گیا ہے۔ ہائے باپ اس منظر کو کیسے برداشت کرتا۔ آستینوں کو اُلٹا۔ نوکِ سناں کو تھاما۔ حسینؑ نے آواز دی بابا آؤ میرا دل سنبھالو۔ یا علیؑ۔ یہ کہہ کر اب جو برچھی کا پھل نکالا۔ علی اکبر کا دم ٹوٹ گیا۔ اب حسینؑ کیا کریں۔ لاشہ اُٹھانا چاہتے ہیں ضعیفی میں کڑیل جوان کا لاشہ نہ اٹھا۔ آواز دی بنی ہاشم کے بچّو آؤ جوان کا لاشہ ہے۔ اب جو مڑ کے دیکھا، دیکھا بہن سرہانے کھڑی ہے۔ اے بہن تم کیوں آگئیں؟ کہا بھیّا:

لاشہ ہے برابر کا بھائی سے نہ اُٹھے گا
میں پالنے والی ہوں گودی میں اُٹھا لوں گی

مجلس نمبر ۱۰

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ!

"صاحبانِ ایمان وتقویٰ وہ ہیں جو اس رسول نبیؐ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی۔ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے، بُرائیوں سے روکتا ہے۔ طیّبات کو حلال قرار دیتا ہے۔ خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ انسانیت کو ان تمام زنجیروں سے آزادی دلاتا ہے جن زنجیروں میں عالم انسانیت جکڑا ہوا تھا۔ پس جو لوگ اس پیغمبرؐ پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کا احترام کیا، اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے یہی لوگ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہیں۔"

آیۂ کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ کلام آغاز عشرۂ محرم کے ساتھ رسالت الٰہیہ کے عنوان سے شروع ہوا تھا اس کے دسویں مرحلہ پر آج کچھ باتیں اس بنیادی مسئلہ سے متعلق گذارش کرنا ہیں جس مسئلہ کے لیے یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی ہے۔

آیت کا آغاز بھی اتباع پیغمبرؐ سے ہوا ہے اور آیت کے اختتام پر بھی اتباع

ابتدا میں یہ اعلان ہوا کہ صاحبانِ ایمان و تقویٰ وہ ہیں جو رسولؐ نبیِ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں۔ ایمان کی پہچان ہے پیغمبرؐ کا اتباع۔ تقویٰ کی علامت ہے پیغمبرؐ کا اتباع۔ اور خاتمۂ کلام میں پھر یہ اعلان ہوا کہ وہ لوگ جو پیغمبرؐ پر ایمان لائے، جنھوں نے پیغمبرؐ کا احترام کیا اور پیغمبرؐ کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے یہی لوگ فلاح پانے والے، نجات حاصل کرنے والے اور کامیاب لوگ ہیں۔

آیت کی ابتدا اور انتہا دونوں مراحل پر سارا زور مسئلۂ اتباع پر دیا گیا ہے۔ یہاں اس نکتہ پر توجہ دینا ضروری ہے کہ ابتدا بھی اتباع ہے اور انتہا بھی اتباع ہے۔ مگر دونوں اتباع میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں نبیؐ کے اتباع کی بات کہی گئی تھی اور انتہا میں اس نور کے اتباع کی بات کہی گئی ہے جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ میں فی الحال اس بحث کو نہیں چھیڑ سکتا کہ وہ نور جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے اس سے مراد کون ہے۔ اتنا بہرحال طے ہے کہ آیت کے اس ٹکڑے سے نبیؐ مراد نہیں ہیں یعنی جب پروردگار یہ کہہ رہا ہے کہ نبیؐ پر ایمان لائے۔ نبیؐ کا احترام کیا۔ نبیؐ کی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو کیا اس کے بعد بھی کوئی امکان ہے کہ کوئی سوچے کہ اس سے مراد بھی حضورؐ ہی ہوں گے۔ یعنی حضورؐ ایک ایسا نور ہیں جو خود ہی اپنے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ حضورؐ کی نورانیت میں شک کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ حضورؐ کی نورانیت میں شبہ پیدا کرنا مسلمان اور مومن کا کام نہیں ہے۔ وہ طے شدہ مسئلہ ہے لیکن بہرحال کوئی اور نور بھی ہے جس کی علامت یہ ہے کہ وہ نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ بظاہر بہت آسان سی بات تھی، ہر مفسّر نے جب قلم اٹھایا تو کہا اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ میں انکار نہیں کرسکتا کہ اس سے مراد قرآن مجید نہیں ہے۔ مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ قرآن نے تو خود بھی اپنے نازل ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر قرآن مجید کے نزول ہونے کے بارے میں ہمارا آپ کا کوئی بیان ہوتا تو ہم جو چاہتے کہتے، لیکن قرآن مجید نے جابجا خود اپنے نازل ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ میں سارے تذکرے نہیں سناؤں گا، بس دو آیتیں سن لیجئے مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ایک مقام پر اعلان ہوتا ہے "قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" دیکھو تمھارے پاس خدا کی طرف سے بُرہان آیا ہے۔ "وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا" اور ہم نے تمھاری طرف نور نازل کیا ہے۔ اس نور سے مراد کیا ہے۔ قرآن۔ تو قرآن نازل ہوا تمھاری طرف۔ کہاں نازل ہوا؟ "نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ" پیغمبرؐ! یہ قرآن وہ ہے جو جبرئیلؑ کے ذریعہ آپ کے دل پر اُتارا گیا ہے۔ تو یہ قرآن وہ ہے جو اُدھر سے آیا ہے نبیؐ کے دل پر اُتارا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ جو فرش پر آکے بیٹھے ہیں تو فرش اپنے ساتھ لے کر نہیں آئے ہیں، فرش پہلے آپ بعد میں۔ جب ہی تو آپ فرش پر آکے بیٹھے ہیں۔ تو "فرش پر" آنے کے معنی ہیں کہ فرش پہلے ہو، اور آپ بعد میں آئیں۔ ورنہ یہ کہا جائے گا کہ فلاں صاحب اپنا سامان اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اب پروردگار یہ کہہ رہا ہے کہ قرآن وہ ہے جو ہم نے جبرئیل کے ذریعہ نبیؐ کے دل پر اُتارا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دل پہلے تھا اور نزولِ قرآن بعد میں ہوا ہے اور اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ نجات ان کے واسطے ہے جو اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ قرآن تو وہ نور ہے جو نبیؐ پر نازل کیا گیا ہے اب کوئی ایسا نور بھی تلاش کرو جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہو۔

میں تو نہیں جانتا وہ کون سا نور ہے جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ میں تو حضورؐ کے علاوہ کسی کو نور سمجھتا ہی نہیں۔ دوسرا کون ہوگا جو حضورؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ میری نگاہ میں سوائے نبیؐ کے اور کوئی نور نہیں ہے، اور اگر کوئی ہوگا تو نبی ہی کا کوئی ٹکڑا ہوگا۔ نبیؐ سے ہٹ کے نورانیت کہیں نہیں ہے۔ جہاں بھی نورانیت پائی جاتی ہے وہ نبیؐ ہی کا کوئی جزو ہوگا۔ اب اگر حضورؐ ہی کہہ دیں کہ ہم دونوں ایک نور سے ہیں۔ اگر حضورؐ ہی کہیں کہ خدا نے ایک نور کے دو ٹکڑے کیے ہیں۔ اگر رسول ہی کہیں کہ خدا نے ایک نور کے چودہ ٹکڑے کر دیے ہیں تو یہ سب اجزائے نورِ پیغمبرؐ ہیں۔ یہ الگ کوئی نور نہیں ہیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ کُل آجائے اور جزو ساتھ نہ آئے۔ آپ کا ہاتھ آپ کا جزو ہے۔ اگر آپ مجلس میں آئے تو ہاتھ کہیں رکھ کے نہیں آئے ہیں۔ جب آئیں گے تو

ہاتھ آپ کے ساتھ آئے گا۔ سر آپ کے ساتھ آئے گا۔ آنکھیں آپ کے ساتھ آئیں گی۔ تو جو بھی آپ کے اجزا ہیں وہ آپ کے ساتھ ہی آئیں گے۔ تو جنھیں اللہ نے جزو نورِ پیغمبرؐ بنایا ہے وہ تو یقیناً وہ نور ہے جو رسولؐ کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اب اس کے بعد باقی انوار کے لیے تو آپ کو ثابت کرنا ہوگا ہم تو قرآن کے الفاظ کو پہچانتے ہیں، ہمیں کسی کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ "ہمارے سمجھنے کے لیے قرآن ہی کافی ہے"۔

اب بات آگئی ہے تو ایک لفظ پر آپ اور توجہ دیں، اس کے بعد میں مسئلہ کو عرض کرنا چاہتا ہوں جس کو آج گذارش کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مسئلہ کو اختصار کے ساتھ عرض کرنا ہے۔ اس لیے کہ یہ شب ایسی ہے کہ جس میں تذکرۂ مصائب ذرا تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔ لہٰذا میں اس تذکرہ کو اجمالاً آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔

بات کہاں سے شروع ہوئی ہے اس رسولؐ کا اتباع کرنا ہے جس کے یہ اوصاف ہیں۔ جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ اس کے یہ کمالات ہیں، یہ اعمال ہیں۔ اس کی یہ شریعت ہے۔ اس کا یہ قانون ہے۔ مگر وہ ہے رسول۔ کسی کو رسول ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ پہلے خدا کو مانا جائے۔ رسول کوئی آج تک گھر میں نہیں بنا۔ رسول کے تو معنی ہی ہیں "پیغامبر" پیغام لے جانے والا۔ تو کوئی پیغام دینے والا ہوگا تو کوئی پیغام لے جانے والا ہوگا۔ اسی لیے ہم بار بار دوہراتے ہیں "اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ" وہ اللہ کے رسول ہیں تو اس وقت تک کوئی رسول نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے پہلے اس کا کوئی خدا نہ ہو۔ تو کسی کے رسول ہونے پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پہلے اس خدا پر ایمان لایا جائے جس نے اس کو رسول بنایا ہے۔ اسی لیے ابھی تک بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ رسالت کسی کمیٹی میں طے نہیں ہوتی۔ ابھی تک کوئی ایسی انجمن نہیں بنی ہے جو رسول بناتی ہو۔ یہ کام تنہا خدا کا ہے۔ سب کچھ بنانے والی انجمنیں بن گئیں ابھی رسول بنانے والی کوئی انجمن نہیں بنی۔ یہ کام صرف خدا کا ہے تو رسول ماننے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو مانا جائے۔ رسولؐ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ خدا پر پہلے ایمان لایا جائے کہ کوئی خدا ہے جس کا پیغام ہے اور یہ پیغام کے لے جانے والا ہے۔

تو خدا کہتا ہے کہ اس نبی کا اتباع کرنا ہے جو میرا رسول ہے۔ تو پہلے خدا کو ماننا ہے اس کے بعد نبیؐ کو ماننا ہے۔ پہلے خدا پر ایمان لانا ہے اس کے بعد نبیؐ پر ایمان لانا ہے۔ پہلے خدا کی اطاعت کرنا ہے اس کے بعد رسولؐ کا اتباع کرنا ہے۔ تو جب تک رسول کی بات ہو رہی تھی دو مسئلہ تو طے ہو گیا کہ رسولؐ کا اتباع کرنے والا وہ ہے جو خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ نبیؐ پر ایمان رکھتا ہے۔ مگر خدا اس کی کامیابی کا اعلان نہیں کر رہا ہے۔

ایمان باللہ طے ہو گیا۔ اتباعِ پیغمبرؐ طے ہو گیا۔ مگر ابھی فلاح و کامیابی کا اعلان نہیں ہو رہا ہے۔ ابھی نجات کا اعلان نہیں ہو رہا ہے۔

نجات کا اعلان کب ہو گا؟ جب اس نور کا اتباع کیا جائے جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو جو بھی یہ نور ہو میں نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ تنہا خدا کا مان لینا نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ تنہا رسولؐ کا اتباع کر لینا نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ کسی ایسے نور کا بھی اتباع کرنا پڑے گا جو نبیؐ کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ تو نہ وحدہٗ لاشریک کا تنہا کلمہ کافی ہو گا نہ رسالت کا کلمہ تنہا کافی ہو گا۔ ایک کوئی اور ماننا پڑے گا جس پر اتنے اتباع کے بعد بھی نجات کا دارومدار ہے، اب جو بھی آپ چاہیں مُراد لیں۔ لیکن اتنا تو کم سے کم تسلیم کریں کہ نجات کا دارومدار تین چیزوں پر ہے۔ خدا کو مانا جائے پھر نبیؐ کو مانا جائے اور اس نور کو مانا جائے جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ قرآن نے دو کے ماننے پر کامیابی کا اعلان نہیں کیا جب تک تیسرے کی بات نہیں آئی اس وقت تک نجات کا اعلان نہیں ہوا۔

آپ سے متعلق جو مسئلہ تھا وہ میں نے گذارش کر دیا۔ اب ایک جملہ ان مفسّرین کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتا ہوں جن کا اصرار اس بات پر ہے کہ اگرچہ خدا نے کہا کہ نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے مگر ساتھ سے مراد یہ ہے کہ نبی پر نازل کیا گیا ہے۔ مجھے نہ کوئی انکار ہے نہ مجھے کوئی بحث کرنا ہے۔ جو بھی مُراد ہو۔ اس سے مُراد ہے قرآن مجید۔ تو اللہ نے یہ کیوں کہا کہ نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اپنے بندوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگرچہ بظاہر جبرئیل امینؑ نے نبیؐ کے دل پر قرآن اُتارا ہے مگر جبرئیلؑ کو یہ خیال نہ پیدا

ہو جائے کہ نبیؐ کو پہلے یہ قرآن نہیں دیا گیا تھا۔ قرآن وہ نور ہے جو نبیؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہ جبرئیلؑ جو آیتیں لے کر آئے ہیں اور جو نبیؐ پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ نبیؐ پر نازل ہونا ایک ظاہری طریقۂ کار ہے ورنہ اصل قرآن تو نور ہے جو حضورؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ جب حضورؐ آئے تو اپنا نور یعنی اپنا قرآن اپنے ساتھ لے کر آئے۔ یہ عالم اسلام کے مفسرین نے ہم کو سمجھایا اور ہم سمجھ گئے مگر کہنے والے خود نہ سمجھے۔ انھوں نے ہم کو سمجھایا کہ نور سے مُراد ہے قرآن، ساتھ سے مُراد ہے ساتھ۔ یعنی قرآن کی دو حیثیتیں ہیں ایک طرف یہ آیتیں ہیں جو نبیؐ پر آئی ہیں، ایک طرف پورا قرآن ہے جو نبیؐ کے ساتھ آیا ہے۔ جب بھی خدا نے پیغمبرؐ کو وہاں سے بھیجا تو سارا قرآن ساتھ کر دیا۔ اب اس کے بعد تو صرف سرکاری کارروائی باقی رہے گی کہ جبرئیلؑ آیتیں لے کر نازل ہوتے رہیں گے اور حضورؐ کے قلب پر آیتیں نازل ہوتی رہیں گی ورنہ اصلی قرآن حضورؐ کے ساتھ آیا ہے۔ میں بار بار اس لفظ کو اس لیے دوہرا رہا ہوں تاکہ آپ یہ اندازہ کر لیں کہ جو ہمیں سمجھا رہے تھے کہ قرآن حضورؐ کے ساتھ نازل ہوا ہے وہ خود نہ سمجھے۔

عزیزو! اگر ساتھ نازل ہونے والا قرآن نبیؐ کے ساتھ آیا ہے تو جس دن جبرئیلؑ آ کے کہہ رہے تھے کہ پڑھو۔ اُس دن پھر یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اُس دن یہ کہنے کے کیا معنی ہیں کہ میں کیا پڑھوں۔ مجھے خبر ہی نہیں ہے۔ آپ تو اپنا قرآن ساتھ لے کر آئے ہیں۔ آپ کو کیسے خبر نہیں ہے۔ تو دو ہی باتیں ہیں یا یہ کہو کہ یہ کوئی دوسرا نور ہے جو نبیؐ کے ساتھ نازل ہوا ہے اور اگر یہ قرآن ہی ہے تو کم سے کم اتنا تو مانو کہ نبیؐ جب بھی دنیا میں آئے ہیں جاہلِ قرآن بن کے نہیں آئے ہیں وہ پہلے دن بھی جاہل نہیں تھے اور چالیس برس کے بعد بھی جاہل نہیں تھے۔ وہ پہلے دن اپنا قرآن اپنے ساتھ لے کر آئے تھے ان کے یہاں جہالت کا گذر نہیں ہے۔ اور اگر یہ نکتہ واقعًا سمجھ لیا ہے کہ قرآن نبیؐ کے ساتھ آیا ہے۔ نبیؐ اپنا علم قرآن ساتھ لے کر آئے ہیں۔ اپنا قرآن اپنے سینہ میں لے کر آئے ہیں تو جو یہ کہے کہ نبیؐ کو چالیس سال تک قرآن نہیں معلوم تھا اسے صحیح نہ کہو کم سے کم صحیح کو غلط مت سمجھو اور جس کتاب میں اُس کا تذکرہ ہو

اس کتاب کو بھی غلط کہو صحیح نہ کہو۔

جو قرآن مجید کے خلاف بیان دے کیا وہ بھی صحیح ہو گا۔ اگر وہ صحیح ہے تو قرآن غلط ہو گا۔ اور قرآن صحیح ہے تو اس سے ٹکرا جائے وہ صحیح نہیں ہے۔ دو میں سے ایک ہی کو صحیح ماننا ہو گا یا اپنی سمجھ میں اتنی وسعت پیدا ہو جائے کہ دونوں لڑتے بھی رہیں گے ایک دوسرے کو قتل بھی کرتے رہیں گے اور یہ بھی سچّے رہیں گے وہ بھی سچے رہیں گے۔

اگر اتنی "ظرف میں وسعت" پیدا ہو جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم جیسے سادہ سمجھنے والے اتنا جانتے ہیں کہ جب دو میں ٹکراؤ پیدا ہو گا تو دو میں سے ایک ہی صحیح ہو گا۔ اب یہ اختیار آپ کے ہاتھوں میں ہے چاہے اسے صحیح کہیں یا اُسے صحیح کہیں۔

بہر حال نجات کا دار و مدار اس نور کے اتباع پر ہے جو حضورؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔

اب میں مسئلہ اتباع کے بارے میں چند لفظیں گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن مجید کی پانچ آیتیں ہیں اور شاید ایک دس منٹ کے اندر اس بات کو مکمل کر لوں گا۔ لیکن آپ کی توجہ درکار ہے۔

یہ اتباعِ پیغمبرؐ کیا ہے؟ اتباع کا کمال کیا ہے؟ اتباع کی شان کیا ہے؟ اتباع کا اثر کیا ہے؟

پروردگار عالم نے جناب عیسیٰؑ سے وعدہ کیا۔ عیسیٰؑ تم جاؤ ہمارے دین کی تبلیغ کرو۔ ہمارا پیغام پہونچاؤ۔ لوگ یہ گھبرائیں گے کہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں اگر ہم نے عیسیٰؑ کو مان لیا تو کہاں یہ طاقت یہودیوں کی اور کہاں ہم بیچارے۔ ہمارا کیا حشر ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اُس دور میں یہودی ایک بڑی طاقت تھے۔ اتنی بڑی طاقت کہ جناب مریمؑ جناب عیسیٰؑ کو لے کر آئیں تو ان پر بھی الزام لگا دیا۔ ایسی بے ایمان قوم۔ ایسے ناہنجار افراد۔ ان کے سامنے عیسیٰؑ پر کوئی ایمان لائے گا تو اس غریب کا حشر کیا ہو گا۔ لہٰذا عیسیٰؑ ہم یہ جانتے ہیں کہ لوگ گھبرائیں گے، تم کو نہ مانیں گے، تم پر ایمان نہ لائیں گے۔ تو ہمارا وعدہ انھیں سُنا دینا کہ ہم نے تمھیں جو مرتبے دیئے ہیں، جو تمھیں کرامت دی ہے، جو

تمھیں کمال دیا ہے اس میں سے ایک یہ ہے کہ "جَاعِلُوا الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ"۔ جو تمھارے اتباع کرنے والے ہیں ہم انھیں کافروں پر ہمیشہ مسلّط رکھیں گے قیامت تک۔

یہ خدا کا وعدہ ہے۔ اب جو جناب عیسیٰؑ نے اس وعدے کو دہرایا تو اب کون گھبرائے گا ایمان لاتے ہوئے۔ جب خدا نے یہ کہہ دیا کہ وہ پیروی کرنے والوں کو کافروں سے، یہودیوں سے ہمیشہ اونچا رکھے گا "اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ" قیامت تک۔ اب کس بات کی گھبراہٹ ہے۔ مگر اس کے بعد بھی لوگ گھبرا رہے ہیں اس لیے کہ اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے خدائی وعدہ تو ہے کہ ہم اتباع کرنے والوں کو کافروں سے بالاتر رکھیں گے۔ لیکن اطمینان اسے ہوگا جو اتباع کرنے والا ہو۔ لیکن یہ بیچارے، جو اتباع کرنے والے ہیں انھیں خود ہی یہ شبہ ہے کہ ہم اتباع کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم اتباع کر بھی رہے ہیں یا نہیں تو انھیں وعدہ خدا کا اعتبار کیسے پیدا ہوگا۔ تو جن کو اپنے اتباع پر اعتبار ہوگا انھیں وعدۂ خدا پر اعتبار ہوگا اور جنھیں اپنے اتباع ہی کا بھروسہ نہیں ہے انھیں وعدۂ خدا کا بھروسہ کیسے ہوگا۔ تو یہ اتباعِ جنابِ عیسیٰؑ کی شان ہے کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ جو تمھارے اتباع کرنے والے ہیں ہم انھیں کافروں سے بالاتر رکھیں گے قیامت تک۔

اے خدا عیسیٰ بن مریمؑ کے اتباع کرنے والوں کو اتنا اونچا بنا دیا کہ وہ قیامت تک یہودیوں سے بالاتر رہیں گے اور جس کو عیسیٰ بن مریمؑ کا پیغمبرؐ بنایا ہے جو روز قیامت سارے انبیاء کا گواہ بن کے آئے گا جو افضل مرسلین ہے جو سید المرسلین ہے، اس کے اتباع کرنیوالوں کا حال کیا ہوگا؟

پروردگار نے کہا جب میں نے ان سے وعدہ کیا ہے تو تمھیں خود اندازہ ہو جائے کہ ہم یہودیوں سے انھیں بھی بالاتر رکھیں گے اگر اتباع کریں گے اور اگر کبھی پستی کا احساس پیدا ہو۔ یہودیوں کے مقابلہ میں تو ان سے کہنا کہ خبردار میرے وعدے میں شک نہ کرنا۔ اپنے اتباع میں شک کرو۔ اپنی پیروی میں شک کرو میرا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا ہے جو میرا اتباع کرنیوالے ہیں وہ تو بہرحال ان سے بالاتر رہیں گے۔ اگر یقین نہ آئے تو جب واقعی اتباع کرنے والا

پردہ ہٹا کے آجائے تو دیکھ لینا کہ وہ کہاں ہوتا ہے اور سارا عالم کفر و الحاد کہاں ہوتا ہے۔ جب نظام عدل و انصاف قائم ہو جائے گا تب دنیا کو اندازہ ہو گا کہ خدائی وعدہ کتنا سچّا ہے۔ تمھاری پیروی کمزور تھی تو وہ بالاتر ہو گئے لیکن جس کی پیروی مکمل ہے اسے خدا نے سب سے بالاتر بنا دیا ہے۔

اس کے بعد جب سرکار دو عالمؐ منزلِ تبلیغ میں آئے تو حضورؐ نے اعلان کیا "قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ" میرے اللہ نے کہا ہے پیغمبرؐ! ان سے کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ اسلام میرا راستہ ہے "اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف میں دعوت دیتا ہوں اور وہ جو میرا اتباع کرنے والا ہے۔ تو جو پیغمبرؐ کا اتباع کرنے والا ہے پیغمبرؐ نے بصیرت کے ساتھ اسے خدا کی طرف دعوت دینے والا بنایا ہے اور اپنے ساتھ دعوت میں اسے شریک کیا ہے وہ واقعتًا اتباع کرنے والا ہے۔ تو جب حضورؐ دعوت دیں تو دیکھ لینا حضورؐ کے ساتھ دعوت میں کون شریک ہے۔ حضورؐ کے ساتھ دعوت دینے والا وہی ہو گا جو حضورؐ کا واقعی اتباع کرنے والا اور حضورؐ کی واقعی پیروی کرنے والا ہو گا۔ اب آگے مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ جائیے جا کے ڈھونڈھئے کہ حضورؐ کے ساتھ دعوت دینے والا کون ہے۔ اور اگر آپ کو تلاش کرنے میں نہ ملے تو حضورؐ تو خود ہی کہہ رہے تھے کہ میں اسلام پیش کرنے جا رہا ہوں میرا ساتھ کون دے گا۔ تو جس کو حضورؐ کے ساتھ شریک دعوت ہونا تھا اس کو اسی دن بولنا چاہئے تھا۔ فرق ہے اس انسان میں جو حضورؐ کے ساتھ دعوت دینے میں شریک ہو، اور اس انسان میں جو حضورؐ کی دعوت کو قبول کر لے۔ چاہے سب سے پہلے قبول کرے۔

دعوت پر لبیک کہنے والا اور ہوتا ہے اور دعوت دینے والا اور ہوتا ہے۔ خدا نے کہا ایک پہچان اتباع کی یہ ہے کہ جو نبی کے ساتھ دعوت دینے میں شریک ہے وہ ہے اتباع کرنے والا۔ تو اتباع کی ایک علامت ہے بلندی کفر پر، اور اتباع کی دوسری پہچان ہے حضورؐ کے ساتھ شریکِ دعوت ہونا۔

اتباع کی تیسری پہچان۔ پروردگار نے روزِ اوّل کہا پیغمبرؐ! تم لوگوں کو دینِ خدا

کی دعوت دو۔ "اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ" اپنے قرابت داروں کو ڈراؤ۔ لوگوں کو دینِ خدا کی دعوت دو اور پیغمبرؐ اس کا خیال رکھنا کہ جو تمھارے ساتھ آجائیں انھیں عام لوگوں سے الگ رکھنا۔

حضورؐ کیسے آپ الگ رکھیں گے؟

خدا نے کہا یہ طریقہ بھی میں ہی بتاؤں گا۔ "وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ" اے پیغمبرؐ! جو تمھارا کامل اتباع کرنے والے ہوں ان کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا دینا۔ یہ تیسری علامت ہے۔ اب مجھے کہاں تلاش کرنا ہے۔ جس کا جی چاہے وہ کہے کہ ہم اتباع کرنے والے ہیں۔ ہم اسے نہیں دیکھیں گے ہم تو خالی یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے شانے کو حضورؐ کے سامنے جھکا رہا ہے یا حضورؐ اپنے شانوں کو جھکا رہے ہیں۔ قرآن تو یہی کہتا ہے کہ جو اتباع کرنے والا ہے اس کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا دینا۔ جب ہم نے اس معیار پر تاریخ میں تلاش کیا تو کبھی ہمیں خانۂ خدا میں جانا پڑا، کبھی ہمیں مسجد میں آنا پڑا۔ کبھی ہمیں بازار میں جانا پڑا۔ اللہ کے گھر گئے تو نبیؐ کے کاندھوں پر علیؑ کو دیکھا۔ مسجد اور بازار میں آئے تو نبیؐ کے کاندھوں پر ان شہزادوں کو دیکھا جن کے لیے نبیؐ ناقہ بن کر چل رہے ہیں۔ اب تو اندازہ ہوا کہ اتباع کامل کرنے والے یہ ہیں۔

اور ایک جملہ کہوں گا کہ اگر صنف مانع نہ ہوتی تو اتباع کرنے والی بیٹی کے سامنے بھی نبیؐ کاندھوں کو جھکا دیتے مگر یہ نبوت کی شان نہیں ہے کہ عورت کو کاندھوں پر جگہ دے۔

سرکارؐ! تو میری ایک گذارش ہے کہ اگر آپ کسی خاتون کو کاندھے پر جگہ نہیں دے سکتے تو اگر کوئی خاتون اتباع کرنے والی ہے تو اس کے اتباع کو کیسے پہچانیں گے؟

پیغمبرؐ نے کہا تم نے تو زبان پڑھی ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ کلام عرب میں اتباع کے معنی نقشِ قدم پر چلنا۔ تو جہاں گنجائش ہوگی کاندھے پر بٹھانے کی وہاں بٹھالوں گا اور جہاں گنجائش نہ ہوگی وہاں وہ منظر پیش کردوں گا کہ نقشِ قدم پر چلنے والا کون ہے۔ شاید یہ

بھی ایک مصلحت تھی کہ نفس کو پیچھے کر دیا اور بیٹی کو آگے کر دیا اور اب جو مباہلہ میں آئے تو نبیؐ کے قدم اُٹھتے جارہے ہیں اور زہراؑ کے قدم پڑتے جارہے ہیں۔

یہ تین علامتیں ہیں اتباع کی اور چوتھی علامت اتباع کی "حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ"، پیغمبرؐ! آپ کے لیے خدا کافی ہے اور وہ صاحبانِ ایمان کافی ہیں جو آپ کا اتباع کرنے والے ہیں۔

خدایا! کیا تیرے ساتھ بھی "اور" کی گنجائش ہے، جس کے لیے تو کافی ہو جائے، اب کس کی ضرورت ہے۔ مگر خدا کہتا ہے میرے حبیب تمھارے لیے خدا کافی ہے اور وہ صاحبانِ ایمان کافی ہیں جو اتباع کرنے والے ہیں۔ تو اتباع کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جو نبیؐ کے لیے کافی ہو جائے سمجھو وہی اتباع کرنے والا ہے۔ اور جو ناکافی ہو جائے پھر اس کا اتباع کامل نہیں ہے۔ آپ متوجہ ہیں؟۔ میں صرف ایک لفظ کہوں گا باقی آپ پہچانیں گے۔ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اگر میرے آنے کے بعد حضورؐ آپ کا بھی انتظار کر رہے ہیں تو اس کے معنی کہ میں ناکافی ہوں، اور اگر میرے آنے کے بعد حضورؐ کو آپ کی پرواہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں کافی ہوں یہی تو کافی اور ناکافی کی پہچان ہے کہ جس کے بعد کسی اور کی ضرورت رہ جائے وہ ناکافی اور جس کے بعد کسی کی ضرورت نہ رہ جائے وہی کافی ہے۔

اب آئیے پہلے دن دیکھیں۔ ایک انسان کہہ رہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ حضورؐ کہہ دیتے کہ ابھی اعلان کو روکے لیتا ہوں، ابھی مجمع نہیں ہے۔ جب آدمی دس پانچ ہو جائیں گے تب اعلان کروں گا۔ تو میں سمجھتا کہ یہ بچّہ ناکافی ہے۔ لیکن اگر ایک کے وعدے پر اعلان شروع ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ وہ کافی ہے کہ جس کے بعد کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور آگے بڑھ جائیے۔ یہ پرچم لے کر جائیں۔ وہ فتح کرنے جائیں۔ وہ معرکہ میں جائیں مگر سب کے بعد بھی نبیؐ کہہ رہے ہیں کہ علیؑ کہاں ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کے بعد علیؑ کی تلاش ہے۔ مگر جب علیؑ رایت لے کر چلے تو کسی کو مڑ کے نہ دیکھا کہ کوئی اور جا رہا ہے یا نہیں جا رہا ہے۔ یہ علامت ہے کہ

سب ناکافی تھے نبیؐ کے لیے تنہا علیؑ کافی تھے۔

جب عمرو نے آکر للکارا کوئی مقابلہ پر آئے گا۔ تو حضورؐ نے کوئی لشکر نہیں بھیجا خندق میں۔ تنہا ایک گیا تھا اور عمرو کا سر کاٹ کے لے آیا۔ اب تو اندازہ ہو گیا کہ کل کفر کے مقابلہ میں سب ناکافی تھے صرف ایک علیؑ کافی تھے۔

بس عزیزو! منزلِ مصائب تک جانے کے لیے اس اتباع کی آخری منزل۔ میں نے پانچ علامتوں کا وعدہ کیا تھا۔ چار علامتیں بیان کر دیں۔ یہ پانچویں علامت ہے۔

جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ فرعون کے سامنے آئے تبلیغِ دین کے لیے۔ پیغامِ الٰہی پہونچانے کے لیے۔ فرعون نہیں ماننا چاہتا۔ نہیں تسلیم کرنا چاہتا۔

پروردگار کے حکم سے موسیٰؑ نے ایک بات کہی اور چلے گئے "قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ" ہم نشانیاں لے آئے۔ ہم نے معجزات پیش کر دیے۔ ہم نے ثبوت پیش کر دیا۔ ہم نے دلیل قائم کر دی۔ مانو یا نہ مانو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا "وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ"۔ جو ہدایت کا اتباع کرے گا اس کے لیے سلام ہے۔ اگر تو اتباع ہدایت نہیں کرتا تو تو قابلِ سلام بھی نہیں ہے۔ سلام ان کے لیے ہے جو اتباع کرنے والے ہیں، جو ہدایت کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اب اندازہ ہوا جناب موسیٰؑ کا پیش کیا ہوا قانون ہے کہ جو اتباع ہدایت کرنے والے ہیں وہ سلام کے حقدار ہوتے ہیں۔ اب آپ نے پہچانا ہم نے اسے بھی ایک نشانی قرار دیا ہے۔ اسی لیے ہم کسی بات پر راضی نہیں ہیں۔ نہ ہم رضا پر راضی ہیں نہ ہم کرامت پر راضی ہیں۔ نہ ہم اس پر خوش ہوتے ہیں کہ ہم کسی کے حق میں دعائے رضا کریں نہ اس بات پر راضی ہوتے ہیں کہ ہم کسی کی کرامت کا اعلان کریں۔ ہمارے لیے ایک ہی اعلان کافی ہے کہ جب ان کا نام آئے گا تو ہم کہیں گے "علیہ السّلام"۔ یہ علیہ السلام اس بات کا اعلان کہ یہ ہیں اتباع کامل کرنے والے۔ تو جو اس نبیؐ کا، نبوت کا، خدائی پیغام کا کامل اتباع کرنے والے ہیں وہ نگاہِ پروردگار میں قابلِ سلام ہوتے ہیں۔ تو حق ہے یہ کہنے کا کہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَوْلِيَاءَ اللهِ وَأَحِبَّاءَهُ" کربلا والو! تم پر ہمارا سلام۔ اس لیے کہ تم نے ہدایت کا اتباع کیا ہے۔ حسینؑ کے

جاں نثارو! تم پر ہمارا سلام کہ تم نے راہِ حق کا اتباع کیا ہے۔ بنی ہاشم کے شیرو! تم پر ہمارا سلام کہ تم نے ہدایت کا اتباع کیا ہے۔ قرآن اس سلام کی تعلیم دے رہا ہے جو منزلِ اتباع میں کامل ہو جائیں وہ سلام کے حقدار ہوتے ہیں۔ دنیا کسی بات پر راضی ہو جائے ہم اس پر راضی ہیں کہ انھیں "علیہ السّلام" کہا جائے۔ اس لیے کہ ان کے لیے رضامندی کی دعا کرنا اس خطرہ کی علامت ہے کہ شاید خدا راضی نہیں ہے۔ ان کے لیے کوئی اور جملہ ان کی کمزوری کی نشانی ہے مگر یہ سلام ان کے کمال اتباع کی پہچان ہے۔ ان کے اتباع کامل کی علامت ہے۔

لٰہذا ہم نے جب بھی آلِ محمدؐ کا ذکر کیا۔ علیؑ کا نام آیا تو "علیہ السّلام"۔ حسنؑ کا نام آیا تو "علیہ السّلام"۔ حسینؑ کا نام آیا تو "علیہ السّلام"۔ یہ تو وہ بڑی بلند منزل والے تھے جو ان سے وابستہ ہو گئے، جو ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اور ان کا اتباع کرنے والے تھے وہ سب بھی ہمارے سلام کے حقدار ہیں۔ ان کے لیے ہر نماز کے بعد ہم آواز دیتے ہیں نبیؐ کے لال! تم پر بھی ہمارا سلام اور ان پر بھی ہمارا سلام جو تمھارے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے۔ "اَلسَّلامُ عَلَی الْحُسَیْنِ وَعَلٰی عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ وَعَلٰی اَوْلَادِ الْحُسَیْنِ وَعَلٰی اَصْحَابِ الْحُسَیْنِ"۔ کل صبح اعمالِ عاشورہ میں آپ ان فقروں کو دوہرائیں گے۔ سلام ہو حسینؑ پر جو نبیؐ کا کامل اتباع کرنے والے تھے۔ سلام ہو علیؑ بن الحسینؑ پر جو اپنی جوانی کو اسلام پر قربان کر دینے والے تھے۔ سلام ہو اولادِ حسینؑ پر۔ سلام ہو اصحابِ حسینؑ پر۔ آپ متوجہ ہوئے میں نے کیا کہا؟ سلام ہو علیؑ بن الحسینؑ پر اور سلام ہو اولادِ حسینؑ پر۔ علیؑ بن الحسینؑ کے بعد پھر اولادِ حسینؑ میں بچا کون ہے؟ اس کڑیل جوان کے بعد اولادِ حسینؑ میں قربانی دینے والا اور کون دکھائی دیتا ہے۔ لیکن عزیزو! ہمارے سلام کا حقدار اگر اٹھارہ سال کا کڑیل جوان ہے تو ہمارے سلام کا حقدار وہ چھ مہینہ کا بچّہ بھی ہے جس نے گہوارے سے آ کے جان قربان کی ہے۔

ایک جملہ میرے ذہن میں آ گیا۔ ہمارے یہاں جب بچّے چھوٹے ہوتے ہیں اور

کوئی بڑا گھر میں آجاتا ہے تو ماں باپ بچے سے کہتے ہیں انھیں سلام کرو اور اگر بچہ سلام کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اشاروں سے سلام کرایا جاتا ہے۔ ہم نے ایسے بچّے تو ساری دنیا میں دیکھے کہ جن کو بڑوں کو سلام کرنا سکھایا جاتا ہے لیکن ایک بچہ کربلا میں دیکھا جس کو ساری دنیا کے انسان سلام کر رہے ہیں۔ اے رباب کے لال! اے رباب کی جان! اے حسینؑ کے کمسن مجاہد! تم پر ہمارا سلام۔ کل تو میں نے مجمع کو دیکھ کر اپنے نوجوانوں سے کہا تھا کہ تم متوجہ ہو جاؤ کڑیل جوان کا ماتم ہے۔ آج میں کس سے کہوں کہ تم ماتم کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی بہنوں سے کہوں اگر تمھاری گودمیں بچے سو گئے ہیں تو اپنی گود کے بچّوں کو بیدار کرو۔ رباب کا لال نہیں سویا۔ جھولے میں کروٹیں بدل رہا ہے۔ تمھیں اس گرمی میں بار بار یہ خیال ہے کہ بچہ اگر پیاسا ہے تو دودھ پلا دیا جائے۔ نہ ہو تو پانی پلا دیا جائے۔ مگر وہ ماں کیا کرے جس کے خیمہ میں ایک قطرۂ آب نہ ہو۔ مگر عزیزو! ہمارے بچّوں کو اگر تھوڑی دیر پانی نہ ملے تو پیاس سے بیتاب ہو جائیں گے۔ بزرگوں کے ہوش و حواس نہ رہ جائیں گے۔ بچّوں کا کیا ذکر ہے مگر کیسا ہوشمند تھا رباب کا لال۔ میدان میں آواز گونج رہی ہے، "هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا"۔ کیسے یہ آواز خیمہ تک پہونچی؟ کیسے جھولے میں بچے نے سُنا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ یہ سب نے دیکھا کہ بچے نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا۔ کہاں چھ مہینہ کی عمر میں ایسے باشعور بچے نظر آتے ہیں۔ خیمہ میں ایک کہرام برپا ہوا حسینؑ نے آواز سنی۔ تڑپ کے آئے درِ خیمہ پر۔ یہ رونے کی آواز کیوں آرہی ہے؟ بہن یہ خیمہ میں کہرام کیسا ہے؟ کہا بھیا آپ کے استغاثہ کو سن کر علی اصغر نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے۔ کہا بہن لاؤ اصغر کو میں سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں اصغر نے اپنے کو جھولے سے کیوں گرا دیا۔ لاؤ میرے لال کو لاؤ۔ کہا بھیا مگر اصغر کسی کی گودی میں نہیں آتے۔ کہا اچھا مجھے لے چلو اصغر کے پاس۔ حسینؑ آئے جھولے کے قریب۔ کیا باپ نے کہا۔ کیا بیٹا سمجھا۔ کیا حسینؑ کا اشارہ تھا۔ علی اصغر نے اشارہ کو کیسے پہچانا یہ میں نہیں جانتا۔ اتنا سب نے دیکھا کہ حسینؑ نے ہاتھ پھیلائے اور بچہ ہمک کے گودی میں آگیا۔ بابا اگر میں اپنے پیروں سے

میدان میں جانے کے قابل ہوتا تو آپ کو زحمت نہ دیتا۔ آپ آیئے مجھے لے چلیئے تا کہ میں یہ جان آپ پر قربان کردوں۔ حسینؑ نے بچے کو گود میں لیا۔ لے کر چلے۔ جب درِ خیمہ کے قریب پہونچے۔ دیکھا رباب سر جھکائے کھڑی ہیں۔ اے رباب یہاں آ کے کیوں کھڑی ہو گئیں؟ کہا مولا دیکھ رہی ہوں کہ صبح سے جو میدان میں گیا اب تک پلٹ کے نہیں آیا۔ اب میرا لال جا رہا ہے۔ میں اپنے لال کو ایک مرتبہ دیکھ تو لوں۔ اپنے لال کو درِ خیمہ سے رخصت تو کر دوں۔ حسینؑ نے رباب کے دل کو تسکین دی۔ رباب ابتک جو میدان میں گئے وہ لڑنے کے قابل تھے۔ ان کے بارے میں دشمنوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جنگ کرنے آئے ہیں مگر تمھارا بیٹا تو جنگ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ میں لے جا رہا ہوں اس کی پیاس کا اظہار کروں گا شاید کسی کو رحم آجائے۔ ماں کا دل سنبھل گیا۔ حسینؑ بچے کو لے کر چلے، ایک بلندی پر آ کر فرماتے ہیں اے قوم جفا کار! اگر تیرے خیال میں میری کوئی خطا ہے تو چھ مہینہ کا بچہ تو کسی قانون میں خطاوار نہیں ہوتا ہے میرا بچہ پیاسا ہے۔ اسلام نے پیاسے کو پانی پلانے کا حکم دیا ہے۔ "أَمَا فِيكُمْ مُسْلِمٌ"، کیا تم میں کوئی مسلمان نہیں ہے؟ فوجوں سے کوئی جواب نہ ملا۔ تو ایک مرتبہ حسینؑ نے لفظوں کو بدل دیا۔ اچھا اگر کوئی مسلمان نہیں ہے تو کیا تم میں کوئی صاحبِ اولاد بھی نہیں ہے۔ ارے ذرا میرے بچّے کا حال تو دیکھو، میرے بچے کی پیاس کا عالم تو دیکھو۔ کوئی جواب نہ ملا۔ ہاں اشقیا منھ پھیر پھیر کر رونے لگے۔ فوج میں کہرام برپا ہوا۔ ابن سعد نے بڑھ کے پکارا، حرملہ! "اِقْطَعْ كَلَامَ الْحُسَيْنِ"، حسینؑ کے کلام کو قطع کر دے۔ حرملہ آگے بڑھا۔ دوش سے کمان اُتاری۔ ترکش سے تیر نکالا تیر چلّہ کمان میں جوڑا۔ تین بھال کا تیر اِدھر چھ مہینہ کا بچہ اُدھر تیر چلا۔ علی اصغر کے گلے پر تیر لگا۔ بچہ باپ کے ہاتھوں پر پلٹ گیا۔ حسینؑ نے جو جھک کے دیکھا تو دیکھا کہ بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے گویا اصغر کہہ رہے ہیں۔ بابا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں مسکرا کر دنیا سے جا رہا ہوں۔ حسینؑ نے بچّے کو سنبھالا لے کر درِ خیمہ کی طرف چلے۔ درِ خیمہ کے قریب پہونچے نہ جانے کیا خیال آیا۔ پلٹ کے آئے۔ کبھی چاہتے ہیں رباب کو آخری دیدار کرا دیں۔ کبھی کچھ سوچ کے پلٹ آتے ہیں۔ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ رِضًا بِقَضَائِهِ وَتَسْلِيْمًا لِاَمْرِهِ" سات مرتبہ آگے

بڑھے، پیچھے ہٹے۔ آخر میں حسینؑ نے فیصلہ کیا کہ اب تو بچہ کا کام تمام ہو چکا ہے ماں کو آخری دیدار سے کیوں محروم رکھا جائے۔ یہ سوچ کر در خیمہ پر آئے۔ آواز دی رباب اپنے لال کو لیجاؤ۔ خیمہ میں آواز پہونچی اُدھر سے رباب چلیں اِدھر سے سکینہ چلیں مگر سکینہ پہلے آئیں، رباب بعد میں آئیں۔ شاید راز یہ رہا ہو کہ بچی دوڑ کے آگئی۔ مگر ماں قدم اُٹھاتی ہے تو قدم اُٹھتے نہیں ہیں نہ جانے میرا لال کس عالم میں ہوگا۔ اب جو سکینہ آئیں کہا بابا اصغر کو پانی پلا لائے۔ اے بابا یہ سکینہ بھی تو پیاسی تھی۔ ہائے حسینؑ کیا جواب دیتے۔ سر جھکائے کھڑے ہیں۔ رباب آگے بڑھیں لائیے آقا میرے لال کو لائیے۔ اب جو حسینؑ نے قبا کا دامن ہٹایا۔ ماں نے اپنے لال کو دیکھا گلے پر تیر کا نشان۔ بچہ خون میں نہایا ہوا۔ ارے میرے لال! کیا اس عمر کے بچے بھی نحر کر دیئے جاتے ہیں۔ حسینؑ فوراً پلٹ آئے۔ پُشت خیمہ پر آکے بیٹھے۔ چاہا اپنے لال کو سپرد خاک کر دیں ذوالفقار سے ننھی سی قبر بنانے لگے۔ عجب نہیں ذوالفقار نے فریاد کی ہو مولاؑ جب سے عرش سے آئی کبھی ایسا کام مجھ سے نہیں لیا گیا۔ آج بے شیر کی قبر بنائی جا رہی ہے۔ لو عزیزو! قبر تیار ہو گئی۔ روایت کا فقرہ ہے کہ حسینؑ بچے کو لیے گود میں بیٹھے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ خاک پر لٹا دیں مگر نہ جانے کیا خیال آتا ہے۔ کلیجہ سے لگا لیتے ہیں کبھی خاک پر رکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی سینہ سے لگا لیتے ہیں۔ چند لمحہ گذرے تھے کہ ایک مرتبہ آواز آئی۔ اے حسینؑ اپنے بچے کو قبر میں رکھ دو تم پریشان نہ ہو۔ کوئی ماں آگئی ہے۔ عجب نہیں زہراؑ نے آواز دی ہو۔ میرے حسینؑ! لاؤ اصغر کو میرے حوالے کر دو۔ حسینؑ نے بچہ کو قبر میں رکھا اور :۔۔۔۔

ننھی سی قبر کھود کے اصغر کو گاڑ کر
شبیرؑ اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کر

سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۱۱

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ
بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ
اَجْمَعِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ!

انسانی زندگی کا کامیابی کا راز اس پیغمبرؐ کا اتباع ہے جس کا تذکرہ توریت میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔ وہ نیکیوں کا حکم دینے والا۔ برائیوں سے روکنے والا۔ طیّبات کو حلال قرار دینے والا۔ خبائث کو حرام قرار دینے والا۔ عالم انسانیت کو آزادی دلانے والا ہے۔ ایسے پیغمبرؐ پر ایمان، ایسے پیغمبرؐ کا احترام، ایسے پیغمبرؐ کی نصرت اور اس نور کا اتباع جو پیغمبرؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہی وہ امور ہیں جو انسانی زندگی کی کامیابی کا راز ہیں۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن پر انسانیت کی نجات کا دارومدار ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے جس دن سے میدان تبلیغ بشریت میں قدم رکھا حضورؐ کا سب سے پہلا پیغام انسانی زندگی کی کامیابی اور انسان کی نجات سے متعلق تھا۔ "قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا" لا الٰہ الا اللہ کہو اسی میں تمہاری فلاح ہے۔ اسی میں تمہاری نجات ہے۔ اس کے بعد انسانی زندگی کی کامیابی اور انسان کی نجات کے سلسلہ میں مسلسل ان تمام امور کی وضاحت فرماتے رہے جو انسانی نجات کا ذریعہ بن سکتے تھے۔

یہاں تک کہ پروردگار عالم نے جب اپنی عبادت کے لیے اصول اور قواعد معیّن

کیسے تو یہ طے کر دیا کہ جب انسان کو بندگی کے لیے مصلائے عبادت پر بلایا جائے تو اسے پھر وہی پیغام دیا جائے جو پیغمبرؐ نے روز اوّل دیا ہے۔ یعنی جس طرح عقیدہ کی دنیا میں لا الٰہ الا اللہ انسان کی زندگی کی کامیابی کا راز ہے اسی طرح عمل کی دنیا میں معبود کے سامنے سر تسلیم جھکا دینا انسانی زندگی کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

سرورِ کائنات نے وحیِ پروردگار کے مطابق جب نماز کے لیے بلانے کا انتظام کیا تو نہ کسی کے خواب پر بھروسہ کیا اور نہ کسی کے مشورہ پر اعتماد کیا۔ پروردگار عالم نے جو طریقہ پیغمبرؐ کے حوالے کیا، پیغمبرؐ نے وہی طریقہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ اس نماز کی دعوت دی جائے تو کیا کہہ کے بلایا جائے۔ نماز کی کس فضیلت کا اعلان کیا جائے۔ نماز کے کس کمال کا اعلان کیا جائے کہ دنیا کھنچ کر بندگیِ پروردگار کی طرف آجائے۔ تو اس کے لیے ایک لفظ کا انتخاب کیا گیا "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" آؤ فلاح کے لیے آؤ۔ کامیابی یہیں ہے۔ نجات یہیں ہے۔ اگر کلمۂ توحید کو مجسم شکل میں دیکھنا چاہتے ہو تو کلمۂ توحید کی مجسم شکل کا نام ہے نماز۔ کل پیغمبرؐ کہہ رہے تھے "لا الٰہ الا اللہ" کہو اسی میں فلاح اور نجات ہے، آج یہی پیغمبرؐ آواز دے رہا ہے نماز کے لیے آؤ۔ یہی نماز فلاح ہے۔ یہی نماز تمھاری نجات کا ذریعہ ہے۔ یہی نماز تمھاری کامیابی کا راز ہے۔ تو گویا جس کا نام کل لا الٰہ الا اللہ رکھا گیا تھا وہ "لا الٰہ الا اللہ" کا کلمہ جب مجسم ہوا تو نماز کی شکل میں سامنے آگیا۔ راز واضح ہے۔ کل لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ "قُولُوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کے معنی یہ ہیں کہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا اور انسان کامیاب ہو گیا۔ نہیں۔ اب پیغمبرؐ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ زبان سے الفاظ کا دوہرا دینا یہ انسانی زندگی کی کامیابی کا راز نہیں ہے۔ یہ انسان کی نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔

انسان کی نجات اس بات میں ہے کہ انسان اپنے سر کو مالک کائنات کی بارگاہ میں جھکا دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام میں جب حکم نماز آیا پروردگار عالم کی طرف سے اور پیغمبرؐ نے قوم کو دعوت نماز دی اور نماز کے لئے بلانے کے لیے سرکار دو عالم

نے جناب بلال کا انتخاب کیا اور لوگوں نے بلال کی آواز سُنی اور آنے کے بعد وہ منظر، وہ نقشہ کھینچا کہ آخر یہ کس کام کے لیے بُلایا گیا ہے۔ فلاح کسے کہا گیا ہے۔ خیر عمل کس کا نام ہے۔ وہ صلوٰۃ اور نماز کیا ہے جس کے لیے بُلایا گیا ہے۔ تو دو منظر دکھائی دئیے۔ پہلے اسے دیکھا جو بُلانے والا ہے۔ اس کے بعد وہ عمل دیکھا جس کے لیے بلایا گیا ہے۔ تو لوگوں نے آپ کے پیغمبرؐ کے سامنے یہ کہا کہ یہ دونوں عمل ہمیں پسند نہیں ہیں لہٰذا ہم آپ کے اس راستہ پر نہیں آسکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ کو کسی کام کے لیے بُلانا ہی تھا تو بُلانے کے لیے کسی سلیقہ کے آدمی کا انتخاب کیا ہوتا، ایسے ایسے حسین وجمیل افراد کے درمیان ایک حبش کے رہنے والے سیاہ فام انسان کو آپ نے داعی بنا دیا ہے۔ ایسے ایسے عربوں کے درمیان ایک ایسے آدمی کو آپ نے موذن بنا دیا ہے جس آدمی کے پاس عربی لہجہ بھی نہیں ہے۔ یہ صحیح طریقہ سے الفاظ کو ادا بھی نہیں کر سکتا۔ ہم ایسے کالے آدمی کے بُلانے پر نہ آئیں گے۔ ہم ایسے غلط لہجہ والے کے بُلانے پر نہ آئیں گے۔ اور اگر ہم آ بھی جاتے تو یہ کاروبار ہم سے نہ ہو سکے گا۔ جس کام کے لیے آپ بُلا رہے ہیں۔ ہم سرفراز قوم ہیں، ہم سر بلند قوم ہیں۔ ہمارا سر اونچا رکھا گیا ہے۔ اب آپ ہمیں اتنا ذلیل کرنا چاہتے ہیں کہ ہم سیدھے ہیں تو جُھک جائیں اور جُھک جانے کے بعد زمین پر گر جائیں کہ وہ ہمارا سر جس کو کوئی جُھکا نہیں سکا وہ سر خاک پر رکھ دیا جائے۔ ہم اس عمل کو برداشت نہ کریں گے۔ نہ آپ کی نماز ہمارے لیے قابلِ برداشت ہے، نہ آپ کی اذان ہمارے لیے قابلِ برداشت ہے۔ اگر آپ اذان کے لیے موذن تبدیل کر دیں اور نماز کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرلیں جہاں ہم کو جُھکنا نہ پڑے، ہمیں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ ہمارا یہ بلند سر خاک سے نہ ملنے پائے تو ہم آپ کے ساتھ آسکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے تو ہم اس طریقۂ کار میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہ کون سی فلاح ہے، یہ کون سی کامیابی ہے کہ سر بلند انسان کو خاک پر گرا دیا جائے۔ یہ کون سی کامیابی ہے کہ سرفراز انسان کے سر کو خاک پر گرا دیا جائے یہ کوئی کامیابی نہیں ہے۔

سرکار دو عالمؐ کے سامنے یہ مطالبہ رکھا گیا تو حضورؐ کا بس ایک جواب تھا کہ یہ ہے قانون الٰہی۔ جس کو ماننا ہے مانے جس کو نہیں ماننا ہے نہ مانے۔ اللہ کا قانون بندوں کی خواہش سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کا قانون تمھاری خواہشات کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ قانون الٰہی یہ ہے۔ رہ گئے تمھارے شبہات تو تمھارے شبہات کا جواب ہمارے پاس موجود ہے۔ تم یہی تو کہنا چاہتے ہو کہ بلال کا رنگ کالا ہے ہم ان کے بُلانے پر نہ آئیں گے۔ تم یہی تو کہنا چاہتے ہو کہ بلال کا لہجہ عربی نہیں ہے ہم ان کے بُلانے پر نہ آئیں گے۔ کاش تم نے یہ سوچا ہوتا کہ اگر یہاں حُسن کا کوئی مقابلہ ہوتا تو بلال کے بجائے کسی اور کو لایا جاتا۔ اگر یہاں لہجہ کا، حُسن قرأت کا کوئی مقابلہ ہوتا تو کسی عرب کو ڈھونڈھ کے لایا جاتا۔ یہ بندگی کی دعوت ہے۔ یہ عبادت کی دعوت ہے۔ جو جذبۂ بندگی میں جتنا بالاتر ہوگا اسے اتنا ہی اونچا رکھا جائے گا۔ یہاں رنگ نہیں دیکھا جاتا۔ یہاں لہجہ نہیں دیکھا جاتا اور اگر تمھارا خیال یہی ہے تو مالک نے بلال کی سین ہی کو شین بنا دیا ہے۔ خدا کی نگاہ میں ان لہجوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ خدا ایمان دیکھتا ہے۔ خدا اخلاص دیکھتا ہے۔ میرا خدا جذبۂ بندگی دیکھتا ہے۔ چونکہ یہ بندگی کی دعوت ہے تو جذبۂ بندگی میں جتنا بلند ہوگا اس کو اتنی ہی اہمیت دی جائے گی، اتنا ہی بلند مقام دیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر تمھارا خیال یہ ہے کہ یہ نماز تمھارے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے کہ جہاں اونچے انسان کو پست بنایا جاتا ہے۔ یہاں سر بلند انسان کا سر خاک پر رکھ دیا جاتا ہے تو یہ یاد رکھنا کہ میں نے تو خود تمھیں یہ طریقہ سکھایا ہے کہ خبردار! کسی کے سامنے سر نہ جُھکانا۔ پتھروں کے آگے سر بلند میں نے بنایا ہے۔ درختوں سے اونچا میں نے بنایا ہے۔ ستاروں سے اونچا میں نے بنایا ہے۔ چاند کی خدائی کو میں نے باطل کیا ہے۔ سورج کی خدائی کو میں نے غلط قرار دیا ہے۔ میں نے خود تمھیں اونچا بنایا ہے۔ اس کے بعد میں اگر تمھیں سجدے کا حکم دیتا ہوں تو میں تمھیں ذلیل نہیں کرنا چاہتا، تمھیں جُھکانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سمجھانا چاہتا ہوں کہ مخلوقات کے سامنے جُھک جاؤ گے تو ذلیل ہو جاؤ گے اور خالق کے سامنے جُھک جاؤ گے تو صاحبِ معراج ہو جاؤ گے۔

یہ جھک جانا، یہ سجدہ، یہ عبادت کی شان، جسے تم اپنے لیے ذلت سمجھ رہے ہو یہ ذلت نہیں ہے۔ یہی نماز تمھاری بندگی کی معراج ہے۔ یہی نماز تمھاری عظمت کا ذریعہ ہے اور یہ یاد رکھنا کہ اگر دنیا میں، عالم انسانیت میں، تمھاری برادری میں اتنا احساس پایا جاتا ہے کہ اگر تمھارے سامنے کسی نے کوئی کار نمایاں تمھارے حق میں انجام دیا ہے تو تم چاہتے ہو کہ اس کی جزا اس سے بہتر ہو۔ اس کا انعام اس سے بہتر ہو تو کم سے کم اپنے خدا پر اتنا ہی بھروسہ کیا ہوتا کہ اگر تمھارا طریقہ ہے کہ تھوڑا کرنے والے کو زیادہ دیتے ہو تو جو کُل کائنات کا مالک اور خالق ہے، جس کے قبضہ میں کُل کائنات ہے اس کی بارگاہ میں جتنا عمل کرتے جاؤ گے اس سے بہتر انعام دے گا۔ جب سر بلند رہو گے انعام کم ملے گا۔ جھک جاؤ گے بلند بنا دے گا۔ جتنا جھکتے جاؤ گے اتنا ہی بلند بنا دے گا۔ جب جھکا کے اپنے سر کو خاک تک پہونچا دو گے تو بلندی کی وہ منزلیں عنایت کرے گا جس کا تمھارے درمیان کوئی تصوّر بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے میں نے اس نماز کو فلاح قرار دیا ہے۔ اس نماز کو کامیابی قرار دیا ہے کہ اس سے زیادہ کامیابی کیا ہو گی کہ انسان مالک کی بارگاہ میں سر بلند ہو جائے اور وہاں سر بلندی کا ایک ہی راز ہے تم سر جھکاتے جاؤ اور خدا تمھیں اونچا بناتا جائے۔ تم سر جھکاتے جاؤ اور خدا تمھیں بلندی دیتا جائے۔

یہ معبود کا ایک اصول ہے جسے خاصانِ خدا نے سمجھ لیا ہے۔ اللہ کے نیک بندوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا ہے اس لیے کہ وہ اپنے سر کو اللہ کی بارگاہ میں ہمیشہ جھکائے رکھنا چاہتے تھے وہ سر نہیں اُٹھانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سر اُٹھانا بلندی کی علامت نہیں ہے، سر جھکانا بلندی کی نشانی ہے۔ ورنہ آپ سوچئے کہ جس کے قبضہ میں کائنات ہو، جس کے صدقہ میں دنیا بنی ہو، زمین اس کے اختیار میں ہو، چاند سورج اس کے اختیار میں ہوں، اُسے کیا غرض تھی کہ رات بھر مصلّے پر کھڑا رہے، اُسے کیا ضرورت تھی کہ رات بھر سجدے کرتا رہے، اسے کیا ضرورت تھی کہ رات بھر بندگی کرتا رہے۔

مگر میں نے یہی دیکھا کہ جو جتنا بڑا صاحبِ اختیار تھا اس کے سجدے اتنے ہی زیادہ تھے۔ جس کی انگلیوں میں چاند توڑ دینے کی طاقت تھی وہ رات بھر سجدے کیا کرتا تھا جس کی

انگلیوں میں سورج پلٹا دینے کا دم تھا، وہ رات بھر بندگی کیا کرتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ پروردگار عالم نے ان بندوں کو یہ شعور عنایت فرما دیا تھا کہ جتنا خدا کی بارگاہ میں انسان خاکساری کا ثبوت دے گا خدا اس کو اتنی ہی بلندی عنایت کرے گا۔ خدا کی بارگاہ میں جھک جانا ایسی بلندی کا ثبوت ہے کہ جب پروردگار عالم نے بلندی کی آخری منزل کا اعلان کیا تو اس بلندی کے اعلان کو بھی دو سجدوں میں گھیر دیا۔ "سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی" وہ پاک و بے نیاز ہے جو اپنے بندے کو لے گیا۔ کہاں لے گیا۔ مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک۔ جہاں سے حضورؐ گئے اس کا نام بھی مسجد ہے، اور جہاں عرش اعظم تک گئے قرآن نے اس کا نام بھی مسجد رکھا ہے۔ مسجد سجدہ کرنے کی جگہ کا نام ہے۔ مسجد سر جھکانے کی جگہ کا نام ہے۔ تو جہاں سے نبیؐ چلے وہ بھی سجدہ کرنے کی جگہ اور جہاں پہونچے وہ بھی سجدہ کرنے کی جگہ۔ گویا پیغمبرؐ کی معراج آواز دے رہی ہے کہ بلندی چاہتے ہو تو پہلے سجدہ کرو، اور جب بلندی مل جائے تو پھر سجدہ کرنا۔ ایک سجدہ بلندی کا ذریعہ ہے اور دوسرا سجدہ بلندی کا ثبوت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب نبیؐ کی معراج کو دیکھا تو یہی عالم دیکھا کہ عرش کی بلندی پر جانے کے بعد نبیؐ نے سجدہ میں سر رکھ دیا۔ اور جب علیؑ کے اقتدار کو دیکھا تو وہاں بھی یہی عالم دیکھا کہ علیؑ نے سورج پلٹانے کے بعد اپنے کمال کا اعلان نہیں کیا بلکہ سر سجدہ معبود میں رکھ دیا تاکہ کردار سے کردار ملا لیا جائے اور یہ اندازہ ہو جائے کہ جو کام ان بلندیوں پر پیغمبرؐ انجام دے رہے تھے وہی کام اِس اقتدار کے بعد علیؑ انجام دے رہے ہیں۔

جو بلندی پانے کے بعد اکڑ جاتے ہیں وہ فرعون، ہامان، قارون اور شدّاد ہوتے ہیں۔ اور جو بلندی پانے کے بعد سجدے کرتے ہیں وہ محمد مصطفیٰؐ اور علی مرتضیٰؑ ہوتے ہیں۔

یہی وہ سلسلہ تھا جو نسلِ پیغمبرؐ میں آگے بڑھا۔ یہی وہ سلسلہ تھا جو نسلِ علیؑ میں آگے بڑھا۔ یہی وہ سلسلہ تھا جو آلِ محمدؐ میں قائم رہ گیا۔ بلندیاں ہیں تو سجدے ہیں، اور سجدے ہیں تو بلندیاں ہیں۔

صدیقہ طاہرہؑ نے وقت آخر جناب اسماء سے کہا کہ میں حجرۂ عبادت میں جا رہی ہوں

جب تک میری آواز آتی رہے سمجھنا نبیؐ کی بیٹی زندہ ہے اور جب تسبیح و تہلیل و عبادتِ خدا کی آواز نہ آئے تو سمجھنا کہ نبیؐ کی بیٹی اب دنیا میں نہیں ہے۔ صدیقہؑ حجرۂ عبادت میں گئیں ذکرِ خدا کی آوازیں آرہی ہیں۔ عبادت ہو رہی ہے۔ بندگی ہو رہی ہے کہ ایک مرتبہ آواز تھمی، اسمار نے دروازہ کھولا دیکھا نبیؐ کی بیٹی دنیا سے رخصت ہو گئی ہے۔

ذرا اس تسلسل کو یاد رکھیے گا۔ رات بھر مصلّے پر کھڑا ہونا پیغمبرؐ کا کام تھا۔ ایک رات میں ہزار رکعت نماز پڑھنا علیؑ کا کام تھا اور زندگی کی آخری سانس تک عبادتِ خدا کرنا یہ فاطمہ زہراؑ کا کارنامہ تھا۔

حسینؑ نبیؐ کے نواسے ہی کا نام تو ہے۔ حسینؑ علیؑ کے لختِ جگر ہی کا نام تو ہے۔ حسینؑ فاطمہؑ کے نورِ نظر ہی کا نام تو ہے۔ تو حسینؑ کی زندگی میں بھی سارے آثار ہونے چاہئیں۔ چنانچہ امام حسینؑ نے آخری رات ایک رات کی مہلت لی تاکہ نانا کی سُنّت کو زندہ کیا جائے۔ باپ کی سیرت کو زندہ کیا جائے۔ ماں کے کردار کو زندہ کیا جائے۔ اسی لیے تاریخ میں تینوں باتیں جمع ہو گئیں۔ رات نمازوں میں گذر رہی ہے اور مورّخ کربلا کہتا ہے کہ خیامِ حسینی میں عاشور کی رات یہ عالم تھا کہ "لَهُمْ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ" جیسے شہد کی مکھی کے چھتّے سے آوازیں آتی ہیں خیامِ حسینی سے رات بھی تسبیح، تہلیل، تکبیر، ذکرِ خدا، عبادتِ الٰہی کی آوازیں آتی رہیں۔ یہ تنہا حسینؑ کا کام نہیں تھا حسینؑ کے بچوں کا یہی عالم تھا، سیدانیوں کا یہی عالم تھا، اصحاب کا یہی عالم تھا۔

ایک لمحہ کے لیے ذرا ذہنوں پر زور دے کر سوچیں کہ صبح جنگ ہونے والی ہے۔ صبح ایک معرکہ ہے۔ صبح ایک جہاد کا میدان ہے۔

دنیا میں جہاں صبح کو جنگ ہونے والی ہوتی ہے وہاں راتوں کو جنگ کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ راتوں کو اسلحوں پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ رات کو تلواروں پر صیقل ہوتی ہے۔ مگر اصحابِ حسینؑ کے حالات دیکھیے۔ کتنے کام ایک وقت میں ہو رہے ہیں۔ تلواروں پر صیقل بھی ہو رہی ہے، ذکرِ خدا بھی ہو رہا ہے، جنگ کی تیاری بھی ہو رہی ہے اور نماز بھی ہو رہی ہے۔ یہ کام تو اصحاب

انجام

اب حسینؑ کے کام سوچئے۔ کبھی مصلّے پر۔ کبھی اصحاب کے درمیان۔ کبھی بیبیوں کے درمیان۔ کبھی مقتل میں۔ کبھی خیمہ میں۔ ایک انسان کتنی ذمہ داریاں ادا کر رہا ہے۔ مقتل میں جاکے قتل گاہ کا جائزہ لیں۔ خیمہ میں آکر بیبیوں کو تسلّیاں دیں۔ مجمع اصحاب میں آکر ان کے کمال کا اعلان کریں۔ مجاہدوں کے درمیان جاکر ان کے جہاد کا جائزہ لیں۔ اتنے کام حسینؑ تن تنہا انجام دے رہے ہیں۔

مگر عزیزو! یاد رکھنا میں ایک جملہ کہوں گا۔ مولاؑ آپ امام ہیں، آپ مرد ہیں، آپ صاحب اعجاز ہیں۔ اگر آپ اتنے کام بیک وقت انجام دے رہے ہیں۔ اگر آپ مجمع اصحاب میں جا رہے ہیں تو اصحاب سامنے موجود ہیں۔ اگر آپ بیبیوں کے درمیان آئے ہیں تو بیبیوں کو دیکھا ہے۔ بچوں کو دیکھا ہے۔ آباد گودیوں کو دیکھا ہے۔ آپ جن حالات میں دورہ فرما رہے ہیں یہ حالات عاشور کی رات کے ہیں۔ آپ جن حالات میں خیموں کو یا مقتل کو دیکھ رہے ہیں یہ شبِ عاشور کے حالات ہیں۔ مگر مولاؑ اب آپ ہی آکر بہن کا دل سنبھالیں۔ جو کام آپ عاشور کی رات انجام دے رہے تھے وہ ساری ذمہ داری اب شام غریباں میں زینبؑ کے سر آگئی ہے۔ کبھی مقتل میں جاکے سکینہ کو دیکھیں۔ کبھی بیبیوں کے پاس آکے انھیں تسلّی دیں۔ کبھی سیدانیوں کے پاس جاکے انھیں پُرسہ دیں۔ وہ سارے کام جو کل حسینؑ اور عباس مل کر انجام دے رہے آج وہ کام اکیلی زینبؑ انجام دے رہی ہے۔

دو راتوں میں دنیا میں اتنا فرق کہیں نہیں دیکھا گیا جتنا فرق کربلا میں دیکھا گیا۔ ایک رات بیبیوں کے سامنے وارث ہیں، بچے ہیں، محافظ ہیں، گھر والے ہیں، دل کے ٹکڑے ہیں اور ایک رات کے بعد جب دوسری رات آئی، کوئی والی نہیں، کوئی وارث نہیں، کوئی گود کا پالا نہیں۔

جس کی نگاہ کے سامنے ایسے مناظر ہوں اس کے دل پر کیا گذرتی ہوگی ہم اور آپ تو محسوس بھی نہیں کر سکتے۔

میں سلسلۂ کلام کو آخری مرحلہ تک لے جاتے ہوئے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ پروردگار عالم نے اس بندگی کو، ان سجدوں کو، اس عبادت کو، ان نمازوں کو انسانی کامیابی

کا راز قرار دیا ہے۔ تو اس کے لیے روز اوّل ایک ایسے مخلص کو ذریعہ بنایا جس کے پاس صورت، رنگ، قوم قبیلہ کا امتیاز ہو یا نہ ہو مگر اس کے پاس ایمان تھا، اخلاص تھا۔ اس کے بعد جب فرزند رسول الثقلینؐ مدینہ سے چلے تو آپ نے بھی اپنے ایک موذّن کا انتخاب کیا جس کا نام تھا حجاج بن مسروق جہاں مولاؑ ٹھہرتے تھے پہلے حجاج کو حکم دیتے تم اذان کہو۔ میں اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھاؤں گا۔ مسلسل یہ سلسلہ مدینہ سے چلنے کے بعد راستے میں، مکہ میں قیام کے دوران رہا کہ حجاج بن مسروق کی اذان اور مولاؑ کی امامت اور اصحاب کی جماعت یہ سلسلہ ۲۸ رجب سے ۹ محرم تک چلتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اب تاریخ اذان میں ایک نئی شخصیت اُبھر کے سامنے آئی۔ آج کی رات کائنات کا نقشہ بدل گیا۔ آج کی رات اسلام کو ایک ایسا موذن نصیب ہوا کہ کائنات میں پھر اسلام کو ایسا موذن پاتے ہوئے نہ دیکھا۔ کتنا فرق ہو گیا، نبیؐ کا جو موذن تھا اس کی شکل پر لوگوں کو اعتراض تھا، اس کے لہجہ پر لوگوں کو اعتراض تھا۔ حسینؑ کے موذن حجاج کا لہجہ صحیح تھا مگر اس کی شکل پیغمبرؐ کی شکل نہیں تھی۔ اس کا لہجہ پیغمبرؐ کا لہجہ نہیں تھا۔ مگر عاشور کی رات حسینؑ نے جس کو موذن بنایا پھر کائنات میں ایسا موذن کوئی نہ پیدا ہوا۔ وہ موذن جس کے بارے میں خود حسینؑ کہہ رہے تھے جب کڑیل جوان کو میدان میں بھیجا تو کہا خدایا! تو گواہ رہنا۔ وہ جا رہا ہے جو صورت میں، سیرت میں، رفتار میں، گفتار میں میرے نانا کی شبیہ تھا۔ اے پروردگار! جب میں پیغمبرؐ کو دیکھنا چاہتا تھا تو اپنے علی اکبر کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ مگر اب یہ تصویر پیغمبرؐ خاک میں ملنے جا رہی ہے۔

رونے والو! تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔ ایک جملہ سنو۔ علی اکبر کا شباب، علی اکبر کا حسن، علی اکبر کا لہجہ جس کے لیے خود حسینؑ نے کہا کہ صورت میں، سیرت میں، رفتار میں، گفتار میں پیغمبرؐ کی شبیہ ہے۔ آپ سوچیں کہ ایسا بیٹا حسینؑ کو کتنا عزیز ہو گا۔ ایسا بیٹا لیلیٰ کو کتنا عزیز ہو گا۔ ایسا بیٹا اس پالنے والی کو کتنا عزیز ہو گا جس نے اٹھارہ سال تک اپنے اس بھتیجہ کی پرورش کی ہے۔ اس غم کا اندازہ فقط ایک ہی جملہ سے ہو سکتا ہے جو بعض روایتوں میں پایا جاتا ہے کہ جب کوفہ کے بازار سے لٹا ہوا قافلہ گذر رہا تھا تو آگے آگے نوکِ نیزہ پر شہیدوں کے سر اور پیچھے پیچھے سیدانیاں، بیبیاں، سر برہنہ

تماشائیوں کا مجمع بازوؤں میں رسّیاں۔ آپ جانتے ہیں اور یہ ساری دنیا کا طریقہ ہے کہ جب کوئی نیا منظر کسی علاقہ میں سامنے آتا ہے تو چاہے مَردوں میں دیکھنے کا شوق نہ پیدا ہو مگر عورتوں میں ایسے مناظر دیکھنے کا اشتیاق ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ جب معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ آرہا ہے تو کوفہ کی عورتیں اپنے اپنے پشت بام پر جاکر بیٹھ گئیں اور یہ منظر دیکھا کہ اب جو قافلہ آرہا ہے اس میں آگے آگے کچھ نیزہ بردار ہیں ہاتھوں میں نیزے، نیزوں پر کٹے ہوئے سر۔

عزیزو! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ دنیا میں عورتوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا منظر سامنے آتا ہے تو دیکھنے کا شوق بھی ہوتا ہے اور منظر پر مسلسل تبصرہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ آگے آگے ایک سر دیکھا ارے اسے خارجی کہا گیا ہے، اسے باغی کہا گیا ہے، پیشانی پر سجدے کا نشان ہے۔ ایسا حسن وجمال کہ خون میں ڈوب جانے کے بعد بھی چہرہ اتنا روشن ہے۔ اسے باغی کیوں کہا گیا ہے۔ اسے خارجی کیوں کہا گیا ہے۔ ایک ایک سر سامنے سے گذر رہا ہے۔ عورتیں اپنے اپنے خیال کے مطابق تبصرہ کررہی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک سر پر عورتوں کی نگاہ پڑی۔ ہائے کسی کو اس کی جوانی پر رحم نہ آیا۔ کسی کو اس کے جمال پر رحم نہ آیا۔ کسی کو اس کے شباب پر رحم نہ آیا۔ اور ایک عورت کی زبان پر یہ جملہ آگیا کہ کاش جب یہ جوان مارا گیا ہو تو اس کی ماں زندہ نہ رہی ہو۔ جب یہ جوان مارا گیا ہو تو اس کی پالنے والی زندہ نہ رہی ہو، ورنہ وہ کیسے اس غم کو برداشت کرے گی۔

اب سوچو عزیزو! آگے آگے نیزوں پر سر ہیں اور پیچھے پیچھے بیبیاں آرہی ہیں۔ جب یہ فقرہ پالنے والی نے سُنا ہوگا تو اس پالنے والی کا کیا عالم ہوگا۔ ہائے وہ دُکھیا میں ہی ہوں جس نے اس لال کو پالا ہے اور میرے ہی سامنے آگے آگے نیزہ پر یہ سر جارہا ہے۔ اے بیبیو! ذرا میرے دل سے پوچھو کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔ مگر میں کیا کروں یہ میری گود کا پالا ہے۔ وہ میرا بھائی ہے، وہ میرا وفادار ہے میں کیسے کیسے روؤں۔

اب آپ کو اندازہ ہوا۔ علی اکبر کی شکل، علی اکبر کا انداز وہ ہے جسے دنیا کی عورتیں دیکھ کر برداشت نہ کر سکیں تو وہ ماں، وہ پھوپھی کیسے اس مصیبت کو برداشت کرے۔

جب علی اکبر کا لہجہ رسولؐ اللہ کا لہجہ ہے۔ تو جب فضا میں علی اکبر کی آواز گونج رہی ہو گی۔ جب حسینؑ نے شب عاشور علی اکبر کو آگے بڑھایا ہو گا کہ حجاج اب تم نہیں، آج کی اذان میرا کڑیل جوان دے گا۔ آج کی میرے علی اکبر کے حوالے۔ اور علی اکبر نے اذان شروع کی ہو گی تو سیدانیوں کے کانوں میں علی اکبر کی آواز نہیں آرہی ہے رسولؐ اللہ کی آواز آرہی ہے۔

سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۱۲

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیّٖنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ
وَعَلٰی اَهْلِ بَیْتِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَةُ
اللّٰهِ عَلٰی اَعْدَآئِهِمْ اَجْمَعِیْنَ۔
اَمَّا بَعْدُ!

انسانی فلاح، کامیابی اور نجات کا دارومدار پیغمبرؐ اُمّی کے اتباع پر ہے۔
نجات ان کا حصّہ ہے جن کا ایمان پیغمبر پر ہے۔ نجات ان کا حصّہ ہے جو پیغمبرؐ کا احترام کرنے والے، پیغمبر کی مدد کرنے والے اور اس نور کا اتباع کرنے والے ہیں جو نبی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔

اتباعِ کامل کے معنی یہ ہیں کہ جس طریقۂ زندگی کو سرکارؐ نے اختیار کیا ہے اسی کو اختیار کیا جائے۔ اور جس طریقۂ زندگی کو سرکارؐ نے ناپسند قرار دیا ہے اس سے اجتناب کیا جائے، اس سے پرہیز کیا جائے۔ اگر حضورؐ کو مصلّائے عبادت پر دیکھا گیا ہے تو سجدۂ پروردگار کیا جائے۔ اگر حضورؐ کو ماہِ رمضان میں روزے رکھتے دیکھا گیا ہے تو ماہِ رمضان میں روزے رکھے جائیں۔ اگر حضورؐ کو حج بیت اللہ کرتے دیکھا گیا ہے تو مسلمان حج بیت اللہ کرے۔ اگر حضورؐ کو تلاوتِ قرآن کرتے دیکھا گیا ہے تو مسلمان تلاوتِ قرآن کرے۔ اگر حضورؐ کو راہِ خدا میں مال لُٹاتے دیکھا گیا ہے تو مسلمان ایثار اور قربانی سے کام لے۔ اگر حضورؐ نے کبھی کسی کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا ہے تو مسلمان غصب سے پرہیز

کرے۔ اگر حضورؐ نے کسی کو بے جا مارنے کی زحمت نہیں فرمائی ہے تو مسلمان کسی پر ہاتھ نہ اُٹھائے۔ حضورؐ نے اگر کسی نامحرم کی طرف نظر اُٹھا کے نہیں دیکھا ہے تو مسلمان اپنی نگاہوں کو بچائے رکھے۔ حضورؐ نے اگر کسی کی غیبت نہیں کی ہے تو مسلمان غیبت نہ کرے۔ حضورؐ نے اگر غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے تو مسلمان کی زبان غلط بیانی سے آشنا نہ ہونے پائے۔

حضورؐ نے جو عمل کیا ہے وہ مسلمان کے لیے سند ہے۔ اور حضورؐ نے جن کاموں کو چھوڑ دیا ہے ان کا چھوڑ دینا مسلمان کا فریضہ ہے۔

یہ اعمال کی دنیا ہے۔ یہ واجبات اور محرمات کی دنیا ہے۔ اس کے بعد جب انسانی دنیا میں قدم رکھنا ہو تو جس سے حضورؐ نے محبّت کی ہے اس سے محبّت کرنا مسلمان کا فریضہ ہے۔ اور جس سے حضورؐ بیزار رہے ہیں اس سے الگ رہنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ جس کے لیے حضورؐ اُٹھے اس کا احترام کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ اور جس کو حضورؐ نے اُٹھا دیا ہے اس سے الگ رہنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

اگر ہم نے اتباعِ کامل کے معنی پہچان لیے ہیں تو آج فقط اتنا دیکھنا ہے کہ عاشورۂ محرم کو حضورؐ کا طریقۂ کار کیا تھا۔ آج یہ تحقیق کرنا ضروری ہے کہ عاشورۂ محرم کے دن سرکار کی زندگی کا اصول اور حضور کی زندگی کا طریقہ کیا تھا تاکہ وہ مسلمان جو نجات چاہتا ہے۔ وہ مسلمان جو کامیابی چاہتا ہے۔ وہ مسلمان جو سرکار کا اتباع کرنا چاہتا ہے وہ اسی طریقۂ کار کو اختیار کرے جو طریقہ حضورؐ نے اختیار کیا تھا۔

بچہ بچہ جانتا ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ اِس دنیا سے ۱۱ھ میں تشریف لے گئے اور کربلا کا واقعہ ۶۱ھ میں پیش آیا ہے۔ حضورؐ کے ٹھیک پچاس سال کے بعد واقعۂ کربلا، عاشورِ محرم کا واقعہ پیش آیا ہے۔ ہم یہ کیسے دیکھیں کہ حضورؐ کا طریقہ عاشور کے دن کیا تھا۔ اس لیے کہ حضورؐ کے زمانے میں نہ کوئی عاشور تھا نہ کوئی محرم کا واقعہ تھا۔ نہ کوئی کربلا تھی نہ کوئی قربانی تھی۔ کیسے حضورؐ کے کردار کو پہچانیں۔ مگر وہ پیغمبرؐ جو اپنی زندگی کو قیامت تک

کے لیے نمونہ ... وہ پیغمبرؐ جس ... اُسوہ ... کو قیامت تک آنے والے مسلمانوں

کے لیے نمونۂ عمل بنانا چاہتا تھا اس پیغمبرؐ نے اپنی حیات سے انتظام شروع کیا اور عاشورِ محرم تک برابر واضح کیا کہ میرا طریقۂ کار کیا ہے اور میری زندگی کا اصول کیا ہے۔

جناب اُمّ سلمہ کے گھر میں سرکارِ دو عالمؐ تشریف فرما ہیں۔ ایک مرتبہ دیکھا کہ چھوٹا شہزادہ گھر میں آگیا۔ پیغمبرؐ نے بچہ کو گلے سے لگالیا۔ اُمّ سلمہ نے دیکھا کہ حضور اپنے لال سے بڑی محبت فرما رہے ہیں اور بے شک یہ بچہ اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ مگر محبّت کرتے کرتے اور پیشانی پر بوسہ دیتے دیتے گلے کو بوسہ دیتے دیتے ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے رونا شروع کر دیا۔ جناب اُمّ سلمہ نے گھبرا کے پوچھا خدا کے حبیبؐ! ابھی تو آپ مُسکرا رہے تھے۔ ابھی تو آپ بچہ کو بوسہ دے رہے تھے۔ یہ یکبارگی رونے کا کیا سبب ہے؟

کہا اُمّ سلمہ! ابھی جبرئیلؑ نے آکر خبر دی ہے کہ یہ میرا لال کربلا میں مارا جائے گا۔ یہ میرا لال کربلا میں بھوکا پیاسا ذبح کر دیا جائے گا۔

حضورؐ! یہ کربلا کہاں ہے، یہ واقعہ کب ہونے والا ہے؟

کہا اُمّ سلمہ! کربلا عراق میں ایک سرزمین ہے، جہاں میرا لال ذبح کر دیا جائے گا۔ تین دن کا بھوکا پیاسا۔

اے حضورؐ! وہ زمین کہاں ہے؟

کہا اُمّ سلمہ ٹھہرو، میں تمھیں وہ زمین دکھلائے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضورؐ نے اشارہ کیا۔ زمینیں پست ہونے لگیں، زمینِ کربلا بلند ہونے لگی۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے اشارہ کیا اُمّ سلمہ! یہ جگہ ہے جہاں میرا حسینؑ ایک دن ذبح کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر حضورؐ نے ہاتھ بڑھایا اور ایک مٹھی خاک اٹھا کر جناب اُمّ سلمہ کے حوالے کر دی۔ فرمایا آپ اس کو اپنے پاس رکھیں۔ جب تک یہ خاک، خاک رہے سمجھنا میرا حسینؑ سلامت ہے۔ اور جب یہ خاک، خون میں تبدیل ہو جائے تو سمجھ لینا کہ وہ دن آگیا ہے جب میرا حسینؑ راہِ خدا میں قربان ہو گیا۔

زمانہ گذر گیا۔ پچاس سال کے بعد جب ۲۸ رجب ۶۰ھ میں امام حسینؑ مدینہ چھوڑ کر

چلنے لگے تو پھر آئے اپنی نانی سے رخصت ہونے کے لیے۔ پوچھا بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ فرمایا نانی میں عراق جا رہا ہوں۔ کہا عراق میں کہاں کا ارادہ ہے؟ کہا میں کربلا جا رہا ہوں۔ کہا بیٹا مجھ سے تمھارے نانا نے کربلا کے بارے میں بہت سی باتیں بیان کی ہیں۔ کربلا کا نام سُن کر مجھے ہول آ رہا ہے۔ کہا نانی آپ کو تو معلوم ہے کہ میں کربلا جا رہا ہوں میں گلا کٹانے جا رہا ہوں۔ ابھی نانا کی قبر پر گیا تھا تو فرمایا کہ بیٹا کربلا جاؤ۔ میرے حسینؑ کربلا جاؤ۔

فرمایا بیٹا تم تو چلے جاؤ گے مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ تم پر کیا گذر گئی۔ فرمایا ایک لمحہ صبر کریں۔ یہ کہہ کر پھر دوبارہ حسینؑ نے اشارہ کیا۔ زمینیں پست ہوئیں زمین کربلا بلند ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر ایک مُٹھی خاک اُٹھائی کہا نانی اماں جہاں نانا کی دی ہوئی مٹی کو رکھا ہے اسی شیشے میں اس خاک کو بھی رکھ لیجیے جب تک یہ خاک، خاک رہے سمجھے گا کہ آپ کا حسین سلامت ہے اور جب یہ خاک، خون میں تبدیل ہو جائے تو سمجھے گا کہ آپ کا حسینؑ اس دنیا میں نہیں رہ گیا ہے۔

وقت گذرتا رہا جب کبھی اُمّ سلمہ کو حسینؑ کی یاد نے تڑپایا۔ جب کبھی نانی کو نواسے کی یاد نے بے قرار کیا۔ دوڑ کے آئیں شیشہ کو دیکھا مٹی کو دیکھا۔ دل مطمئن ہو گیا۔ خدایا تیرا شکر کہ میرا حسینؑ سلامت ہے۔ پروردگار تیرا شکر کہ میرا حسینؑ زندہ و سلامت ہے۔ وقت گذرتا رہا۔

اب جو عاشور محرم کا دن آیا۔ دو پہر کا وقت تھا۔ اُمّ سلمہ بستر پر لیٹی تھیں کہ ایک مرتبہ آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ پیغمبرؐ سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے۔ گریبان پھٹا ہوا۔ آستینیں اُلٹی ہوئی۔ سر پر خاک پڑی ہوئی۔

اے خدا کے حبیبؐ! یہ آپ کا کیا عالم ہے؟۔ کہا اُمّ سلمہ تم سو رہی ہو۔ میں لُٹ گیا۔ اُمّ سلمہ میرا گھر اُجڑ گیا۔ بس یہ سُننا تھا کہ گھبرا کے اُٹھیں اور دوڑ کر گئیں۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ شیشہ میں خون تازہ جوش مار رہا ہے۔

یہ تھا غم حسینؑ میں پیغمبرؐ کا طریقۂ کار۔ یہ کسی قوم کی ایجاد نہیں ہے۔ اور شاہد

اُمِّ سلمہ ہیں جو اُمّ المومنین ہیں۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد اُمِّ سلمہ نے رونا شروع کیا۔ واحسیناہ۔ اب جو مدینہ کی عورتوں نے جناب اُمِّ سلمہ کے رونے کی آواز سُنی دوڑ کے آئیں۔ بی بی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہمارا حسینؑ سلامت رہے۔ ہمارا حسینؑ سفر میں گیا ہے جب کوئی مسافر سفر میں جاتا ہے تو اس طرح نہیں رویا کرتے۔ فرمایا مجھے نہ سمجھاؤ۔ اب میرا حسینؑ کہاں ہے؟ کہا بی بی یہ کیا فرما رہی ہیں؟ کہا ابھی پیغمبرؐ نے خواب میں آ کے بتایا ہے کہ کربلا میں میرا حسینؑ مارا گیا۔ یہ دیکھو شیشہ میں خون تازہ ہے۔

یہ کہہ کر اُمِّ سلمہ چلیں۔ قبرِ پیغمبرؐ کے قریب آئیں۔ آ کے آواز دی خدا کے رسولؐ! میں آپ کو آپ کے لال کا پُرسہ دینے آئی ہوں۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ "کَانَ الْقَبْرُ یَمُوْجُ بِصَاحِبِہٖ" قبرِ پیغمبرؐ میں زلزلہ آ گیا۔ اُمِّ سلمہ مجھے کیا بتا رہی ہو۔ میں دیکھ رہا تھا جب میرے حسینؑ کے گلے پر خنجر چل رہا تھا۔

ہاں ایک تصوّر جو مجھے آج دوپہر سے بے قرار کئے ہوئے ہے یہاں سینہ زنی کے تمام ہو جانے کے بعد جب میں پلٹ کے گیا تو ایک مردِ مومن کے گھر میں تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گیا۔ یکبارگی یہ خیال پیدا ہوا کہ میں نے ذکرِ شہادت کیا۔ مومنین نے سنا۔ سب روئے۔ مثاب ہوئے۔ ذکرِ شہادت کے بعد سب پلٹ کے اپنے گھر چلے گئے۔ جو پیاسے تھے انھوں نے پانی پی لیا۔ جو بھوکے تھے انھوں نے کھانا کھا لیا۔ جو گرمی میں بیٹھے تھے وہ ایرکنڈیشن میں آ کے بیٹھ گئے۔ یہ تو ذکرِ شہادت کے بعد کا حال ہے مگر شہادتِ حسینؑ کے بعد بیبیوں کا حال کیا تھا۔ سیدانیوں کا حال کیا تھا۔ یتیموں کا حال کیا تھا۔ بس اسی حال کو تین لفظوں میں سنو۔ ایک واقعہ خیمہ جلنے سے پہلے، ایک واقعہ خیمہ جلنے کے ساتھ ــ اور ایک واقعہ خیمہ جلنے کے بعد۔

بس سنو بیبیوں کا سیدانیوں کا اور بچّوں کا کیا حال تھا۔

ابھی بچّوں تک یہ خبر بھی نہ پہونچی تھی اور چند لمحے گذرے تھے کہ بچّی کے کان میں بابا کے گھوڑے کی آواز آئی۔ ہائے کتنا فرق ہے ان بے دین انسانوں میں اور ان جانوروں میں۔ وہ بے دین انسان تھے جو نبی کے لال کو ذبح کر رہے تھے ــ اور یہ جانور تھا ذوالجناح

جو حسینؑ کی سنانی لے کر آیا تھا۔

روایت کہتی ہے کہ شہادتِ حسینؑ کے بعد جب ذوالجناح نے دیکھا کہ میرا سوار، میرا آقا شہید ہوگیا ہے تو اس نے دو کام کیے۔ لاشِ حسینؑ کے قریب آیا۔ پہلے اپنے دانتوں سے پکڑ کر تیر نکالنا شروع کیے۔ اس کے بعد اپنی پیشانی کو خونِ مظلوم سے رنگین کیا اور خیمہ گاہ کا رُخ کیا کہ چل کے سیدانیوں کو بتا دوں اب تمھارا وارث نہیں رہ گیا ہے۔ آگے بڑھتا جا رہا ہے جو ظالم سامنے آیا اپنی ٹاپوں سے پامال کرتا جا رہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اسے روکا جائے، مگر ذوالجناح رُکنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ تیر انداز کدھر چلے گئے، کمان داروں کو بلاؤ تیروں کی بوچھار کریں۔ یہ ذوالجناح خیمہ تک نہ جانے پائے۔ ابن سعدؒ کے کانوں میں آواز آئی کہا خبردار تیر نہ مارنا یہ رسولؐ اللہ کی سواری کا گھوڑا ہے۔ ہائے کاش کوئی غیرت دار ہوتا اور یہ کہتا کہ او پسرِ سعد! یہ رسولؐ اللہ کی سواری کا گھوڑا ہے اور حسینؑ دوشِ پیغمبرؐ کا سوار ہے۔ کمان دار پیچھے ہٹے، ذوالجناح آگے بڑھا۔ جب درِ خیمہ کے قریب پہونچا بچی کے کان میں آواز آئی، کہا پھوپھی اماں! ایسا لگتا ہے کہ میرا بابا آگیا ہے۔ کہا بیٹی! کیسے پہچانا؟ کہا آپ ذوالجناح کی آواز نہیں سُن رہی ہیں؟ اے پھوپھی اجازت دیجیے کہ میں درِ خیمہ پر جا کر بابا کا استقبال کروں جہاں میں نے بابا کو رخصت کیا تھا اسی جگہ جا کر بابا کا استقبال کروں۔ یہ کہہ کر بچی چلی۔ درِ خیمہ پر آئی۔ اب جو درِ خیمہ تک آکر پردہ اُٹھایا تو کیا دیکھا کہ ذوالجناح آیا مگر حسینؑ نہیں آئے۔ آگے بڑھیں آ کے سموں سے لپٹ گئیں۔ اے ذوالجناح! "مَنِ الَّذِیْ اَیْتَمَنِیْ عَلٰی صِغَرِ سِنِّیْ" ارے اس کمسنی میں مجھے کس نے یتیم کر دیا؟ اے ذوالجناح! اپنے سوار کو کہاں چھوڑ کے آیا؟ جب کوئی جواب نہ ملا تو عجب فقرہ کہا۔ ذوالجناح! کم سے کم ایک بات تو بتا دے "هَلْ سُقِیَ اَبِیْ اَمْ قُتِلَ عَطْشَانًا؟" ارے بابا کو پانی ملا، یا پیاسے ہی مارے گئے۔ ذوالجناح نے اپنا سر درِ خیمہ پر پٹکنا شروع کیا۔ سکینہ! تمھارے بابا کو زیرِ خنجر بھی پانی نہیں ملا۔

گونجی۔ چلو چلو خیموں میں آگ لگا دو۔ خانوادۂ حسینؑ کی ایک کمسن بچّی جس کا نام فاطمہ تھا۔ روایتوں میں ہے کہ درِ خیمہ پر کھڑی ہوئی مولاؑ کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ دیکھا کہ ظالم مشعلیں لیے چلے آ رہے ہیں۔ ہائے ظالموں کا کیا ارادہ ہے۔ چند لمحے نہ گذرے تھے کہ دیکھا خیموں سے دُھواں اُٹھنے لگا۔ اب بچی کدھر جائے۔ دیکھا ایک ظالم نیزہ لیے ہوئے آ رہا ہے۔ بچی آگے بڑھی۔ ظالم پیچھے چلا۔ ہائے بچی تیز نہ دوڑ سکی۔ ظالم نے پُشت میں نیزہ چبھو دیا۔ بچّی غش کھا کے خاک پر گر پڑی۔ اب جو خیمے جلنے لگے تو سیدانیوں نے خیمہ سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ شہزادی زینبؑ آئیں اے بیٹی جلدی باہر چلو خیمے جل رہے ہیں۔ بیٹی جلدی اٹھو خیموں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اب جو بچّی نے آنکھ کھولی تو کہا پھوپھی اماں کیسے جاؤں سر پر چادر نہیں ہے۔ پھوپھی اماں اگر باہر نکلنا ہے تو پہلے کوئی چادر تو دیجئے۔ فرمایا بیٹی آنکھیں کھول کے پھوپھی کا سر دیکھو۔

بس عزیزو! خیمہ بھی جل گئے اور تیسرا مرحلہ آ گیا۔ اب وہ آخری منزل سامنے آ گئی کہ خیمہ جل گئے۔ سیدانیاں خاک پر بیٹھی ہیں۔ ایک مرتبہ فضّہ دوڑ کے آئیں شہزادی زینبؑ کے پاس۔ کہا بی بی ایک بڑی قیامت کی خبر سُنی ہے۔

فرمایا، فضّہ بتاؤ کیا سُن کے آئی ہو، کیا خبر لائی ہو؟

کہا بی بی ذرا دل سنبھالئے تو بتاؤں۔

فرمایا، فضّہ بیان کرو، مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اب میرے واسطے کوئی مصیبت، مصیبت نہیں ہے۔ عون و محمد مارے گئے۔ اکبر برچھی کھا چکے۔ عباس شانے کٹا چکے۔ علی اصغر کام آ چکے۔ میرا بھیا بھی مارا گیا۔ اب اس کے بعد زینب کے لیے کوئی مصیبت مصیبت نہیں ہے۔ اب تو خیمے بھی جل گئے، اب مجھے کسی مصیبت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

کہا، نہیں بی بی، دل سنبھالئے تو میں بتاؤں کہ میں نے کیا سُنا ہے۔

اب زینبؑ کا دل تڑپتا جا رہا ہے۔ فضّہ کیا کہنا چاہتی ہو، ارے جلدی بیان کرو فضّہ کیا سُنا؟

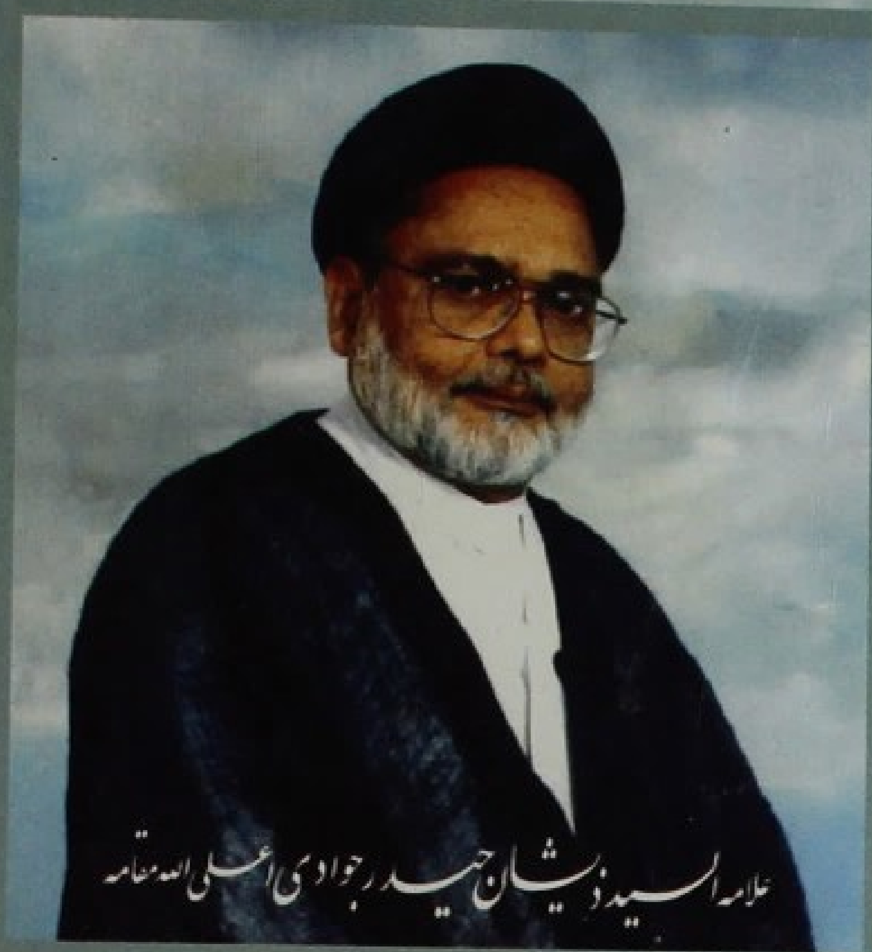
کہا بی بی ابھی میں میدان کے قریب گئی تو میرے کانوں میں آواز آئی کہ ابن سعدؑ

کہہ رہا ہے کہ گھوڑوں کی نعل بندی کی جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے شہزادے کا لاشہ پامال کیا جائے گا۔

زینبؑ بے قرار ہو کے آگے بڑھیں۔ اب جو آگے بڑھیں تو کیا دیکھا کہ ادھر کے سوار اُدھر، اور اُدھر کے سوار ادھر۔ ارے زہراؑ کا لال۔ اماں آؤ اپنے لال کو دیکھو تم نے کن نازوں سے پالا تھا۔ ہائے شامِ غریباں آئی لاشے پامال ہو چکے۔ خیمے جل چکے سیدانیوں کا کوئی سہارا نہ رہ گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔



(۱۹۳۸ء - ۲۰۰۰ء
۱۳۵۷ھ - ۱۴۲۱ھ)

علامہ جوادیؒ

کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے وہ ایک جلیل القدر مجتہد، مایۂ ناز خطیب اور مقتدر اہل قلم تھے جنھوں نے زندگی کے آخری لمحہ تک خدمت دین اور نشر علوم اہلبیتؑ کا فریضہ انجام دیا۔ انوار القرآن، نقوش عصمت، اصول وفروع، ذکر وفکر جیسی سو سے زائد گراں قدر کتاب ان کے نام ہیں ۔

زیر نظر کتاب:- رسالت الہٰیہ علامہ طاب ثراہ کی مجالس عشرۂ محرم ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء کا مجموعہ ہے اس میں اسلام کے بنیادی عقیدہ 'رسالت ونبوت' کا تمام پہلوؤں سے تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اس عقیدہ رسالت یا رسالت مرسلِ اعظمؐ پر وار دہونے والے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ علامہؒ کے فکر انگیز بیانات کی اس کتابی صورت کی جتنی بھی قدر و پذیرائی کی جائے کم ہے۔